اردو لسانیات اور مستشرقین

ترمیم و اضافہ شدہ

ساجد جاوید

عکس

AKSPUBLICATIONS

اردو لسانیات اور مستشرقین

اردو لسانیات اور مستشرقین

ساجد جاوید

AKSPUBLICATIONS

کتاب	اُردو لسانیات اور مستشرقین
مصنف	ساجد جاوید
سنِ طباعت	2023ء
قیمت	1000/-
تعداد	500

AKSPUBLICATIONS
Ground Floor Mian Chamber 3-Temple Road, Lahore
Contact: 0300-4827500, email: fahad.ceo.aks@gmail.com
www.AKSPUBLICATIONS.com.pk

انتساب

ڈاکٹر قاضی عابد

کے نام

کچھ اور ساتھ رہے گا چلو چلیں واپس
جہاں ملے تھے اسی موڑ پر جدا ہونا

فہرست

جواز

اردو لسانیات اور مستشرقین سماج، زبان اور لسانیات سے جڑے ہوئے قدیمی تعلقات پر لکھے گئے چند مضامین کا اشاریہ ہے جو مختلف ادوار میں تحریر ہوئے۔ اس کتاب کے پہلے ایڈیشن کی مقبولیت سے میرا حوصلہ بڑھا کہ نہ صرف اس کا دوسرا (اضافہ شدہ) ایڈیشن شائع کیا جائے، بلکہ لسانیات کے میدان میں مزید کام بھی سامنے لایا جائے۔ یہ کتاب اسی زاویے کی ایک کڑی ہے۔ پیش لفظ لکھنے میں اپنے عزیز دوستوں کی آرا کو اپنے الفاظ سے زیادہ قیمتی جانتے ہوئے نقل کر رہا ہوں تاکہ ان کی محبت اس کتاب کا حصہ بن جائے۔ اس کتاب کے بارے میں استاد محترم ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ (انڈیا) کی رائے یوں ہے۔ "اردو لسانیات کے فروغ کے سلسلے میں آپ کی خدمات لائق تحسین ہیں۔"

"ڈاکٹر ساجد جاوید ہماری نوجوان نسل میں شاید واحد ماہر لسانیات ہیں جو اردو میں 'سماجی لسانیات' کے شعبے کو فروغ دینے میں پیش پیش ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب "اردو لسانیات اور مستشرقین" میں نئے لسانی تحقیقی اصولوں کے تحت نہ صرف اردو لسانیات کے کچھ سماجی مباحث کو موضوع بنایا ہے بلکہ مستشرقین کی لسانی کارگزاریوں کا تفصیلی جائزہ بھی لیا ہے جس کے نتیجے میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق سے متعلق چند دلچسپ باتیں بھی سامنے آئی ہیں۔ اب یہ کتاب کچھ نئے مضامین کے ساتھ دوبارہ شائع ہونے جا رہی ہے۔ امید ہے کچھ نئے لسانی حقائق یوں ہمارے علم میں آئیں گے۔" (ڈاکٹر ایم۔ خالد فیاض، گجرات)

"لسانیات جیسے ادق موضوع کو قابل فہم بنانے کی کوشش میں ماہرین لسانیات خود الجھ جاتے ہیں۔ ساجد جاوید کا اس حوالے سے اختصاص یہ ہے کہ وہ اپنے موضوع سے محبت کرتے ہیں۔ وہ اپنے دماغ میں کوئی نیا سوال خلق کرتے ہیں اور پھر اس کا جواب ڈھونڈنے نکل پڑتے ہیں۔ سابقہ تحقیق کھنگالتے ہیں، سابقین کی غیر شعوری کوتاہیوں کی نشاندہی کرتے ہیں اور قارئین کے سامنے درست استدلال سے ایک نیا رخ سامنے لے آتے ہیں۔ لسانیات ان کی دلچسپی کا محور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی گفتگوؤں میں اور تحریروں میں کہیں بھی وہ الجھن کا شکار نظر نہیں آتے۔ یونیورسٹی میں تدریس کے دوران جب میرا باقاعدہ اس موضوع سے سابقہ پڑا تو مجھے خوش گوار حیرت ہوئی کہ ڈاکٹر ساجد جاوید اپنے

اسلوب اور برمحل استدلال کی بنا پر دوسروں سے بالکل منفرد ہیں۔ لسانیات کی کتاب کا دوسرا ایڈیشن آنا ہمارے جیسے معاشرے میں بذات خود ایک خبر ہے۔" (ڈاکٹر ظہیر عباس، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور)

"ڈاکٹر ساجد جاوید اردو کے ممتاز ماہر لسانیات کی حیثیت سے کم وقت میں اپنی منفرد شناخت تسلیم کرا چکے ہیں۔ انہوں نے تاریخی لسانیات کے ساتھ ساتھ سماجی لسانیات کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا۔ وہ لسانی تحقیق کے دوران لگے بندھے سانچوں کی پیروی نہیں کرتے اور نہ ہی بنے بنائے نظریات کا اعادہ کرتے ہیں۔ وہ مسلمہ لسانی تصورات پر سوال اٹھاتے ہیں اور ماہرین لسانیات کو زیر بحث لاتے ہوئے بڑے ناموں سے مرعوب نہیں ہوتے۔ ان کی کتاب "اردو لسانیات اور مستشرقین" میں شامل مضامین میرے استدلال کا ثبوت ہیں۔ یہ مضامین ان کی سترہ سالہ محنت اور مطالعے کا نچوڑ ہیں۔ اس کتاب نے اشاعت کے فوری بعد زبان اور ادب کے سنجیدہ قارئین میں پذیرائی حاصل کی۔ اب اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع ہونے جارہا ہے۔ اس اضافہ شدہ ایڈیشن اور مصنف کے لیے نیک خواہشات۔ (ڈاکٹر مظہر عباس، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور)

"برصغیر میں مستشرقین کے علمی کارناموں میں لسانیات سے ان کی دلچسپی خاص اہمیت رکھتی ہے۔ یوں تو مشنری اور تجارتی ضرورتوں کے پیش نظر اردو لغت اور قواعد سولھویں / سترھویں صدی سے ہی مرتب کی جارہی تھی لیکن ولیم جونز کے مراسلے کے بعد تقابلی لسانیات کی بنیاد پڑی اور یورپ سے ماہرین لسانیات جوق در جوق برصغیر میں آئے۔ لسانیاتی جائزے لیے گئے۔ تقابلی لغات اور گرائمریں مرتب کی گئیں۔ زبانوں کے آپسی رشتوں اور خاندانوں کا تعین کیا گیا۔ مستشرقین کے یہ لسانیاتی کارنامے اردو دنیا کی نظروں سے پوشیدہ رہے۔ ڈاکٹر ساجد جاوید کی محققانہ نظر نے اس کمی کو محسوس کیا اور اپنی تحقیقی کاوشوں سے مستشرقین کے ان لسانیاتی کارناموں کو اردو دنیا سے روشناس کرایا۔ ان کا یہ تحقیقی کارنامہ قابل فخر ہے۔ (پروفیسر، ڈاکٹر طارق محمود، پرنسپل، ڈگری کالج، میاں چنوں)

"دوستوں کی ان آرا کا شکریہ۔ آخر میں اپنی شریکِ حیات مسز عکاشہ، بیٹی میرام ساجد، بیٹوں شاویز ساجد اور نویر ساجد کی بے لوث محبتوں کا تذکرہ لازمی ہے۔ میرے تمام طالب علم، جو اپنے دل میں میرے لیے احترام اور ادب کا جذبہ رکھتے ہیں ان کے لیے ہدیۂ تحسین حاضر ہے۔ عکس پبلشرز کے روحِ رواں جناب نوفل جیلانی اور محمد فہد صاحب کی دل لگی اور کتاب کے معاملے میں دل جمعی اور تعاون کا بار دگر شکریہ۔ (ساجد جاوید، 5 ستمبر 2023)

شروع کرتا ہوں۔۔۔

اردو میں لسانیات کے مباحث پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ لکھنے والوں میں بڑے نام بھی ملتے ہیں جنھوں نے لسانیاتی تحقیق کو اپنی دلچسپی کے میدان کے طور پر منتخب کیا اور اس میں اپنی خدمات پیش کیں۔ دوسری طرف ایسے احباب کی بھی بہتات نظر آتی ہے جن کو ابھی اس میدان میں مزید سیاحت کے بعد لکھنے لکھانے کی مشق کرنا چاہیے تھی۔ اس سلسلے میں ایک بات اہم ہے کہ لسانیات کے بارے میں ابھی محدود سطح پر تحقیقی اور تنقیدی تناظرات سامنے آئے ہیں۔ جس ملک میں ابھی تک اردو لسانیات کو بطور ایک علم کے نہ پڑھایا جا رہا ہو وہاں مذکورہ انفرادی کاوشوں کو لائق تحسین ٹھہرایا جانا چاہیے۔ میرا لسانیات سے بطور طالب علم تعارف ۲۰۰۲ء میں ہوا جب میں نے ایم۔اے کے دوران بطور آپشنل پیپر کے اس کا مطالعہ کیا۔ وہاں سے طبعی رجحان بنتا چلا گیا اور اس علم کی سمجھ آنا شروع ہوئی۔ یہاں تک کہ یہ میدان میرا پی ایچ۔ڈی کا موضوع بن گیا جس کے دوران مجھے سماجی لسانیات اور زبان کے تغیر و ارتقاء کے مابین پائے جانے والے اہم تعلق کا ادراک ہونا شروع ہوا۔ اردو زبان کی تشکیل اور ارتقاء میں مختلف مستشرقین کی لسانی/لسانیاتی کاوشوں نے راقم کی توجہ اس طرف مبذول کی اور ان اپنی تحقیق کا موضوع بنایا۔

سماجی لسانیات (Socio-Linguistics) میں زبان اور سماج سے تعلق کے مابین لسانی رشتوں کو دیکھا، پرکھا اور سمجھا جاتا ہے۔ سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں ہندوستان میں مشرقی ماہرین السنہ نے بالعموم اور مستشرقین نے بالخصوص ہندوستانی زبانوں کو اپنی تحقیقات اور تالیفات کا موضوع بنایا، جن پر یہ مضامین لکھے گئے ہیں۔ اس کتاب کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ حصہ اول میں مشرقی (ہندوستانی) لسانی روایت کو جائزہ لیا گیا ہے اور حصہ دوم میں ماقبل نوآبادیاتی عہد میں اردو زبان (لسانیات) کے ضمن میں برصغیر کے منظرنامے پر تحقیقی کام کرنے والے مستشرقین کی لسانی کاوشوں پر تحقیقی اور تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔ پہلے حصے کا پہلا مضمون ۲۰۰۹ء میں نمل کے ریسرچ میں شائع ہوا جو راقم کا پہلا لسانیاتی مضمون تھا۔ اس میں زبان اور بولی میں افتراقات سے لسانیات کے طالب علم کے لیے زبان کی ابتدائی صورتحال اور تشکیلی مراحل کو سمجھنے میں بنیادی مباحث پر بات کی گئی اور ایک لسانی تھیوری کا (اردو میں) اعادہ کیا گیا ہے۔ آگے چل کر سترہویں اور اٹھارہویں صدی کے برصغیر کا لسانی منظر نامہ اور اس کی تاریخی روایت واہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔ اصلاح زبان کے ضمن میں شمالی ہند میں شعرا (شاہ حاتم، آرزو، ناسخ) کی جانے والی کاوشوں کو تحسینی نظر سے دیکھنے کی بجائے تنقیدی نقطہ نظر کو پیش نظر رکھا گیا ہے (جس پر آئندہ تفصیلی کام میرے لسانی منصوبوں میں شامل ہے)۔ بیسویں صدی میں لسانیاتی تنقید کے مرد میدان ڈاکٹر محی الدین قادری زور کو اردو کا پہلا لسانیاتی نقاد ثابت کیا گیا ہے۔ تاریخی اعتبار سے اس مضمون کو مستشرقین کے بعد آنا چاہیے تھا لیکن مشرقی روایت کو ایک حصے میں یکجا کرنے کے خیال کی وجہ سے اس مضمون کی جگہ یہاں بنائی گئی ہے۔ کتاب کے دوسرے حصے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی لسانی حکمت عملیوں اور اس سلسلے میں ہندوستانی زبان (جس کو آگے چل کر اردو کا نام دیا گیا) کی تحصیل کے لیے مرتب کی گئی قواعد ولغات کے تخصیصی مطالعے کو ایک محقق کے طور پر دیکھنے کی کوشش کی گئی۔ یہ ملحوظ رہے کہ اس ضمن میں کسی بھی معلوماتی امر کی کسی اور ماخذ سے مماثلت اتفاقیہ تصور کی جائے۔ کیٹلر سے لے کر جان گل کرسٹ تک کی سو سالہ لسانی روایت کے چیدہ چیدہ گوشوں پر ایک طالب علمانہ کاوش پیش خدمت ہے، جس کو کوئی بہت معتبر کہنے کا

دعویٰ نہیں کیا جارہا۔ کتاب میں شامل مضامین (زیادہ تر) ہائیر ایجوکیشن کمیشن (H.E.C.) کے جرنلز میں شائع ہوئے ہیں ان میں کچھ مضامین میری پی ایچ۔ڈی کی ریسرچ سے ماخوذ ہیں جن میں جزوی طور پر تبدیلی بھی کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ایک دو مضامین قومی رسالوں میں شائع ہوئے جو اس کتاب ہ حصہ بنائے گئے ہیں۔

میری اس پہلی کتاب کی اشاعت اور تیاری کے عمل میں چند مخلص اور عزیز دوستوں کا بہت سا تعاون شامل ہے جو کسی بھی طور نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ چونکہ تعلق دلوں کا ہے اس لیے انکے نام تحریر کی ستائش کے محتاج نہیں ہیں، البتہ مجھے "عکس پبلی کیشنز" کے نوجوان سی۔ای۔او، محمد فہد کے ذوق وشوق، ولولے، موٹیویشن اور پروفیشنل اپروچ کی توصیف کا فریضہ انجام دینا ہے جو اس کتاب کی طباعت کا ذریعہ بنے۔ دیگر تمام مخلص دوستوں کا دلی شکریہ۔

ڈاکٹر ساجد جاوید
سرگودھا

حصہ اول

اردو لسانیات، مقامی روایت اور مباحث
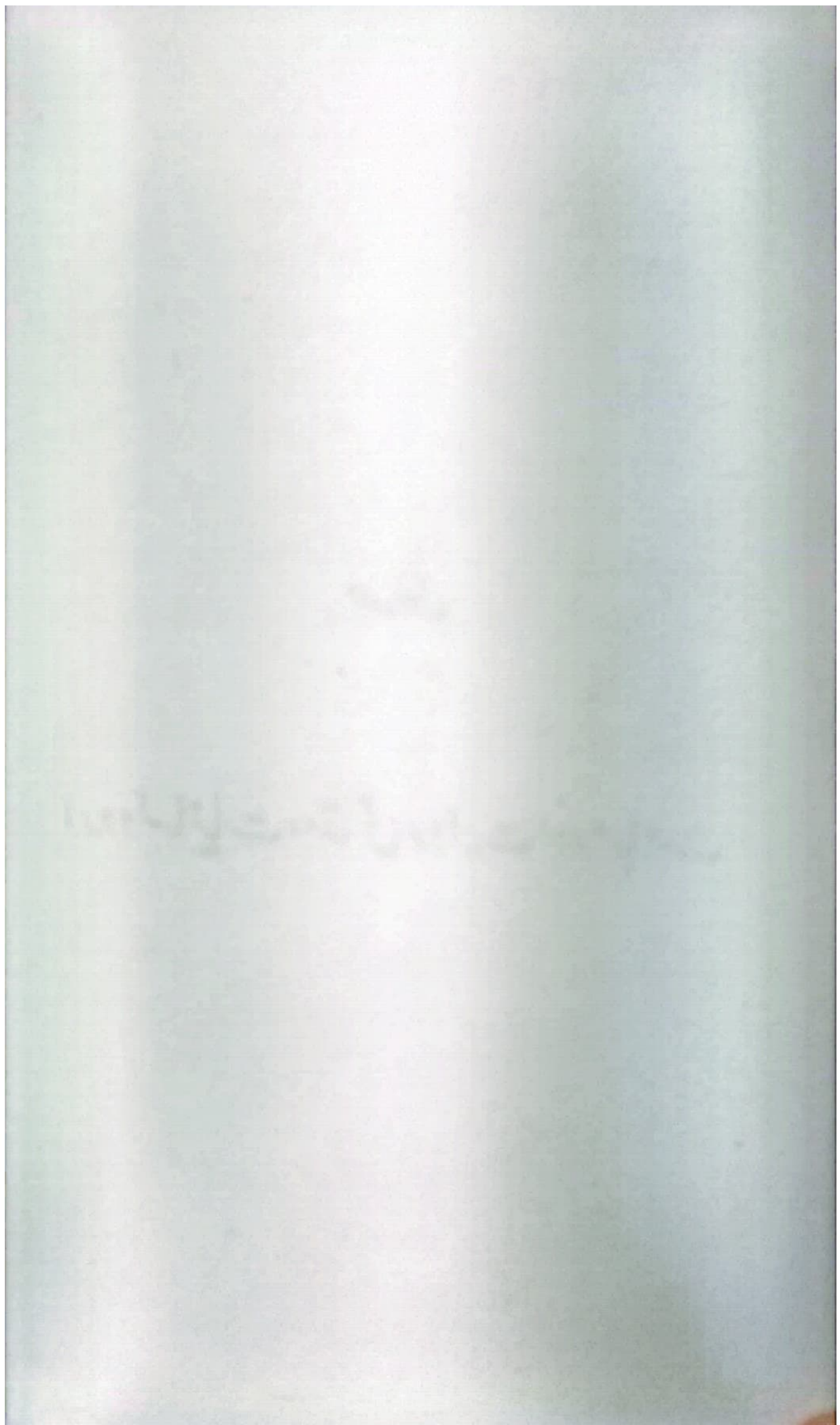
1.1

بولی اور زبان، افتراق، وظائف اور حدود

علم لسانیات میں ''زبان (language)'' بولی جانے والی آوازوں کے اس ذریعے (medium) کو کہا جاتا ہے جس کے استعمال سے کوئی بھی فرد دوسرے فرد تک اپنے مافی الضمیر کو پہنچانے کا کام لیتا ہے۔ مافی الضمیر مختلف شکلوں میں ہوسکتا ہے لیکن بنیادی طور پر زبان کے میڈیم کا کام افراد کے مابین نطقی وسمعی (گویائی اور سماعتی) تعلق پیدا کرتا ہے۔ دنیا کی پہلی زبان یا بولی کون سی تھی؟ پہلا انسان کون تھا؟ ان مباحث کے بارے میں تاریخی لسانیات (historical linguistics) خاموش ہے۔ البتہ لسانیات کے اصول ہمیں قیاسی طور پر یہ بتاتے ہیں کہ روئے زمین پر انسانوں کا شروع دور کا گروہ کوئی زبان (جیسا کہ آج زبان بولی جاتی ہے) نہیں بولتا تھا۔ اُن کو اپنے مطلب و مقصد کے لیے اشاروں کی زبان یا حرکات وسکنات والی بولی سے کام چلانا پڑتا ہوگا جو کسی خاص یا ایک ہی محدود خطے تک ہی ان کے کام آپاتے۔ ضروری نہیں تھا کہ ان کے اشارے عالم گیر ہوتے ہوں اور دوسرے قبائل یا افراد بھی ان کو ویسے ہی ٹھیک سمجھ پاتے ہوں۔ رفتہ رفتہ منہ سے نکلنے والی بے معنی و بے ربط آوازوں میں حلق سے لے کر زبان، ہونٹوں اور دانتوں کی رکاوٹوں نے ''ہاؤ ہو'' آوازوں کو نئی مختلف شکل دے ڈالی اور یوں لفظ کی صورت زبان یا بولی وجود پانے لگی۔ انسان کی

ایجاد جب اس کے لیے آسانیاں دینے لگی تو پھر انسان نے چھوٹے چھوٹے جملے بولنا چاہے اور یوں بولی یا زبان کی اختراع آگے بڑھنا شروع ہوئی۔

بولی اور زبان کا تعلق:

زبان کے آغاز سے متعلق کوئی تحقیق یا بات کرنے سے قبل یہ دیکھا جانا بہت ضروری ہے کہ زبان اور بولی کے درمیان کیا تعلق ہے۔ بولی اور زبان کے رشتے سے مراد اُن حدوداور افتراقات کو دیکھا جانا مقصود ہے جو کسی زبان کو بولی سے اور بولی کو زبان سے ممتاز کرتی ہیں۔ دنیا کی پہلی زبان کون سی تھی، اس کے متعلق حتمی بات کہنا دیوانے کے خواب سے زیادہ نہیں۔ لیکن اس پہلی زبان کے بارے میں۔ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ وہ زبان اوّل اوّل کوئی بولی تھی جو لسانی استقلال کو پہنچتے پہنچتے زبان کے درجے پر فائز ہوئی۔ لسانیات کے اصولوں کے تحت سب سے پہلی بولی وجود میں آتی ہے۔ اس بارے میں گیان چند کا اقتباس ہے کہ:

> ایک بحث ہے کہ زبان اور بولیوں کا تاریخی رشتہ کیا ہے۔ کیا امتداد زمانہ کے ساتھ ایک زبان بٹ کر بولیوں میں تقسیم ہوگئی یا مختلف بولیاں مل جل کر زبانیں بن گئیں۔ یعنی بولیاں پہلے آئیں یا زبان؟ اینان اور میکس مولر کا خیال ہے کہ زبان کا فطری ارتقا اشارے اتحاد کی طرف ہے۔ ابتدا میں انسانی بولیاں متعدد ٹکڑوں میں بٹی ہوئی تھیں۔ میل جول کے ساتھ اختلافات کم ہوتے گئے اور وہ ایک زبان کی شکل میں گھُ گئیں۔۔۔ امریکی ماہر لسانیات وہٹنے اس نظریے سے اتفاق نہیں کرتا۔ اس کی رائے ہے کہ زبان پہلے آئی اور وہ آہستہ آہستہ بولیوں میں تقسیم ہوگئی۔ کچھ اور عرصے بعد یہ بولیاں خود زبان کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں اور ان سے پھر بولیاں پیدا ہوتی ہیں۔ (۱)

بولی (Dialect) لفظ کا مفہوم بولی جانے والی متواتر آوازوں کے سلسلے پر لاگو ہوتا ہے۔ یعنی ایسی تقریر، الفاظ، جملے جو انسان کو ابلاغ کے لیے ضرورت بن کر پیش آئے۔ دنیا میں انسانوں کے پہلے گروہ کے بارے میں یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ وہ بولی سے ناواقف تھے۔

یعنی انسان حیوانوں کی طرح خاموش زندگی کا عادی تھا۔ اس دور میں اسے چھوٹی موٹی ضروریات کے لیے اشاروں کی زبان (حرکات) سے بڑی حد تک مدد مل جایا کرتی تھی۔ جب انسانوں کی آبادیاں اور ضرورتیں بڑھیں تو یہ اشاروں کی زبان ناکافی سمجھی گئی تو انسان پھیپھڑوں سے واپس آنے والی ہوا کے رستے میں ''اعضائے صوت'' کی رکاوٹوں سے آوازوں (حرفوں) پر قادر ہوا جو بعد میں چھوٹے چھوٹے لفظوں میں ڈھلتے چلے گئے۔ چھوٹے چھوٹے لفظ انسان کی شروع روز کی ضروریات کی انجام دہی کے لیے بڑے معاون ثابت ہوئے چناں چہ بولی کا عمل شروع ہوا۔ لفظ سے جملے تک کے اس سفر میں انسان کو کتنا عرصہ لگا یہ بات اہمیت نہیں رکھتی۔ چناں چہ انسان کی دوسری تمام ایجادات و اختراعات سے زیادہ اہم ایجاد زبان/بولی ٹھہری۔

بولی زبان کی ابتدائی شکل ہے۔ بولی دراصل زبان کی سیال حالت کا نام ہے جب زبان کا یہ ابتدائی روپ الفاظ، تلفظ، ذخیرہ الفاظ اور قواعدی تنوعات کی زد میں ہوتا ہے اور ان عوامل کی ٹکسال میں ڈھل کر ایک خاص حالت کو پہنچتا ہے۔ جب یہ تخلیق کے قابل ہوتا ہے۔ جب یہ روپ لسانی استقلال کو پہنچتا ہے تو اس لسانی استقلال کے تحت بڑا ادب تخلیق ہوتا ہے۔ اور یہ تخلیق بولی کو زبان کے درجے پر پہنچا دیتی ہے۔ بولی سے زبان بننے کا یہ عمل عشروں، صدیوں پر محیط ہوتا ہے۔ بولی کے زبان بن جانے کے بعد بولی ختم نہیں ہو جاتی بلکہ زبان کو خلق کرنے کے بعد زبان کے وجود میں نفوذ کر جاتی ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس زبان کے مختلف لہجوں، مختلف علاقائی ثقافتوں، مقامی تہواروں، اشیا کے ناموں کو اپنا کر نیا روپ لے لیتی ہے اور اس مرکزی زبان کے دھارے سے مختلف علاقوں کی وجہ سے مختلف بولیوں کا طلوع ہوتا ہے۔ بعد میں یہ بولیاں زبان کے مختلف روپوں کی صورت میں وجود میں آ جاتی ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ زبان کو زبان بننے کا جواز، مواد اور توانائی بولی سے ملتی ہے اور زبان آگے چل کر مختلف بولیوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ یہ الٹ پھر زبان اور بولیوں کے ہونے اور زندہ رہنے کا جواز بنتا ہے۔ ہم اس تمام بحث کو اس جملے میں سمیٹ سکتے ہیں کہ بولی سے ایک زبان بنتی ہے اور پھر وقت گزرنے کے ساتھ یہ مرکزی زبان مختلف بولیوں میں بٹ

جاتی ہے۔ یہ بولیاں زبان کو کمزور نہیں کرتیں بلکہ زبان کو مضبوطی و زندگی عطا کرتی ہیں۔ ذیل میں بولی اور زبان پر الگ مباحث سے ان کی حدود متعین کرنے میں مدد ملے گی۔

بولی (dialect):

بولی (زبان) انسان کے لیے اسی طرح ضروری ہے کہ جس طرح زندہ رہنے کے لیے ہوا اور پانی۔ بولی اور زبان کا بنیادی کام انسان کی ابلاغی ضروریات کی انجام دہی ہے۔ لیکن بولی کو زبان سے الگ کر کے دیکھا جانا مقصود ہے کہ بولی کی وہ کون سی خصوصیات ہیں جو زبان سے اسے علیحدہ کرتی ہیں۔ بولی کسی مخصوص علاقے میں بولی جانے والی زبان ایسی ذیلی شاخ ہوتی ہے جس کے بولنے والوں کو کسی قسم کی لسانی اختلاف کا احساس نہیں ہوتا۔ بولی اگر کسی زبان کے تحت ہو تو ایک اکائی کی صورت میں سامنے آتی ہے جو ضروری نہیں کہ مرکزی زبان کی طرح پورے ملک میں بولی سمجھی جائے لیکن یہ بولی اپنے خاص چھوٹے سے علاقے میں ضرور بولی سمجھی جاتی ہے۔ اب یہ بولی اس وقت مختلف ہو کر سامنے آئے گی جب اس بولی کے بولنے والے کسی دوسرے علاقے میں جائیں گے جہاں یہ بولی تلفظ، ذخیرہ الفاظ یا کسی اور اختلاف کے باعث نامانوس، غیر مانوس یا اجنبی محسوس ہو گی۔ بولی زبان کی ایسی خاص اور مختلف شکل ہوتی ہے جو کسی خاصے علاقے تک محدود ہوتی ہے اور وہاں کے لوگوں کی ابلاغی ضرورتوں کو پورا کرتی ہے۔ بولی دو آدمیوں کے مابین سمجھوتے کا نام ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ سمجھوتا پورے ملک کی آبادی کے درمیان ہو۔ بولی اور زبان میں بنیادی فرق ادائیگی کا تنوع (Speech Variety) بولی کی تعریف اور زبان کی تعریف میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا۔ بولی کیا ہے؟ اس بارے میں خلیل صدیقی لکھتے ہیں:

> عام طور پر بولیاں (Dialects) زبان کی بگڑی ہوئی صورتیں سمجھی جاتی ہیں۔ بعض لوگ انھیں گنوارو بھی کہہ دیتے ہیں۔ جن لوگوں کی بولی معیاری سمجھی جاتی ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ جاہل اور نچلے طبقے کے لوگ صحیح تلفظ پر قادر نہیں ہوتے یا لاپروائی برتتے ہیں اور اپنے غلط سلط تلفظ سے زبان کو بگاڑ دیتے..... لیکن اگر

ہم بولیوں کے منصب اور مقصد پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ وہ ابلاغ کا وسیلہ
ہوتی ہیں ...... بولی اور زبان کی ماہیت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ زبان کی تعریف
کا اطلاق بولی پر بھی ہوتا ہے۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ بولی کا لسانی حلقہ زبان
کے مقابلے میں چھوٹا ہوتا ہے۔ (لیکن) ملتی جلتی اور لسانی گروہ میں سمجھی جانے
والی سب بولیاں ایک ہی زبان کے زمرے میں شمار ہوتی ہیں۔ (۲)

بولی کسی مخصوص علاقے میں بولی جاتی ہے۔ اس محدود خطے/علاقے میں رہنے والے افراد کے علاوہ کوئی کسی دوسرے علاقے کا فرد اس مخصوص بولی کو سمجھ تو لیتا ہے لیکن یہ بات ضروری نہیں ہے کہ اس خاص علاقے کے لوگوں کے انداز کو ہو بہو نقل کر سکے۔ بولی پر قواعدی اصول (Grammatical Rules) کی پابندی سختی کے ساتھ لاگو نہیں ہوتی۔ بولی چوں کہ دو افراد کے مابین ابلاغ کے سمجھوتے کا کام کرتی ہے اس لیے اس کا معیاری ہونا اتنا اہمیت نہیں رکھتا۔ یہی وجہ ہے کہ بولی بولنے والے افراد عام طور پر خود کو گریمر کی پابندیوں سے آزاد محسوس کرتے ہوئے ابلاغ کو اہم سمجھتے ہیں اور یوں بولی دو افراد کے درمیان ابلاغ کا کام انجام دیتی ہے۔ گریمر کے اصولوں سے روگردانی بولی کا نقص شمار نہیں کیا جا سکتا۔ زبان کی نسبت بولی حرف ونحو سے اغماض برت سکتی ہے۔ بولی کا اطلاق ضروری نہیں کہ دو آدمیوں کے مابین ابلاغ تک محدود کر دیا جائے، بلکہ علاقائی تقریر وتحریر پر بھی یہ اصول لاگو کیے جا سکتے ہیں۔

بولی اور زبان میں کیا فرق ہوتا ہے، اس پر لسانی تحقیق بہت حد تک واضح ہے۔ عام طور پر زبان کی ہلکی پھلکی معلومات اد‌ھُدبُدھ رکھنے والے اصحاب کو موشگافیوں نے بولی اور زبان کے درمیان فرق کو ابہام میں ڈال دیا ہے۔ بولی کسی بھی زبان کا غیر ترقی یافتہ روپ ہوتا ہے جس میں کوئی بھی زبان ابھی سیال حالت میں ہوتی ہے۔ قواعدی اصولوں سے روگردانی و انحراف بولی میں پایا جاتا ہے پایا جا سکتا ہے۔ بولی کسی بھی زبان کا وہ ابتدائی روپ ہوتا ہے جس میں زبان لسانی استقلال کی طرف جا رہی ہوتی ہے۔ بولی میں تلفظ سے لے کر قواعدی اصولوں سے ہٹ جانا یوں بھی روا ہوتا ہے کہ بولی کا تعلق صرف بولے جانے سے ہوتا ہے۔

بولی کا اپنا ادب ہوتا ہے، جو ثقافت، تہذیب اور لوگوں کے ذہنی و معاشرتی رویوں سے موضوعات لیتا ہے اور سینہ بہ سینہ آگے بڑھتا ہے۔ اس ادب کو لوک ادب کہا جاتا ہے۔ لسانیات کا خصوصی علم نہ رکھنے والے اصحاب کا خیال ہوتا ہے کہ بولی میں تحریری و ادبی سرمایہ نہ ہونا طے کرتا ہے کہ ابھی بولی زبان نہیں بنی، جونہی کسی بولی میں تحریری سرمایہ (تخلیق یا تحریر) کی صورت میں مل جائے تو پھر اسے زبان کہا جائے گا۔ گیان چند جین بولی اور زبان کے فرق بارے لکھتے ہیں:

> آج بھی ایسے معصوم نظر آ جاتے ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ کسی بولی میں تحریری ادب وجود میں آ جاتا ہے تو اسے زبان کہتے ہیں اور جس زبان میں تحریریں نہ ہوں انھیں بولی ہی کہا جائے گا۔ حال آں کہ تاریخی لسانیات سے ابتدائی واقفیت بھی یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ زبان کی حیثیت عطا کرنے میں تحریر اور ادب بالکل غیر متعلق ہیں۔ بولی ایک جُزو ہے اور زبان اس کا کل۔ جس طرح ایک وفاق کسی اکائیوں پر مشتمل ہوتا ہے اسی طرح ایک زبان بولیوں کا وفاق ہوتی ہے۔ شاذ ایسی چھوٹی زبانیں ہوتی ہیں جو محض ایک بولی پر مشتمل ہوتی ہیں۔ بہر حال بولی کا تصور زبان کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔ ہر بولی کسی نہ کسی زبان کے تابع ہوتی ہے۔(۳)

جب بولی میں سیال حالت سے ٹھوس لسانی استقلال کی جانب چلتی ہے تو یہ معیاری بولی (standard dialect) بن جاتی ہے۔ علاقائی تلفظ سے ہٹ کر مرکزی تلفظ، گریمر اور ذخیرہ الفاظ جیسے عوامل اسے معیاری بولی کا درجہ عطا کرتے ہیں۔ یہ معیاری بولی رفتہ رفتہ وافر ادب کی تخلیق سے زبان کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ یہ عام جز سے ہٹ کر بولیوں کے مرکزی دھارے یعنی بولیوں کے وفاق میں شامل ہو کر مرکزی زبان کو مضبوط کرتی ہے۔ لیکن بولی زبان میں جا کر ضم نہیں ہوتی بلکہ اپنی شناخت کسی نہ کسی صورت میں برقرار رکھتی ہے۔ ہوتا یوں ہے کہ زبان جتنی بڑی سلطنت میں بولی جائے گی اس میں علاقوں کی کثرت کی وجہ سے اسی انداز سے لہجوں کے اختلاف اور ورائٹی کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ یہ مختلف علاقوں میں

علاقائی لہجوں، روایات، ثقافتی مظاہر اور اشیا کے مقامی ناموں کے استعمالات سے ان مرکزی زبان کے اندر سے بولیاں پھوٹنے لگتی تھیں۔ اب یہ الگ بات ہے کہ اگر مرکزی زبان کے اندر زیادہ توانائی ہو تو وہ بولیوں کو اپنے وفاق سے الگ نہیں ہونے دیتی۔

بولی بننے کے سلسلے میں یہ بات اہم ہے کہ اگر دو علاقوں کے رہنے والے لوگوں میں اتحاد و یگانگت اور میل ملاپ ہو تو بولیوں میں زیادہ لسانی اختلافات نہیں آتے۔ مثلاً لاہور اور فیصل آباد کی پنجابی زبان کے مقامی لہجوں میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ اسی طرح فیصل آباد اور راولپنڈی کے پنجابی لہجوں میں بھی زیادہ فرق نہیں ہے اسی طرح یہ بولیاں مرکزی زبان یعنی وفاق سے جڑی رہیں گی۔ اب اگر دو علاقے جنگ کی حالت میں ہوں یا کسی اور سماجی تقاضے کی صورت میں افراد کے درمیان آنا جانا اور ملنا ملانا نہ ہو تو دونوں مقامی بولیاں ایک دوسرے سے الگ ہونا شروع ہو جائیں گی۔ اسی طرح چند عشروں کے بعد یہ بولیاں اپنی اپنی جگہ پر دو الگ زبانوں میں بٹنا شروع ہو جاتی ہیں۔ اب اگر لدھیانہ، جالندھر اور امرتسر کی پنجابی زبانوں کو لاہور، فیصل آباد اور راولپنڈی کی زبانوں سے موازنہ کیا جائے تو پتا چلے گا کہ ہندوستانی پنجاب اور پاکستانی پنجاب کی زبانوں میں بہت زیادہ فرق نمودار ہو چکا ہے۔

بولیوں کی اہمیت مقامی یا علاقائی افراد میں زیادہ محسوس کی جاتی ہے۔ عام طور لوگ اپنی زبان کو میٹھی زبان اور دوسرے علاقوں کی زبانوں کو اکھڑ زبانیں کہتے ہیں۔ میٹھی زبان ہونا غیر لسانیاتی تصور ہے۔ دراصل زبان بولنے والے فطری طور پر اپنی زبان سے لگاؤ محسوس کرتے ہیں اور میٹھی بولی سے ظاہر کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ دوسرے علاقے کے لوگ اس بولی سے دلی لگاؤ محسوس نہ کریں۔ بولیوں سے جذباتی وابستگی محسوس کی جاتی ہے۔ بچہ اپنی شروع عمر میں مقامی بولی سب سے پہلے سیکھتا ہے اور اس کے لیے کسی گریمر یا کتاب کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

بولی تبدیل ہوتے ہوتے معیاری زبان (standard language) کے دھارے میں شامل ہو جاتی ہے (یا تبدیل ہو جاتی ہے)۔ البتہ بولی کے مرکزی دھارے میں شامل ہونے کے باوجود اس بولی کو بولنے والے اپنے Accent کی وجہ سے اپنی بولی کو ظاہر کرنے

میں کام یاب رہتے ہیں۔ بولی کے نام علاقوں کی نسبت سے رکھے جاتے ہیں۔ مثلاً لاہور میں لاہوری بولی، دہلی میں دہلوی، ملتان میں ملتانی، گجرات میں گجری، سندھ میں سندھی وغیرہ۔ معیاری بولی (Standard Dialect) کے ضمن میں ایک بات پیش نظر رہے کہ مذہبی اہمیت کے علاقوں کی بولی کو معیاری بولی کا درجہ مل جاتا ہے۔ مثلاً دلی کی دہلوی اور لندن کی انگریزی، ملک کی باقی بولیوں میں سے زیادہ معیاری سمجھی گئیں۔ اس طرح دارالحکومت بننے یا تبدیل ہونے سے بھی دارالحکومت او رملحقہ بولیاں ترقی پا کر خاص اہمیت اختیار کر جاتی ہیں۔ مثلاً جب آگرہ ہندوستان کا دارالحکومت تھا تو برج بھاشا معیاری تھی۔ جب شاہجہاں نے دِلی کو مرکز بنایا تو برج کی بجائے کھڑی بولی معیاری قرار پائی۔

بولی کا اہم کام ابلاغ ہے ابلاغ کے لیے بولی کو ہر طریقۂ بیان استعمال کرنے کی آزادی ہوتی ہے۔ بولی میں ذخیرۂ الفاظ عموماً کم ہوتا ہے اس وجہ سے ابلاغ کو ہر ممکن طریقے سے ممکن بنایا جاتا ہے بولی میں تخلیقی استعداد کی کمی ہوتی ہے جس کی وجہ سے لوک ادب تھوڑا بہت تو تخلیق ہو جاتا ہے لیکن اتنے کم سرمایے میں کوئی بڑا فن پارہ تخلیق نہیں ہو پاتا۔ پراکرتوں میں سے جب تک سنسکرت نمودار نہیں ہوئی تھی اس وقت تک ''مہابھارت'' جیسا شاہکار نہیں لکھا جا سکا تھا۔

زبان (Language):

زبان انسانی زندگی میں لازمی نہیں لیکن ضروری ہے۔ ایک وقت تھا کہ جب بنی آدم کو زبان اختیار کرنے یا نہ کرنے کی آزادی تھی کہ اس شروع دور کے انسان کا کام زبان کے بغیر چل جاتا تھا لیکن آج زبان انسانی زندگی کے لیے ہوا اور پانی کی طرح لازمی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ زبان بولی کا ترقی یافتہ روپ ہوتا ہے۔ بولی جب کسی ٹھوس روپ اور لسانی استقلال کو پہنچتی ہے تو زبان کا درجہ اختیار کرنا شروع کر دیتی ہے۔ یہ بات کو ہم ایک مثال سے یوں واضح کر سکتے ہیں کہ ۱۵۰۰ ق۔م کے قریب آریا لوگوں کے ہندوستان حکمرانی کے وقت سنسکرت، مقامی پراکرتوں سے ترقی پا کر علیحدہ ہوئی اور بولی قرار پائی۔ بعد میں جب اس کا

ذخیرۂ الفاظ اور لب و لہجہ معتبر قرار پایا اور لسانی استقلال ملا تو یہ بولی کلاسیکی سنسکرت اور ویدک سنسکرت میں تبدیل ہو گئی۔ اول الذکر میں مہا بھارت، رامائن وغیرہ تخلیق کیے گئے اور موخر الذکر میں وید مقدس لکھے گئے۔ یوں ایک بولی چند صدیوں میں اتنی توانا ہو گئی کہ اس میں دنیا کی بڑی زبان بننے کی صلاحیت پیدا ہوئی۔ یہ ایک مثال بولی سے زبان میں تبدیل ہونے کے مرحلے کو بہ خوبی بیان کرتی ہے۔

دنیا کی سب سے پہلی زبان کون سی تھی جو بعد میں اُم الالسنہ قرار پائی، جس سے باقی زبانیں پیدا ہوئی؟ یہ راز تحقیق کی منزلوں سے کوسوں دور ہے اور شاید اس ضمن میں قیاسات سے زیادہ کام یابی نہ مل سکے البتہ زبان کیا ہوتی ہے اور کیسے معرض وجود میں آتی ہے، اس سلسلے میں لسانیاتی سائنس (linguistics) ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ زبان کی بدولت انسان کو نطق کی صلاحیت کا پتا شعور ملا۔ زبان ہی کی بدولت انسان کو "حیوان ناطق" کہا جاتا ہے یعنی انسان ایسا حیوان ہے جو ساتھی انسانوں سے زبان کی مدد سے بات چیت کر سکتا ہے اور اپنا مافی الضمیر بیان کر سکتا ہے۔ شروع دور میں زبان کی ابتدا کے بارے میں مذہبی نقطۂ نظر سامنے آیا، جس کے تحت باقی مظاہر فطرت کی پیدائش کی طرح زبان کو بھی عطیہ خداوندی سمجھا جاتا رہا اور اس بات پہ مذہبی مہر لگا دی گئی کہ زبان خدا کی بنائی گئی چیز ہے۔ قدیم یونان اور یہودیوں اور عیسائیوں کی مذہبی کتب کی تشریحات نے یہ نقطۂ نظر مضبوط کیا کہ زبان خدا کا عطیہ ہے۔ پروفیسر خلیل صدیقی اپنے مضمون "زبان کا آغاز" میں لکھتے ہیں:

> قدیم ادوار میں زبان کی تخلیق فوق الفطرت یا ماورائی قوتوں سے منسوب ہوتی رہی ہے۔ سقراط کی یہ رائے تھی کہ دیوتاؤں نے دنیا کی اشیا کے موزوں نام رکھے۔ نارس (Narse) دیو مالا کی رو سے "اوڈن دیوتا" نے زبان تخلیق کی۔ قدیم ہند میں "برہما" کو بھی زبان کا خالق سمجھا جاتا رہا اور "اندر" دیوتا بھی۔ یہودی عقیدے کی رو سے آدم نے خدا کی ہدایت کے بہ موجب اشیا کے نام مقرر کیے۔ مسیحی یورپ میں صدیوں تک "عہد نامہ قدیم" کی زبان عبرانی کو آسمانی زبان ہی نہیں بلکہ ام الالسنہ بھی سمجھا جاتا رہا۔ کم و بیش تمام مذاہب کی رو

سے زبان تخلیق ربانی قرار پاتی رہی۔ (۴)

اوپر دیے گئے اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یونان و عرب کے علما و افراد اس بات پر بہت واضح تھے کہ زبان عطیہ خداوندی، ایجاد خداوندی ہے۔ اس الہامی تصور کو تنقید و تحقیق سے آزاد کر دیا گیا تھا اس لیے اسکالرز کو اس پر سوچنا مشکل امر تھا لیکن اس تصور میں کچھ خامیاں بھی نظر آنا شروع ہوئیں۔ اس پر یہ بات بڑی شد و مد سے محسوس ہوئی کہ اگر یہ عطیۂ خداوندی ہے تو ہر لحہ، تبدیلی کے عمل سے کیوں گزر رہی ہے۔ ظاہری بات تھی کہ دیوتاؤں، خداؤں کی بھیجی ہوئی چیز کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا لیکن زبان تو عشروں میں ہی لب و لہجے، الفاظ کے رد و قبول کے عمل سے گزرتی رہی۔ اس لیے اس نقطۂ نظر پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت محسوس کی جانے لگی۔ زبان وہبی ہے یا اکتسابی، اس تحقیق کی وجہ یہ امر بھی بنا کہ اگر یہ عطیہ خداوندی ہوتی تو پھر اس میں تبدیلی کی گنجائش یا اجازت نہیں ہو سکتی تھی چناں چہ ماہرین لسانیات نے اس نظریہ پر تحقیق کی اور زبان کی وہبی وجود کو رد کر دیا گیا۔

مشرقی دنیا کے ایک اسکالر، ابو ہاشم معتزلی نے دسویں صدی عیسوی میں یہ نظریہ دیا کہ زبان انسان کی وضع کردہ ہے۔ اور یہ کہ یہ انسان کا ایک بہترین اکتساب ہے۔ (۵) اس عہد میں یورپ کے ممالک کلیسا کے شکنجے میں اس سختی سے جکڑے ہوئے تھے کہ کسی کو یہ بات سوچنے کی جرأت نہ ہوئی یا ان اقوام کی زبان کے دینیاتی نقطۂ نظر کو جھٹلانے کا خیال نہ ہوا۔ اٹھارھویں صدی عیسویں میں یورپ میں ایسے ماہرین لسان اٹھے جنھوں نے لسانیاتی اصول و ضوابط کی مدد سے وہی نتیجہ اخذ کیا جو ۹ سو سال پہلے ابو ہاشم معتزلی پیش کر چکے تھے۔ جرمن مفکر ہرڈر کو جدید لسانیات کے بنیاد گزاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ پہلی مرتبہ یورپ میں اس نے زبان کی پیدائش کے دینیاتی تصور کی تردید کی۔ خلیل صدیقی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> جرمن مفکر ہرڈر نے پہلی بار آغاز زبان کے دینیاتی نقطۂ نظر کی تردید کی اور اپنے ایک مضمون (۱۷۷۲ء) ''زبان کا آغاز'' میں یہ رائے ظاہر کی کہ اگر زبان تخلیق ربانی ہوتی تو زیادہ منطقی اور منظم زیادہ جامع اور بلیغ ہوتی۔ انسانی زبانوں میں جو بے قاعدگی، بے ڈھنگا پن اور تشنگی ہے، وہ اس بات کا ثبوت

ہے کہ زبان انسان کی وضع کی گئی ہے۔(۶)

زبان کیا ہے؟ بہ ظاہر سیدھا اور آسان سوال لگتا ہے لیکن جب کوئی ہم سے زبان کی تعریف کرنے کو کہے تو ایک دم محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے ذہن میں سوائے اس تصور کے کہ ''زبان خیالات کے اظہار کا ذریعہ ہے'' اور کوئی خاص چیز نہیں ابھرتی۔ زبان کی تعریف، حدود و قیود اور فنکشنز کا معاملہ اتنا سیدھا سادہ نہیں ہے۔ زبان انسان کی قابل فخر ایجاد اور یہ زبان کا ملکہ ہی ہے جس نے انسان کو حیوان ناطق (قوت گوئی والا حیوان) کے زمرے میں بانٹ کر باقی جانوروں سے ممتاز کر دیا ہے۔ زبان کی مختلف تعریفوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ مولانا محمد حسین آزاد سخندانِ پارس میں زبان کی تعریف کرتے ہیں:

> زبان (خواہ بیان) ہوائی سواریاں ہیں، جن میں ہمارے خیالات و جذبات سوار ہو کر دل سے نکلتے ہیں اور کانوں کے راستے اوروں کے دماغوں میں پہنچتے ہیں۔ جس طرح تصویر اور تحریر قلم کی دستکاری ہے جو آنکھوں سے نظر آتی ہے، ٹھیک اسی طرح تقریر ہمارے خیالات و جذبات کی منہ بولتی تصویر ہے جو آواز کے قلم سے ہوا پر کھینچ جاتی ہے۔(۷)

ڈاکٹر محی الدین قادری زور جیسے اسکالر نے بیسویں صدی کے شروع میں یورپی ممالک میں جا کر لسانیات کے موضوع پر پی ایچ۔ڈی کی۔ وہ زبان کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

> زبان کی واضح تعریف ان الفاظ میں کی جاسکتی ہے کہ زبان انسانی خیالات او راحساسات کی پیدا کی ہوئی ان تمام عضوی اور جسمانی حرکتوں اور اشاروں کا نام ہے جن میں زیادہ تر قوت گویائی شامل ہے اور جن کو ایک دوسرا انسان سمجھ سکتا ہے اور جس وقت چاہے اپنے ارادہ سے دُہرا سکتا ہے۔(۸)

زبان دراصل علامتوں کا ایک نظام ہے۔ جب یہ علامتیں اظہار میں آتی ہیں تو بامعنی زبان میں ڈھل جاتی ہیں۔ زبان بولیوں کا وفاق ہے۔ یعنی ایک زبان بہت سی بولیوں کے اجزا پر مشتمل ہوتی ہے۔ کسی بھی بولی میں ادب کی وافر تخلیق زبان کے بنانے کی طرف اہم

قدم ہوتی ہے۔ بولی اور زبان میں یہ اہم فرق ہے کہ بولی کی نسبت زبان میں تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار کے لیے قرینے وافر ہوتے ہیں اور اصناف کی فروانی بڑی تخلیق کو مختلف سانچے فراہم کرتی ہے جس کی مدد سے شاعری یا نثر کے ذریعے تخلیق کو اظہار کا قرینہ نصیب ہوتا ہے۔ ہم زبان کی تعریف ان الفاظ میں کر سکتے ہیں کہ یہ الفاظ کا مجموعہ ہے جو ابلاغ کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ زبان کا دوسرا روپ تحریر کا ہے۔ یعنی انسانی حلق سے ادا ہونے والی مختلف آواز وں کا مخصوص املا کے سانچے میں ڈھل جانا تحریری زبان کہلاتا ہے۔

زبان بولی سے کیسے ترقی پاتی ہے۔ اس سلسلے میں ان امور کو پیش نظر رکھا جا سکتا ہے۔ کہ تبدیلیِ الفاظ، الفاظ کا ردوقبول، تلفظ کا معیاری ہونے کی طرف رجحان، نئی زبانوں سے اختلاط اور لفظوں کا رد وقبول، تجارت، مذہب، حملہ آور کا کلچر، ٹیکنالوجی کا ملک میں وارد ہونا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جب بین الاقوامی زبانوں کا کسی ملکی بولی سے ٹکراؤ ہوتا ہے تو یہ ان امور سے متاثر ہو کر بولی ایک بھرپور زبان کے پیکر میں ڈھل جاتی ہے۔ زبان میں الفاظ، لہجہ، تلفظ، ذخیرۂ الفاظ، مفاہیم ٹھہر جاتے ہیں یعنی خاص استقلال کے درجے پر پہنچ جاتے ہیں (بولی میں میں البتہ تبدیلیاں وقوع پذیر ہوتی رہتی ہیں) پھر یہ زبان معیاری زبان بننے کے مرحلے کی طرف چلتی ہے اور جب کوئی بھی زبان معیاری زبان کا درجہ حاصل کر لیتی ہے تو اس میں ادب تخلیق کیا جانا شروع ہوتا ہے اور یوں یہ زبان معیاری ہو کر ملک میں جگہ بنا لیتی ہے۔

معیاری زبان (standard language):

معیاری زبان حرف، آواز، لفظ، تراکیب، گریمر (صرف و نحو) ذخیرۂ الفاظ اور تبدیلیوں کے باعث وجود میں آتی ہے۔ کسی بھی معیاری زبان کا جملہ، الفاظ، لہجے و تلفظ کے زیرو بم، ہر طرح کے تنوعات، فلسفہ، زبان کے معاشرتی و عمرانی کردار کو واضح کرتا ہے۔ ان امور کی موجودگی فیصلہ کرتی ہے کہ زبان میں راشٹری (ملکی) بننے کی صلاحیت ہے یا نہیں۔ معیاری زبان میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ ملک کے تمام علاقوں، صوبوں کے عوام کے لیے رابطے کا کام دے سکتی ہے۔ رابطے کی زبان کو lingua franka کہا جاتا ہے۔ مرکزی زبان

کے اندر اتنی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ مختلف بولیوں کے حامل افراد کے درمیان رابطے کا فریضہ بہ خوبی انجام دیتی ہے۔ زبان کا سارا ڈھانچہ الفاظ کی وجہ سے ممکن ہو پاتا ہے۔ الفاظ اور معانی کا آپس میں ایک مضبوط رشتہ موجود ہوتا ہے۔

معیاری زبان تعلیم وفن، ادب، فنونِ لطیفہ، مجلسی زبان، تہذیب وتمدن اور نظم ونسق کے کام میں لائی جاتی ہے۔ معیاری زبان ان تمام امور کی انجام دہی کے لیے وافر الفاظ، تراکیب کا ذخیرہ رکھتی ہے۔ اگر کسی دوسری زبان کا متبادل لفظ یا ترکیب زبان میں موجود نہ ہو تو زندہ زبان کی یہ خوبی ہے کہ اس کو من وعن اسی طرح قبول کرلیتی ہے۔ الفاظ کا یہ لین دین کسی بھی زبان کے لیے لسانی خوراک کی حیثیت رکھتا ہے جس کے بغیر زبان کی زندگی کا تصور محال ہے۔ سنسکرت کی مثال سامنے رکھی جاسکتی ہے۔ دنیا کی اس عظیم تر زبان کو دوسری زبانوں سے الگ تھلگ کر کے جب لسانی خوراک سے محروم کیا گیا تو یہ عظیم زبان کا دیو ہیکل بت زمین پر آ گرا اور پاش پاش ہو گیا۔ اگر آریا قوم سنسکرت پر باقی زبانوں کے دروازے بند نہ کرتی تو ممکن ہے آج بھی سنسکرت پوری تاب وطاقت سے ہندوستان پر راج کر رہی ہوتی۔

قواعد وضوابط، صرف ونحو، تلفظ و املا کے سانچوں میں جکڑا معیار زبان کو ایک نزاکت عطا کرتا ہے اور زبان ادبی معیار پر فائز ہو جاتی ہے۔ یہ ادبی معیار تخلیقِ شعر ونثر کی رہنمائی کرتا ہے۔ اگر زبان قواعد وضابطے اور گریمر سے روگردانی کرتی ہے تو یہ بات واضح ہے کہ اس میں تخلیق کردہ ادب عظیم ادب بننے کی کسوٹی سے نیچے اتر جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ لوک ادب سے زیادہ زبان کے معیاری سانچوں میں ڈھلا ہوا ادب زیادہ اہمیت کا حامل ہو جاتا ہے۔ مرزا خلیل احمد بیگ لکھتے ہیں:

> زبان کی لسانیاتی سطح سے قطع نظر، اس کی ایک سطح وہ ہوتی ہے جو اس کی ادبی سطح کہلاتی ہے۔ ادبی سطح پر بھی زبان کی جڑیں سماج اور تہذیب کی ہر کروٹ زبان کے وسیلے سے ادب میں منعکس ہوتی ہے۔ گویا زبان وادب سماج اور تہذیب کا آئینہ دار ہوتا ہے۔[(۹)]

معیاری زبان کا نمونہ اگر اپنے اندر بہت زیادہ توانائی رکھتا ہو تو ضروری نہیں کہ یہ ملکی

سرحدوں تک ہی محدود ہے۔ بلکہ یہ زبان سرحدوں کو عبور کر کے دوسرے علاقوں میں بھی اپنی جگہ بنا لیتی ہے۔ مثال کے طور پر ہندوستانی زبان، ہندی یا اردو زبان صرف ہندوستان تک محدود نہیں رہی بلکہ اس وقت مجموعی طور پر یہ زبان پوری دنیا میں سب سے زیادہ بولی جانے والی زبانوں میں اپنی جگہ حاصل کر چکی ہے۔ زبان کو سرحدوں سے باہر نکالنے والے عوامل کا جائزہ لیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ بعض اوقات افراد کی دوسرے ممالک میں نقل مکانی، فاتح یا مفتوح کے ذریعے سے زبان سرحدوں کو عبور کرتی ہے۔ اس سلسلے میں سنسکرت کی مثال ادب کے حوالے سے دی جا سکتی ہے کہ مہابھارت اور رامائن جیسی بڑی تخلیق نے سنسکرت کو ہندوستان سے نکال کر دنیا بھر کے ادب خانوں اور ادب دوستوں تک پہنچایا، جب کہ عربی زبان میں مذہب اسلام کی اشاعت و تبلیغ سے عربی مختلف قومیتوں اور جمعیتوں تک پہنچی۔

اب آخر میں ان امور کی طرف توجہ کرتے جن کے تحت زبان تبدیلیوں کے عمل سے گزرتی رہتی ہے۔ تبدیلی کا عمل زبان کی حرکت پذیری کو ممکن بناتا ہے اور حرکت پذیری زبان کی زندگی کا تعین کرتی ہے۔ زبان اسی صورت میں زندہ رہتی ہے جب دوسری زبانوں سے الفاظ، محاورہ، تلفظ اور رد و قبول کا عمل جاری رکھتی ہے۔ اگر یہ لسانی خوراک زبانوں پر بند کر دی جائے تو زبان بہت جلد اپنا وجود کھو دیتی ہے۔ اس کی مثال کے لیے سنسکرت جیسی بلند پایہ زبان کو سامنے رکھیں تو پتا چلتا ہے کہ برہمن آریاؤں نے جب عوام پر سنسکرت کے بولنے سننے کے دروازے بند کر دیے تو اتنی بڑی زبان لسانی تعصب کا بوجھ سہار نہ سکی اور یہ عمارت زمین بوس ہو گئی۔ بعض اوقات ہوتا یوں ہے کہ عوامی استعمالات کے باعث زبان میں تلفظ اور معانی کے تنوعات داخل ہو جاتے ہیں جنھیں نام نہاد ثقہ جاگیردار ''گنوار پن'' قرار دے کر ان الفاظ کی گردن زدنی کے لیے لٹھ لے آتے ہیں اور چند علاقوں کے لہجوں اور ادائیگیوں کو معیار قرار دے دیتے ہیں۔ لسانیات کی رو سے ان تبدیلیوں پر غلط یا صحیح کا فتویٰ لگانا خالصتاً غیر لسانیاتی رویہ ہوتا ہے جس کی علمی حیثیت تو مانی جا سکتی ہے لیکن سائنسی حیثیت صفر ہوتی ہے۔ اس ساری بحث کو اس جملے میں سمیٹا جا سکتا ہے کہ زبان کسی بولی سے ترقی پا کر بنتی ہے۔ بعد میں یہ زبان مختلف علاقائی لہجوں اور دوسرے عوامل کے تحت چھوٹی چھوٹی بولیوں میں تقسیم ہوتی ہے۔ یہ

بولیاں قبیلوں کی تنہائی اور ثقافتی تقاطع کی صورت میں نمو پا کر ایک نئی زبان میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس طرح تعمیر و تخریب کا یہ سلسلہ رواں دواں رہتا ہے۔

حوالہ جات اور حواشی:

۱۔ گیان چند جین، عام لسانیات (نئی دہلی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۰۳ء دوسرا ایڈیشن) ص ۶۹

۲۔ خلیل صدیقی، زبان کیا ہے، (ملتان، بیکن بکس، ۲۰۰۱ء، بار دوم) ص ۴۸-۴۷

۳۔ گیان چند جین، اردو کے آغاز کے نظریے، مشمولہ اردو زبان کی تاریخ (مرزا خلیل بیگ) (علی گڑھ، ایجوکیشن بک ہاؤس، ۲۰۰۰ء، طبع دوم) ص ۳۸

۴۔ زبان کیا ہے، ص ۱۲۴

۵۔ ایضاً۔ص ۱۲۴

۶۔ ایضاً۔ص ۱۲۵

۷۔ محمد حسین آزاد سخندانِ پارس، مشمولہ: تین ہندوستانی زبانیں، از ڈاکٹر کے۔ ایس۔ بیدی (دہلی، کتب خانہ انجمن ترقی اردو،) ص ۹

۸۔ ڈاکٹر محی الدین قادر زور، ہندوستانی لسانیات، (لاہور، مکتبہ معین الادب، ۱۹۳۲ء) ص ۴۰۹

۹۔ خلیل احمد بیگ مرزا، اردو زبان کی تاریخ، (علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۰۷ء) ص ۴۰۹

1.2

برصغیر کا لسانی منظرنامہ

برصغیر پاک و ہند کا قطعۂ زمین بڑی بڑی تہذیبوں، متنوع اقسام کی ثقافتوں، کثیر اللسانی حیثیتوں، مختلف اقسام کے موسموں، مختلف مذاہب، جغرافیائی خدوخال، مصالحہ جات، قدیم ادبی فن پاروں، معدنیات و وسائل کی فراوانیوں اور بے حساب خوبیوں کی بدولت قدیم تاریخ سے لے کر جدید دور تک، عوام و حکمران ہر دو طبقوں کے لیے دل چسپی کا حامل رہا ہے۔ قدیم تاریخ سے دراوڑوں، آریاؤں سے لے کر جدید عہد کے نو آبادیاتی یورپی حکمرانوں کے لیے اس خطے میں ہمیشہ ایک کشش موجود رہی ہے جس کی بدولت غیر ملکیوں نے اس دھرتی کو مختلف مقاصد کے تحت تاخت و تاراج بھی کیا ہے اور حکمرانی بھی قائم کی تھی۔ ہندوستان کی تاریخ، تاریخِ عالم میں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ اہمیت قدیم مذہبی کتابوں (وید مقدس)، 'عالمی کلاسیک' کے درجے کے حامل ادبی فن پاروں (مہابھارت، رامائن وغیرہ) قواعدی کتب (پانینی کی سنسکرت گریمر) اور مختلف قسم کی تہذیبوں کے ادغام سے پیدا ہونے والے مختلف ثقافتی، لسانی، مذہبی اور ادبی روایت کے حامل برصغیر کا قدیم روپ پیش کرتی ہے۔

سترھویں صدی عیسوی کے آخری ربع کا جائزہ لیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ مغل بادشاہ اورنگ زیب کے توسیع پسندانہ عزائم سے دکن کی مسلم ریاستوں کو فتح کر کے ہندوستان بھر کی

سرزمین پر مغلوں کی فتح کا پرچم لہرا دیا گیا تھا۔ تعریف و تنقیص سے قطع نظر، آ کر ہندوستان سیاسی حیثیت کا جائزہ لیا جائے تو یہ عنصر سامنے آتا ہے کہ کئی صدیوں کی (بہمنی سلطنت سے لے کر سقوطِ دکن تک) شمالی و جنوبی ہند کی چپقلش، نفرتوں، مرکز گریز پالیسوں کو ختم کر کے ان کو دہلی کے مرکز کے زیر تسلط لایا گیا۔ اس فتح نے زندگی کے ہر ہر شعبے کو متاثر کیا۔ شمالی جنوبی ہند کی نفرت کی دیوار گری تو دونوں طرف کے ہندوستانیوں کا آپس میں رابطہ ہوا۔ اس طرح کے اخلاط سے ثقافتی و مذہبی لسانی و ادبی میدان بھی دونوں اطراف باشندوں کے میل جول سے تبدیلیوں کا شکار ہوا۔ اور ادیبوں کے آنے سے دونوں اطراف کے افراد کو ایک دوسرے کو سمجھنے کو موقع ملا۔ اس پر ادبی سطح میں بھی خوش نما تبدیلیاں دیکھنے میں آئیں۔ ۱۷۰۰ء میں ولی دکن (دکنی شاعر) کا دہلی سیر و سیاحت کے لیے تشریف لانا اور واپس جا کر اردو زبان (ریختہ) میں شعر گوئی کو استحکام دینا، ایک مظہر کے طور پر بہ طور مثال لیا جا سکتا ہے۔

اٹھارھویں صدی کے پہلے عشرے میں مضبوط حکومت کا مضبوط مغل بادشاہ، اورنگ زیب عالم گیر طبعی عمر پوری کرنے کے بعد ۱۷۰۷ء میں خالق حقیقی سے جا ملا تو اس کے جانشینوں کی نا اہل حکمران، قائدانہ صلاحیتوں کے فقدان، محلاتی سازشوں، غرض مختلف طرح کی بداعمالیوں کی وجہ سے برصغیر بہت بڑے تغیرات کا شکار ہوا۔ یہ تغیرات جن میں بہت بڑے ملک کا نااہل حکمرانوں سے سنبھل نہ پانا، آبادی کا بھوک، افلاس اور عدم تحفظ کا شکار ہونا، ریاستی باغیوں کی سازشوں سے بعض امن کے مسائل اور مغل حکومت کے زوال کی ابتدا جیسے عوامل شامل تھے، منہ زور ہوتے چلے گئے کہ چند عشروں بعد نہ مغلوں کی شان باقی رہی، نہ ملک باقی رہا، نہ رعب و دبدبہ اور نہ ہی وہ متحدہ ہندوستان جو اکبر اعظم سے لے کر عالم گیر تک محفوظ ہاتھوں میں موجود رہا تھا۔ یہ صدی مغل حکومت اور سیاسی، معاشی معاشرتی طور پر مسلمانوں کی ناکامی کی صدی تھی۔ لیکن یہ بڑی دل چسپ حقیقت ہے کہ اس صدی میں عوامی بول چال کی زبان، اردو مضبوط حیثیت سے ظاہر ہوئی۔ یہ زبان ہندوستان بھر میں مختلف ناموں سے پکاری جاتی رہی، اشرافیہ کی تحقیر کے وار سہتی رہی، فارسی کے سامنے دوسرے درجے کی، بھاکھا، ملیچھ، مورس، Vulgar اور جارگن جیسے کم حقیقت ناموں سے پکاری جاتی

رہی۔ لیکن یہ اردو زبان ایک نئی شناخت، نئی لسانی طاقت اور بھرپور ذخیرہ الفاظ کے ساتھ عوام و خواص کی زبان بنتی چلی گئی۔ اس زبان کو اسی صدی میں بہت بڑے ادیبوں نے شعر و نثر اور ادبی مقاصد کے لیے استعمال کیا یوں کچھ ہی عرصے میں یہ زبان فارسی (سرکاری زبان) کو تیزی سے پیچھے چھوڑتی چلی گئی۔ یہ زبان اتنی اہمیت اختیار کر گئی کہ ایسٹ انڈیا کمپنیوں کے تحت ہندوستان میں تجارت کے لیے آنے والے افراد نے اس میں لغت و قواعد نویسی کی کتب مرتب کرنے سے بہ طور زبان، اردو کو ایک مستحکم حیثیت پر فائز کر دیا۔ اردو زبان کی لسانی و ادبی حیثیت اور برصغیر میں اس کے خاندان اور دیگر زبانوں کو سمجھنے کے لیے برصغیر کی لسانی منظر نامے پر ایک طائرانہ نظر ڈالنا سود مند ہوگا۔

ا۔ برصغیر کی لسانی تقسیم اور مختلف زبانیں:

ہندوستان (پاکستان و بھارت) دنیا کے ان چند ممالک کی فہرست میں ایک ہے جس میں سیکڑوں بولیاں اور زبانیں بولی جاتی رہی ہیں اور آج بھی یہ زبانیں رنگارنگی کے ساتھ اس دھرتی پر موجود ہیں۔ دنیا بھر کی زبانوں کی تعداد کا صحیح علم قیاسات پر مبنی ہے، البتہ ماہرین لسانیات نے معلوم زبانوں کو، جن کی تعداد ہزاروں میں ہے، کو چند خاندانوں میں تقسیم کر کے ان کی درجہ بندی کی ہے۔ دنیا بھر کی زبانوں کو خاندانوں میں تقسیم کرنے کے پیچھے جو اصول ان کے پیش نظر رہے، ان میں زبانوں کی نحوی و ترکیبی خصوصیات، فونیمیائی مماثلتیں، حروف تہجی اور آوازوں کا اتصال و قبول، الفاظ کی صوتی مماثلتیں اور دوسرے عوامل شامل ہیں۔ دنیا بھر کی زبانوں کو ۸ سے لے کر ۱۰۰ مختلف خاندانوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین لکھتے ہیں:

> ۱۸۲۲ء میں جرمن عالم ہمبولٹ نے طے کیا کہ دنیا میں زبانوں کے کل ۱۳ خاندان ہیں۔ پارٹی رج نے دس ہی مانے۔ فریڈرک ملر اور بعض دوسرے علما کے مطابق ۱۰۰ خاندان ہیں۔ لیکن جے ڈبلیو پاول (Powell) نے ۱۸۹۱ء میں امریکہ ہی میں 54 خاندان قرار دیے تھے۔ سپیر نے ۱۹۲۹ء میں انھیں چھ

بڑے خاندانوں میں اسیر کیا۔ جب ایک علاقے کی زبانوں کے بارے میں
اتنا اختلاف ہو تو پوری دنیا کے خاندانوں کی کس طرح قطعی حد بندی کی جائے۔
بیسویں صدی کے نصف میں فرنچ اکیڈمی نے طے کیا کہ دنیا میں ۲۷۹۶
زبانیں ہیں۔ گرے بھی اس سے متفق ہیں۔ انھوں نے خاندانوں اور غیر مطلع
زبانوں کو لے کر ۲۶ گروہوں میں محصور کیا۔ (۱)

ڈاکٹر گیان چند جین نے زبان کے خاندانوں کی تقسیم جغرافیائی ٹکڑوں میں علیحدہ کر کے مختلف خاندانوں میں تقسیم کیا ہے جو زبانوں کی تقسیم کے عمل کو سمجھنے میں بہتر معاون ثابت ہوتا ہے۔ انھوں نے جغرافیائی تقسیم کے تحت چار خطوں میں زبانوں کو بانٹا ہے، جن میں امریکی زبانوں کا خطہ، آسٹرک خطہ، افریقی خطہ اور ایشیائی خطہ شامل ہیں۔ دیگر ماہرین السنہ نے دنیا بھر کی زبانوں کو آٹھ بڑے خاندانوں میں تقسیم کیا ہے جن کی ترتیب و تفصیل یوں ہے:
۱۔ سامی ۲۔ ہند چینی ۳۔ دراوڑی ۴۔ مونڈا ۵۔ افریقہ کی بانتو ۶۔ امریکی ۷۔ ملایا ۸۔ ہند یورپی۔ ان تمام خاندانوں کی موجودگی کی تحقیق کی جائے تو پتا چلتا ہے ان خاندانوں میں سے پانچ خاندانوں سے تعلق رکھنے والی سیکڑوں زبانیں اور بولیاں بھارت اور پاکستان کے مختلف علاقوں میں بولی، لکھی اور پڑھی جاتی ہیں۔

زبانوں کے علاقائی سروے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان کے شمالی علاقوں میں ہند چینی خاندان کی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ہندوستان کے جنوبی (دکنی) علاقوں میں دراوڑی خاندان کی بڑی زبانیں ملیالم، کنڑا، تلگو وغیرہ بولی جاتی ہیں۔ یہ زبانیں اپنی تاریخ کے اعتبار سے سنسکرت سے بھی زیادہ قدامت کی حامل ہیں۔ برصغیر کے وسطی علاقوں میں ہند یورپی سلسلے کے ایک بڑے حصے یعنی ہند آریائی خاندان کی زبانیں بولی جاتی ہیں جن میں دوسرے بہت سی ترقی یافتہ زبانوں کے ساتھ ساتھ ہندوستانی، ہندی یا اردو زبان ایک اہم زبان ہے۔ ہندوستان پر طویل مسلم دور حکمرانی میں فارسی زبان رائج رہی جو اسی آریائی خاندان کے سلسلے ہند ایرانی شاخ کی بڑی زبان ہے۔ مسلمانوں کی مذہبی زبان عربی ہے۔ مذہبی حیثیت اور مسلم اکثریت کی دل چسپی کی وجہ سے عربی زبان ہند و پاک کے بڑے حصے میں بولی، سمجھی اور پڑھی جاتی ہے۔

اس طرح ایک دل چسپ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ہندوستان بھر کی زبانیں آٹھ میں سے پانچ خاندانوں میں شامل ہیں جو پاک و ہند کی لسانی اہمیت کی ایک دلیل ہے۔

برصغیر میں زبانوں کے قدیم تاریخی سلسلوں پر نظر ڈالی جائے تو پتا چلتا ہے کہ یہاں قریباً پانچ ہزار قبل مسیح عہد میں منڈا نامی قبائل آباد تھے اور منڈاوی زبانیں بولتے تھے۔ ان قبائل کی زبانوں کے بہت سے الفاظ ہزاروں سال گزرنے کے باوجود آج کی اردو ہندی پنجابی زبانوں میں ملتے ہیں۔ جن کی تفصیل Hamilton Edith نے اپنی کتاب Mythology میں دی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر ان پر یوں تبصرہ کرتے ہیں:

> آج یہ الفاظ ہماری روزمرہ کی گفتگو میں عام استعمال ہوتے ہیں۔ نانا، نانی، ماما، مامی، پھوپھا، پھوپھو، سالا، سالی، موسی، بر (یعنی دولہا) پیڑھی (یعنی نسل)، نتھ، گہنا، آنچل، توڑا، ببول، ککڑی، نیم، بتہ... کیا آپ کو معلوم ہے کہ یہ اور ان جیسے لاتعداد الفاظ اس منڈاوی زبان کے ہیں، جو ہمارے علاقے میں آریاؤں بلکہ دراوڑوں سے بھی پہلے بولی جاتی تھی۔ یہ منڈا قبائل کی زبان تھی اور آج سے تقریباً چھ ہزار برس قبل رائج تھی۔ (۲)

منڈاوی قبائل کی جگہ جب دروازی نسل کے قبائل نے لی تو ان کی بولیوں کے بہت سے الفاظ قدرتی طور پر دروازی زبانوں کا حصہ بن گئے اور یوں ان بولیوں کے الفاظ ان کے مضبوط مظاہر کے طور پر زندہ رہے اور آنے والے دور کی زبانوں کا حصہ بن گئے۔ دراوڑی خاندان کی زبانوں کے نمونے بھی بڑی تعداد میں محفوظ نہیں کیے جا سکے اس لیے وہ کیا زبانیں بولتے تھے، کس قواعدی ڈھانچے پر یہ زبانیں کھڑی تھیں ان پر تحقیق ہنوز ادھوری ہے۔ البتہ دراوڑی تہذیب کے دو بڑے شہروں ہڑپہ اور موہن جودڑو کے کنڈرات سے ملے تحریری و تصویری نمونوں پر تحقیق جاری ہے۔

ڈھائی ہزار سال قبل مسیح (تقریباً) سے سائبیریا کے سرد علاقوں سے آریا قوم کی ہندوستان آمد کے سراغ ملنا شروع ہوتے ہیں۔ آریا قوم سائبیریا سے چلی تو دو بڑے قبیلوں میں بٹ گئی۔ ایک قبیلہ یورپ کے ممالک میں جا بسا اور دوسرا بڑا گروہ ایران سے ہوتا ہوا

ہندوستان کے زرخیز وسطی علاقے پر قابض ہوتا چلا گیا۔ یورپ میں موجود آریائی قبائل کی بولیوں سے یورپی زبانیں متاثر ہونا شروع ہوئیں۔ دوسرے گروہ سے ایران آنے کے بعد وہاں کی مقامی زبان فارسی کے روپ میں ڈھلتی چلی گئی۔ ۱۵۰۰ قبل مسیح کے قریب اس منظم قوم نے امن پسند غیر منظم دراوڑوں کو بزور شمشیر شکست دی۔ ان کے زرخیز وسطی علاقوں پر قبضہ کیا۔ دراوڑوں کی ایک بڑی تعداد کو دکن بھاگ جانے پر مجبور کیا اور بڑی اکثریت کو غلام بنا لیا ذاتوں پاتوں کے برہمن، کھشتری، ویش اور شودر طبقوں میں لوگوں کو بانٹ کر یہاں حکمرانی کا آغاز کیا۔ برہمن آریائی سرداروں نے مذہبی حکمرانی اپنے ہاتھ میں لے لی اور یوں دراوڑی رسوم و اطوار پر مشتمل نیا مذہبی نظام وضع کیا، جس کے لیے مذہبی کتب کی ضرورت محسوس کی گئی۔

آریاؤں کی بولی (جس کا نام ویدتھا) جب مقامی ہندوستانی بولیوں سے باہم آمیخت ہوئی تو ایک بڑی کلاسیکی زبان وجود میں آئی جسے سنسکرت کا نام دیا گیا۔ ''دیوتاؤں کی زبان'' کہلانے والی یہ زبان مقامی افراد جن میں شودر شامل تھے ان کے لیے بولنا تو درکنار سننا بھی ناقابل تلافی جرم قرار دے دی گئی۔ سنسکرت میں مذہبی کتب کی مرتب کی گئیں جن میں رگ وید، سام وید، یجر وید، اتھر وید اور مذہبی نوعیت کے احکامات شامل تھے۔ سنسکرت، عوام سے دوری کی وجہ سے نئے الفاظ کی لسانی خوراک سے محروم ہوتی چلی گئی۔ اقلیتی زبان ہونے کے باعث تقریباً ایک ہزار سال بعد زوال آمادہ ہونا شروع ہوگئی اور صرف مذہبی زبان کے طور پر کتابوں، بھجنوں اور پنڈتوں کے ذہن میں محفوظ ہوگئی۔ اس قدیم کلاسیکی زبان سنسکرت کا فارسی کے ساتھ تعلق اٹھارھویں صدی میں خان آرزو (ہندوستانی ماہر لسانیات) نے ظاہر کیا (جن کا اگلے باب میں ذکر ہے)۔ اسی صدی کے آخری ربع میں مشہور برطانوی سر ولیم جونز ہندوستان آیا تو سنسکرت کے ادب اور اس کی لسانی اہمیت کو دیکھ کر حیران رہ گیا تو پہلی مرتبہ مشرقی و مغربی اقوام کو اس لسانی حقیقت سے روشناس کرایا کہ یہ زبان قدیم یورپی کلاسیکی زبانوں، یونانی لاطینی زبانوں کے بہت قریب ہے اور یہ نتیجہ پیش کیا کہ ان کا مبدا ایک ہی ہے۔ یوں ان زبانوں کو آریائی زبانوں کی ذیل میں شامل کر کے نئی لسانی تحقیقات کا دور

شروع کیا گیا۔ اس زبان کے بارے سر ولیم جونز نے لکھا تھا:

سنسکرت زبان، اس کی قدامت خواہ کچھ ہو، ساخت کے اعتبار سے ایک عجیب زبان ہے، یونانی سے زیادہ مکمل، لاطینی سے زیادہ وسیع اور ان دونوں سے کہیں زیادہ شستہ و رفتہ، با ایں ہمہ ان دونوں سے اس کا بہت قریبی رشتہ معلوم ہوتا ہے۔۔۔ یہ رشتہ ایسا مضبوط ہے کہ کوئی ماہر لسانیات جو ان تینوں کا مطالعہ کرے، یہ یقین کے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان سب کا ماخذ ایک ہے جواب موجود نہیں ہے۔ ایسا ہی سبب جو شاید اتنا قوی نہ ہو، گاتھک اور کلٹانی، بلاشبہ جن میں اور مختلف محاوروں کا وجود ہے اسی ماخذ سے نکلی ہیں جن سے سنسکرت بھی ماخوذ ہے، اور قدیم فارسی کو بھی اسی خاندان میں شامل کیا جا سکتا تھا۔ (۳)

سنسکرت کی کلاسیکی حیثیت کو مہا بھارت، رامائین اور مقدس ویدوں کے ساتھ ساتھ، اس زبان کے پہلے قواعد نویس پاننی نے بھی اوجِ کمال پر پہنچایا۔ پانی جو کہ قبل مسیح دور کا ماہر زبان تھا اس نے سنسکرت زبان کی جامع قواعد کو مرتب کیا تھا اور اس کا نام ''اشٹ ادھیائے'' رکھا تھا۔ پانی ہندوستان کی دھرتی کا بھی پہلا قواعد نویس بن کر سامنے آیا۔ پانی کی لسانی کاوشیں بتاتی ہیں کہ قبل مسیح دور کے ہندوستان میں نہ صرف عظیم کلاسیکی فن پارے مرتب ہو رہے تھے بلکہ ان کی قواعد مرتب کرنے کے فن سے بھی ہندوستانی لوگ آگاہ تھے۔ پانی کے کارناموں سے آج کی اردو دنیا ناواقف ہے جو بدقسمتی کی بات ہے۔ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی پانی کی اہمیت کے بارے میں یوں اظہار کرتے ہیں:

افسوس یہ ہے کہ خود برصغیر پاک و ہند میں فارسی اور اردو کے قواعد نویس پانی کے نام اور اس کے کارناموں سے قطعاً نامانوس معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی نظر فارسی اور عربی کے نحویوں سے آگے نہیں بڑھتی۔ انھی کے افکار و خیالات اور ان کی صرفی و نحوی تشریحات کو وہ اپنے لیے رہنما قرار دیتے ہیں۔ اس کا ایک سبب شاید یہ بھی ہے کہ ہمارے قواعد نویس سنسکرت سے واقف نہ تھے اور نہ پراکرتوں اور ان کے ارتقا کی تاریخ سے آگاہ تھے۔ نہ انھیں ہند آریائی

زبانوں کی اصل و نسل کی تحقیق سے دل چسپی تھی۔ (۴)

آریا قوم نے اپنی زبان کو فخر سے ''سنسکرت'' (دیوتاؤں کی زبان) کا نام دیا جب کہ مقامی افراد کی بولیوں کو حقارت و نفرت سے ''پراکرت'' زبانیں کہا جس کا مفہوم تھا گری پڑی زبانیں۔ آریاؤں کا پراکرت زبانوں سے تحقیر کا رویہ ان کی قدر و اہمیت کو ختم نہ کر سکا اور ایک وقت آیا جب یہ ''گری پڑی بولیاں'' سنسکرت کے زوال کے بعد قریباً ۵۰۰ قبل مسیح کے قریب خاص اہمیت کی حامل ہو گئیں اور اس دور کے مذہبی و ادبی فن پاروں نے ان زبانوں کو ترقی یافتہ زبانیں بنا کر پیش کیا۔ ان بولیوں میں بڑا ادب تخلیق ہوا۔ تقریباً ۶۰۰ ق۔م کے دور میں برصغیر کے دو بڑے مذہبی پیشواؤں مہاتما بدھ (بدھ مت) اور مہاویر (جین مت) نے ان بولیوں میں مقدس تعلیمات کا پرچار کیا تو یہ مقامی بولیاں چمک اٹھیں اور ترقی کی شاہراہ پر آگے بڑھنا شروع ہوئیں۔ مہاتما بدھ کی مذہبی زبان ''پالی'' پراکرت زبانوں کے سلسلے کی پہلی ادبی پراکرت بن کر سامنے آئی۔ یہ پالی زبان اصل میں ماگھدی پراکرت کی ایک ترقی یافتہ بولی تھی جسے مہاتما بدھ کی مذہبی تعلیمات نے اس سلسلے سے ممیز کر دیا تھا۔ ہندوستان میں بولی جانے والی بڑی زبانیں ہند یورپی خاندان کی شاخ ہند آریائی سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس خاندان کے مختلف نام تجویز کیے گئے لیکن سب سے موزوں نام ہند آریائی خاندان قرار پایا۔ ہند آریائی خاندان کی تین ہزار پانچ سو سال کی تاریخ کو ماہرین لسانیات نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے جو ان کی زبان کے ارتقاء کے مراحل کو واضح کرتا ہے۔

ماہرین لسانیات سنسکرت کے ایک ہزار سال کے دور کو قدیم ہند آریائی زبانوں کا دور قرار دیتے ہیں جو ۱۵۰۰ ق۔م سے لے کر ۵۰۰ ق۔م کے ایک ہزار سال پر محیط تھا۔ وسطی ہند آریائی دور ۵۰۰ ق۔م سے لے کر ۱۰۰۰ عیسوی تک کے عہد تک محیط ہے۔ ۵۰۰ عیسوی کے قریب پراکرتیں زوال کی طرف جان شروع ہوئیں تو اگلے پانچ سو سال تک اپ بھرنش بولیاں ان کی جگہ لینے کے لیے سامنے آئیں۔ یہ اپ بھاشائیں جدید ہند آریائی دور اور وسطی ہند آریائی دور کا عبوری دور ہیں۔ اپ بھرنش کے بعد ہندوستان میں ۱۰۰۰ عیسوی کے قریب زبانوں کا جدید ہند آریائی دور طلوع ہوتا ہے۔ اس عہد میں مسلم حکمرانوں کی ہندوستان پر

عملداری سے نئی زبانوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جن میں ایک بڑی ترقی یافتہ زبان ہندوستانی تھی جسے آج اردو کہا جاتا ہے۔

۱۰۰۰ عیسوی سے ہند آریائی زبانوں کا جدید دور شروع ہوتا ہے جس میں اردو زبان ایک بڑی زبان کے طور پر سامنے آتی ہے۔ اس دور کے قریب اپ بھرنش زبانیں زوال کا شکار ہوئی تو شورسینی اپ بھرنش سلسلے سے تین بولیاں الگ ہونا شروع ہوئیں جن میں ایک راجستھانی بولی، دوسری پنجابی بولی اور تیسری ہندوی (اردو) زبان طلوع ہوئی۔ [۵] یہ ہندوی زبان آگے چل کر ہندوستانی بنی جسے آج ہم اردو کہتے ہیں۔ اسی ہندوی کا دوسرا روپ ہندی کی صورت اور نام سے بھارت میں بولا جاتا ہے جو اردو سے قواعدی طور پر مماثل ہے لیکن اس میں سنسکرتی اور بھاشائی الفاظ کا استعمال اردو سے اس کو الگ کرتا ہے۔ اس کے مقابل اردو زبان میں عربی فارسی الفاظ، تراکیب اور محاورہ اسے اردو کے نام سے شناخت دیتا ہے۔

۲۔ سترھویں صدی تک کا ادبی ولسانی ڈھانچہ:

۱۰۰۰ عیسوی کے میں سلطان محمود غزنوی ہندوستان کے مغربی علاقوں سے ہوتا ہوا پنجاب کے علاقوں میں اپنا تسلط جمانا شروع کر چکا تھا۔ اس کے لگاتار حملوں سے پنجاب کا علاقہ اس کے قبضے میں آ گیا تھا۔ پنجاب کے اہم شہر لاہور پر محمود غزنوی نے ایاز کو گورنر بنا کر اس کو اپنی قلمرو میں شامل کر لیا تھا۔ محمود کے ہندوستان پر حملوں سے یہاں کی مقامی پنجابی بولیوں، جن میں ملتانی اور لاہوری بولیاں شامل ہیں، ان میں فارسی، ترکی اور عربی الفاظ کی شمولیت تیزی سے شروع ہوئی۔ اس سے قبل محمد بن قاسم کے سندھ اور ملتان پر حکمرانی سے بھی ان زبانوں کا اختلاط مقامی سندھی اور ملتانی سے ہوا تھا اور اس کا پیمانہ محدود تھا لیکن غزنویوں کے تسلط کے بعد مقامی بولیوں میں عربی فارسی اثرات تیزی سے اور بڑے پیمانے پر پڑنا شروع ہوئے۔ غزنوی خاندان نے پونے دو سو سال حکومت کی اور یہاں پر فارسی زبان کو سرکاری زبان کے منصب پر فائز کیا۔ غزنوی عہد کے بعد غوریوں تغلق اور دوسرے مسلم خاندانوں نے بھی سرکاری زبان فارسی کو ہی برقرار رکھا اور تبدیل نہ کیا۔ سرکار دربار کی زبان

فارسی تھی۔

اس زبان کے متوازی مقامی سطح پر مختلف علاقوں میں ایک بولی نہ صرف یہ کہ موجود تھی بلکہ اس میں ابتدائی ادب بھی تخلیق ہو رہا تھا۔ اس بولی کا کوئی خاص نام نہ تھا۔ یہ بولی ہندوی بولی تھی جسے مختلف ہندوستانی علاقوں کی مناسبت سے علاقائی ناموں سے موسوم کیا جا رہا تھا۔ اس زبان کے ادبی روپوں سے اس کی شکل وصورت اور نام کی دل چسپ حکایت جڑی ہوئی ہے۔ امیر خسرو نے اس زبان کو ''دہلوی'' کا نام دیا تھا۔ گجرات میں اسے گجری / گوجری زبان، دکن میں دکنی، دلی کے آس پاس کھڑی بولی، کہیں اسے ہندوستانی / ہندی/ ہندوی اور زبانِ ہندوستان کے مختلف ناموں سے پکارا جاتا تھا۔ ان بولیوں کے ادب پاروں کے مطالعے سے اس زبان کا ناک نقشہ تھوڑے بہت لسانی اختلاف کے ساتھ تقریباً ملتا جلتا تھا۔ یہ ہندوی زبان آگے چل کر اہم زبان کے درجے پر فائز ہوئی۔ یہ زبان مختلف ناموں سے ہندوستان کی مقامی بولی کے طور پر ارتقا پذیر ہوتی رہی۔ بابا فرید، امیر خسرو، شیخ علی محمد جیوگام دھنی، خواجہ بندہ نواز گیسودراز، شاہ حسین حقیقت، ملاوجہی کی تخلیقات اور دکن کی شعری روایت کے مطالعے سے اس زبان کے ہر مختلف ادوار میں موجود مختلف روپ بہ طور مثال دیکھے جا سکتے ہیں۔ (۶)

سولھویں صدی کے ہندوستان پر ظہیر الدین بابر کی حکومت (۱۵۲۶ء) سے ''مغل دورِ حکومت'' کا آغاز ہوتا ہے جو تاریخ ہندوستان کا ایک اہم باب ہے۔ ظہیر الدین بابر نے ''سلطنت پیرڈ'' کی سرکاری زبان فارسی، کو سرکاری زبان کے منصب پر برقرار رکھا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ اس دور تک کے اشرافیہ کی زبان کے علاوہ سرکاری معاملات اس زبان میں ادا ہو رہے تھے اس لیے اس کی تبدیلی آسان نہیں تھی۔ سولھویں صدی میں ہندوستان میں پرتگالی قوم نے تجارتی مقاصد کے تحت آمدورفت شروع کی۔ اکبر اعظم کے دربار میں یورپی افراد کی آمدورفت کو تاریخ کے اوراق میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ اس عہد تک اردو زبان دربار سے الگ عربی، فارسی، سنسکرت اور علاقائی بولیوں سے متواتر اثرات قبول کر رہی تھی۔ مغلوں کے دور میں فارسی زبان میں شعر و ادب تخلیق ہوتا رہا۔ اس کے مقابل دکن کی بہمنی سلطنت کے زیر اثر دکنی زبان کو سرکاری زبان قرار دیا جانے کا عمل، اس سلطنت کے انقطاع کے بعد بھی

بدستور جاری رہا۔ جس دور میں مغلوں نے شمالی ہند پر حکمرانی کا آغاز کیا۔ اسی عہد میں دکن میں بہمنی سلطنت ختم ہوئی اور پانچ بڑی ریاستیں آزاد ہو گئیں جن کے نام گول کنڈہ، بیجا پور، احمد نگر، برار اور بیدر ہیں۔ شمالی ہند سے مرکز گریز پالیسی کی روایت جاری رکھتے ہوئے ان ریاستوں کے حکمرانوں نے دکنی زبان کو سرکاری زبان کے طور پر برقرار رکھا جو ایک طرف مقامی زبان سے الفت کا ثبوت تھا جب کہ دوسری طرف دہلی حکومت سے علیحدگی کا مظہر تھا۔ ان ریاستوں میں گولکنڈہ اور بیجاپور کے حکمرانوں نے دکنی زبان (جو اردو کا پرانا نام ہے) میں تخلیقِ ادب کی سرپرستی کو جاری رکھا اور ان ریاستوں میں دکنی مثنوی، غزل، قصیدہ اور دوسری اصنافِ نظم کی تخلیق کا عمل جاری رہا جس سے اس عہد کے ادب کے ساتھ ساتھ لسانی منظرنامے کو سمجھا جانا آسان ہو جاتا ہے۔ اس طرح یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ہندوستان کا خطہ شمالی ہند اور دکن جیسے دو بڑے حصوں پر مشتمل تھا جس میں شمالی ہند کی اشرافیہ کی زبان فارسی تھی جب کہ دکن کی سرکاری و اشرافیہ کی زبان دکنی تھی۔

سولھویں صدی عیسوی میں ہندوستان میں یورپی افراد کی آمدورفت کا آغاز ہوا۔ ۱۴۹۸ء میں واسکوڈے گاما نے ہندوستان اور اس کے بحری راستے دریافت کر کے پرتگالی قوم کو ادھر آنے کی ترغیب دی۔ سولھویں صدی کے وسط تک پرتگال نے ہندوستان کی اہم بندرگاہوں پر اپنے قدم جمانا شروع کر دیے۔ تجارت کے مقاصد کے تحت اس قوم نے ہندوستان میں تیزی سے علاقوں اور منڈیوں میں اپنا اثر و رسوخ قائم کرنا شروع کر دیا۔ نئی سرزمین اور نئی زبانوں سے سابقہ پڑا تو ان کو سرکاری زبان فارسی اور مقامی زبان ہندوستانی کی اہمیت کا اندازہ ہوا اور یوں ان دونوں بڑی زبانوں کی قواعد و لغات اور ''مکالمات'' پر کتب لکھنا اور ترتیب دینا شروع کیں۔ پرتگال اس دور میں یورپ بھر کے ممالک میں سیاسی تفوق اور تسلط کا حامل تھا۔ پرتگال نے ہندوستانی زبان کو یورپ میں متعارف کرایا تھا۔ لسانی حوالے سے یہ بات اہمیت کی حامل ہے کہ مقامی ہندوستانی زبان، جسے آج اردو زبان کے نام سے پہچانا جاتا ہے، اس میں پرتگالی زبان کے الفاظ کثرت سے شامل ہوتے چلے گئے جو آج بھی ہمار روزمرہ زبان میں موجود ہیں اور عوامی زندگی کا لازمہ ہیں۔ (۷) پرتگالیوں کے بعد

ہندوستان میں فرانسیسی قافلے تجارتی مقاصد کے تحت آئے۔ اُن اقوام کے، قدم جما لینے کے
بعد انگریز قوم یہاں آئی اور یوں ان تینوں ممالک کی تجارتی کمپنیوں میں مقابلہ سازی کا بڑا
رجحان دیکھنے میں آیا اور ہندوستان بہ طور تجارتی منڈی کے ایک نئے ماحول و معاشرت سے
آشنا ہوا۔ نووارد یورپی اقوام کو سرکار سے خط و کتابت اور دفتری معالمت کے لیے فارسی زبان
اور مقامی آبادی سے لین دین اور بول چال کے لیے مقامی ہندوستانی زبان کی اہمیت،
افادیت اور سیکھنے کی ضرورت پیش آئی، جن کے تحت ان زبانوں کی لغات و قواعد نویسی کی
طرف یورپی مستشرقین نے خاص توجہ دی (جس کی تفصیل مقالے کے دوسرے باب میں
موجود ہے)۔ سولھویں اور سترھویں صدی کے برصغیر کے لسانی مزاج اور منظر نامے کو یورپی
افراد اور اقوام کی غیر موجودگی سے سمجھا جانا مشکل ہے۔

مغل بادشاہ شاہجہاں کے عہد تک آتے آتے ہندوستانی زبان (اردو) عوامی بول
چال سے بڑھ کر مغل دربار میں اپنی مستحکم جگہ بنا چکی تھی۔ یوں دربار کی سرکاری معاملات تو
فارسی زبان میں ہی چلائے جا رہے تھے لیکن بول چال کے لیے اس ''مِلواں یا کھچڑی'' زبان
کا استعمال عام تھا جس کا سرکاری سطح پر ابھی تک کوئی خاص نام طے نہیں ہوا تھا۔ شاہجہان کا
نام تاریخ کے اوراق میں یوں اہم اختیار کر گیا کہ انھوں نے اس بے نام زبان کو ''اردوئے
معلّٰی'' کا نام دیا تھا جو آج بھی مروج ہے۔''(۸)

سترھویں صدی عیسوی میں شمالی ہندوستان محمد افضل کی ''بکٹ کہانی'' (نظم) سے اس
دور کے شعرا کا اردو زبان کی طرف رجوع و رجحان بہ خوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ جنوبی ہندوستان
میں اس صدی میں اردو شاعری (دکنی) میں توانا روایت مرتب ہو رہی تھی لیکن شمالی ہند میں اس
زبان کی طرف ادیبوں کی غالب اکثریت کا رجحان دکھائی نہیں دیتا۔ محمد افضل نام کے اس
شاعر کی نظم کو تواریخِ ادب میں خاص طور پر پیش کیا جاتا ہے اور اسے شمالی ہندوستان کا پہلا اردو
شاعر مانا جاتا ہے۔ ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

> ہندوستان کے شمالی خطۂ ارض میں تیرھویں، چودھویں، پندرھویں اور سولھویں
> صدی کے دوران اردو محض بول چال کی زبان تک محدود رہتی ہے۔ صوفیائے

کرام کے ملفوظات اور امیر خسرو (۱۲۵۳ء۔ ۱۳۲۵ء) کی شاعری سے قطع نظر اس پورے چار سو سال کے عرصے میں شمالی ہند میں اردو کی کوئی بھی تصنیف دستیاب نہیں ہوئی۔ شمالی ہند کا سب سے پہلا ادبی کارنامہ بکٹ کہانی ہے جس کا دور تصنیف ۱۶۲۵ء سے قبل کا زمانہ تسلیم کیا گیا ہے کیوں کہ اس کے مصنف محمد افضل افضل کا انتقال ۱۶۲۵ء میں ہوا۔ (۹)

سترھویں صدی میں ''اردو زبان'' مصوتوں اور مصمتوں اور الفاظ و حروف کی ردو قبول سے لسانی تشکیل کے اس مرحلے سے گزر رہی تھی جس کے بعد یہ زبان اس اسلوب میں ڈھل گئی۔ جو آگے چل کر عبدالقادر بیدل کی غزل کا اسلوب کی صورت میں سامنے آیا تھا۔ افضل کی بکٹ کہانی کے نظم کے لسانی مطالعے سے اس لسانی تشکیل کا تجزیہ بہ خوبی کیا جا سکتا ہے۔ بکٹ کہانی کے اسلوب سے اردو زبان کی سترھویں صدی کی تشکیل کے مرحلے کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس نظم کا مطالعہ کرنے سے پتا چلتا ہے کہ اس عہد میں کون کون سے مصوتے، مصمتے اس زبان کا حصہ بن رہے تھے۔ کون سے الفاظ ایک دوسرے کے متبادل کے طور پر معاشرے میں بول چال کا حصہ تھے۔ (۱۰) سترھویں صدی میں اردو زبان پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ لکھتے ہیں:

کسی زبان کی لسانی خصوصیات، دراصل اس زبان میں ظہور پذیر ہونے والی لسانی تبدیلیوں کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ سترھویں صدی کی اردو کی بیش تر خصوصیات کا رشتہ پراکرت اور اپ بھرنش، بالخصوص شورسینی پراکرت اور شورسینی اپ بھرنش سے قائم کیا جا سکتا ہے۔۔۔ شمالی ہند میں اردو کے ارتقاء کے وقت دہلی اور نواح دہلی کی بولیوں کی بہت سی خصوصیات اس دور کی اردو کا جزو بن گئیں۔ رفتہ رفتہ اردو کی قدیم لسانی خصوصیات زائل ہوتی گئیں یہاں تک کہ جدید اور معیاری اردو کا نکھرا ہوا روپ سامنے آ گیا۔ (۱۱)

مغلوں کے اس عہد تک آتے آتے ایک بات پیش نظر رہے کہ مغربی اقوام کی ہندوستان میں آمدورفت شروع ہو چکی تھی۔ یہ لوگ فرانس، پرتگال، برطانیہ سے آئے تھے اور

ان کا یہ تجارتی اور نوآبادیاتی مشن بالآخر مغلوں کے زوال اور سقوط پر منتج ہوا (جس کی تفصیل باب نمبر ۲ میں بیان کی جائے گی)۔ یہ لوگ تبلیغ کے مقصد کے تحت بھی مقامی زبانوں کی تحصیل کی طرف مائل ہوئے۔ ان مبتدیوں نے مقامی زبان کو سیکھنے میں جو مشکلات برداشت کیں ان کو سامنے رکھ کر مقامی زبانوں سنسکرت اور ہندوستانی وغیرہ کی لغات اور قواعد پر مشتمل کتب لکھیں تا کہ ان کے ہم وطن افراد کو یہ زبانیں سیکھنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئے۔

مغرب سے آنے والے تاجروں، عیسائیوں مبلغوں نے اردو زبان کو Moors زبان کا نام بھی دیا۔ جس کا مطلب تھا بگڑی ہوئی، غیر ترقی یافتہ اور مسلمانوں کی زبان (اردو)۔ اس عہد میں نئے بننے والی یہ زبان جو ابھی تشکیل کے درمیانی مراحل میں تھی آنے والے دور میں سیاست، سماج، معاشرت اور ملک میں اہم مقام حاصل کرنے اور اہم کردار ادا کرنے کے لیے منتخب ہوئی تھی۔ شاہ جہانی عہد تک اس نئی زبان کا چلن اتنا بڑھ گیا تھا کہ سرکار کے دربار سے لے کر ہندوستانی عوام کی بول چال کے لیے اردو زبان ایک خاص مقام حاصل کر چکی تھی۔ اورنگ زیب عالم گیر کی وفات کے بعد جس تیزی کے ساتھ مغلیہ سلطنت زوال کی طرف بڑھتی چلی گئی اسی تیزی سے سرکاری زبان فارسی بھی اپنی قدر کھوتی چلی گئی۔

شمالی ہند میں اردو ادب میں شاعری کی روایت بارھویں اور تیرھویں صدی میں دکھائی دیتی ہے، جس کی ابتدائی جھلکیاں ہمیں شمالی ہند میں بابا فرید اور امیر خسرو کے بالترتیب پنجابی و فارسی کلام کے ساتھ ساتھ دکھائی دیتی ہیں لیکن یہ جھلکیاں اتنی خفیف ہیں کہ ہم کسی بھی شعری صنف کی با قاعدہ روایت کے آغاز کا سرا شمالی ہند سے ملتا دکھائی تو دیتا ہے لیکن با قاعدہ ادبی روایت کا آغاز نہیں بنتا۔ بہر حال اردو شاعری کا با قاعدہ آغاز دکن میں قائم بہمنی سلطنت میں ہوا۔ پندرہویں صدی میں فخر الدین نظامی نے اردو کی پہلی نظم لکھی، جو مثنوی کی ہئیت میں تھی۔ اس کا عنوان ''کدم راؤ پدم راؤ'' (المعروف مثنوی نظامی) تھا۔ اس مثنوی کے بعد طویل عرصہ تک ایسی نظم نہ لکھی گئی۔ اس نظم کی زبان آج کے قاری کے لیے بہت مشکل ہے۔ اس مثنوی میں جو زبان (دکنی) استعمال ہوئی اس میں عربی فارسی پنجابی ملتانی (موجودہ سرائیکی) کے ساتھ ساتھ دراوڑی زبانوں کے الفاظ کا اتنا ذخیرہ موجود تھا کہ اس ملغوبہ زبان میں تخلیق کی

گئی مثنوی کی خواندگی کا عمل عصر حاضر میں مشکل ثابت ہوا۔ ۱۶۳۵ء میں 'سب رس' کی صورت میں دکن میں ہی اردو کی پہلی باقاعدہ ادبی نثر وجود میں آئی۔ اس کے مصنف ملا وجہی کو تاریخ ادب میں ایک بڑے شاعر کے طور پر مانا جاتا ہے، لیکن اس نثری شاہکار نے ان کو جاودانی عطا کی۔ یہ نثر (اردو) آج کے قاری کے لیے بہت زیادہ لسانی مغائرت کا مظاہرہ نہیں کرتی۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ملا وجہی اسلوب میں فارسی الفاظ و محاورہ کی مقدار بڑھ گئی ہے۔

حوالہ جات اور حواشی:

۱۔ گیان چند جین، پروفیسر، عام لسانیات (نئی دہلی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۰۳، دوسرا ایڈیشن) ص ۲۴۴

۲۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو زبان کی مختصر ترین تاریخ (اسلام آباد۔ مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۲، طبع دوم) ص ۶۱۔۶۰

۳۔ ولیم جونز، سر، مشمولہ جامع القواعد (حصہ صرف) از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی (لاہور، اردو سائنس بورڈ، ۲۰۰۴، طبع دوم) ص ۱۳۹

۴۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، جامع القواعد ص ۱۵۲

۵۔ شورسینی اپ بھرنش سے ان تین زبانوں کے ارتقاء وعلیحدگی کے سلسلے کو جارج گریرسن کے لسانیاتی جائزۂ ہند سے مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

۶۔ ان ادیبوں کی تخلیقی جہات سے اس دور میں نہ صرف یہ کہ اردو زبان کی ادبی روایت کا تسلسل ارتقاء کی طرف چلی تھی بلکہ ان کی ادبی زبان کے مطالعے سے اس عہد کی ادبی و اشرافیہ کی زبان کے نمونوں کا یند عشمطالعہ بھی کیا جاسکتا ہے جس کے لیے ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی اردو ادب کی تاریخ میں تفصیلی تذکرہ موجود ہے۔

۷۔ رضیہ نور محمد، ڈاکٹر، مس، اردو زبان وادب میں مستشرقین کی علمی و ادبی خدمات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ (لاہور، لائن آرٹ پرنٹرز، ۱۹۸۵) ص ۱۲

۸۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو زبان کی مختصر ترین تاریخ (اسلام آباد۔ مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۲، طبع دوم) ص ۵۰

۹۔ خلیل احمد بیگ، مرزا، ڈاکٹر، اردو کی لسانی تشکیل (علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۰۹،

طبع دوم) ص ۱۴۰

۱۰۔ ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ نے اپنے ایک مضمون، 'سترھویں صدی کی اردو، چند صوتیاتی خصوصیات' میں، محمد افضل کی بکٹ کہانی کے لسانی مطالعے اور اشعار کی مثالوں سے سترھویں صدی میں اردو کے بدلتے روپ اور لسانی استقلال کو بڑھتے روپ کا تجزیہ پیش کیا ہے جو اہم ہے۔ یہ مضمون ان کی مرتبہ کتاب میں موجود ہے جس کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے۔

۱۱۔ خلیل بیگ، مرزا، ڈاکٹر، ص ۱۵۳

1.3

اٹھارھویں صدی کا ادبی ولسانی منظرنامہ اور مقامی قواعدنویسی

اٹھارھویں صدی عیسوی میں نہ صرف سماجی، معاشرتی اور نوآبادیاتی حوالے سے خاصی اہمیت رکھتی ہے بلکہ مقامی وسرکاری زبان فارسی کے عروج وزوال کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ برصغیر میں اٹھارھویں صدی تک آتے آتے دکن اور شمال کے دو بڑے مراکز میں دکنی اور فارسی، الگ الگ ادبی اور لسانی روایات دوخطوں کے مجموعی مزاج اور لسانی ترجیحات کی بہترین عکاسی کرتے ہیں۔ شمالی ہندوستان میں مغلوں کی مرکزی حکومت قائم تھی اور ان کی سرکاری زبان فارسی تھی۔ دکن کا خطہ ابھی مغلوں کے زیرنگیں نہیں تھا۔ دکن کی خودمختار ریاستوں میں سرکاری زبان مقامی دکنی (ہندوستانی/اردو) تھی اور یہ بوجوہ تھی۔ دکن کے حکمران مغلوں کے متوازی اور ان سے مختلف ''مرکز گریز پالیسی'' پر سختی سے عمل پیرا تھے۔ مقامی زبان سرکاری ہونے کی وجہ سے دکنی ادب وزبان کی نہ صرف حوصلہ افزائی کی جاتی بلکہ ادباء وشعرا کو سرکاری سرپرستی میں لے کر ادب کی تخلیق کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ یہ ایک بہت بڑا عنصر تھا جس کی وجہ سے اردو کا کلاسیکی شعری ونثری ادب دکنی میں مضبوط روایت کی

ابتدا کرتا ہے۔ قلی قطب شاہ کے دیوان اور ''سب رس'' تک آتے آتے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دکنی حکمرانوں کی دکنی مقامی زبان میں خصوصی دل چسپی نے ہی اس زبان میں شعری اور نثری اصناف کی مضبوط روایت کو محفوظ کر دیا تھا۔ دوسری طرف شمالی ہند میں اردو شاعری منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے تو کی جاتی تھی (اس کی توانا روایت موجود نہیں) لیکن وہاں کے شعرا فارسی زبان میں لکھنا اپنی شان سمجھتے تھے۔

ولی دکنی نے جب دہلی کا سفر اختیار کیا (۱۷۰۰ء) تو اس کے لیے یہ عجیب بات تھی کہ یہاں فارسی کے علاوہ کسی مقامی زبان میں ادب تخلیق کرنا کسرِ شان سمجھا جاتا تھا۔ چناں چہ ولی کی توجہ مقامی زبانوں کو فارسی زبان کے مقابل پیش کرنے کے لیے ایک نئے شعری اسلوب کی طرف ہو گئی۔ تاریخ میں شاہ سعد اللہ گلشن کا ولی کو ریختہ گوئی کا مشورہ بھی ریکارڈ کا حصہ ہے جس کی تفصیل ہمارے موضوع سے متعلق نہیں۔ ولی دکنی اور اس کے عہد کی زبان کا لسانی جائزہ لیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ اس دَور میں عربی اور فارسی زبانوں کے الفاظ دکنی زبان میں شامل ہو چکے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ مقامی لاہوری (پنجابی)، دکنی دراوڑی الفاظ کی موجودگی سے یہ نمونہ سامنے آیا۔ جو نیم پختہ روپ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس روپ میں پراکرتی عنصر اور عربی فارسی آہنگ باہم آمیخت ہوتا نظر نہیں آتا۔ ابھی یہ ملغوبہ ایک جان نہیں ہوا تھا البتہ ایک ایسا روپ سامنے آیا جسے عوامی سطح پر پذیرائی ملی اور خواص نے بھی اس میں زیادہ مین میخ نہیں نکالی۔ یہ زبان شاہجہانی عہد میں استعمال ہو رہی تھی اور رابطے کی زبان بن چکی تھی۔ شاہجہانی عہد میں یہ ہندوستانی زبان معیاری بنتی جاتی ہے۔ اس اعتبار سے ولی کا کلام شمالی ہندوستان کے عوامی لب و لہجہ سے زیادہ مختلف نہیں تھا۔ اسی لیے اس کلام کی پذیرائی ہوئی۔

اٹھارھویں صدی میں فارسی زبان میں بول چال اشرافیہ کے ہاں ایک معیار کا درجہ رکھتی تھی۔ یہ اس لیے بھی تھا کہ لوگوں کی سرکار دربار تک رسائی آسان ہو اور ان کی ترقی میں زبان کی وجہ سے کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان میں اس عہد میں فارسی زبان بولنا سمجھنا ایک سٹیٹس سمبل تھا۔ ایک وجہ اور بھی تھی کہ ہر سرکاری افسر و ملازم کو

فارسی زبان سیکھنا اس لیے بھی ضروری تھی کہ بادشاہ سے بات چیت میں آسانی رہے۔ مقامی ادبی روایت میں کہیں کہیں اردو کی کوئی غزل یا شعر پارہ بھی سنائی دے جاتا تھا۔ مثلاً عبدالقادر بیدل کی اردو غزل۔ فارسی کے ساتھ ساتھ، البتہ اس عہد میں اردو روایت کے نبھانے کی طرف رجحان ہو چلا تھا۔ محی الدین قادری زور اس عہد کے لسانی مزاج کو اس طرح دیکھتے ہیں:

> (شمالی ہند کے) فارسی شاعروں نے جب دیکھا کہ دکن میں اردو شعرگوئی کا ذوق ترقی کر چکا ہے اور وہاں بڑی بڑی کتابیں لکھی گئی ہیں تو وہ شوق سے دکنی ادب کی طرف بڑھنے لگے۔ اور چوں کہ اس اثناء میں فارسی شاعری سے اکتا گئے تھے، ایک غیر ملکی زبان میں کمال حاصل کرنے کے لیے انھیں کافی محنتیں کرنا پڑتی تھیں اور اس کے بعد بھی وہ ایرانی شاعروں کے مقابلے میں اپنے تیئں کمزور پاتے تھے۔۔۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ فارسی کی قدر کرنے والی سلطنتیں کمزور ہوتی جا رہی تھیں۔۔۔ تو انھوں نے فارسی کو ترک کرنا شروع کیا۔ یہ بیزاری اس حد تک پہنچی کہ جب سودا یا میر جیسا بڑا شاعر فارسی میں لکھتا تو لوگ یہ سمجھتے تھے کہ وہ اپنے رتبہ سے اتر کر یہ کام کر رہے ہیں۔ (۱)

دوسری طرف مستشرقین کی صورتحال دیکھیں تو ہندوستان میں سترھویں صدی کے اواخر اور اٹھارھویں صدی کے شروع تک جتنے لوگ تاجر، پادری یا سفیر کے طور پر ہندوستان آئے، انھوں نے سب سے پہلے مقامی زبانیں سیکھنے پر خاص توجہ دی۔ سنسکرت، پراکرت، فارسی، عربی اور ان سب کے ساتھ عوامی لنگوا فرینکا یعنی ہندوستانی زبان بھی اس دور میں سیکھنے جانے کا رجحان پیدا ہوا۔ ہندوستان کی تین بڑی پریذیڈنسیوں مدراس، کلکتہ اور بمبئی میں اس بات کا اہتمام کیا گیا کہ فارسی اور ہندوستانی زبان، نووارد مغربی افراد کو سکھائی جائے، تاکہ سرکار دربار سے معاملات طے کرنے میں آسانی رہے۔ غور سے مشاہدہ کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ مستشرقین اور (کمپنی کے) مغربی افراد نے اوّل اوّل ہندوستانی زبان کو اس لیے اختیار کیا کہ تجارت کے لیے یہ زبان ضروری تھی۔ دوسرا اس زبان کی تحصیل و تدریس سے اپنے سیٹ اپ

میں مقامی لوگوں کو کھپانا نسبتاً آسان ہو گیا تھا۔ چناں چہ مقامی آبادی کو نوکر رکھنے اور ان سے پوری طرح کام لینے کے لیے مقامی زبانوں کا علم بڑا ممد و معاون ثابت ہوا۔

اس عہد کی لسانی وادبی صورتِ حال یوں بھی واضح ہوتی ہے کہ اٹھارھویں صدی فارسی و عجمی تہذیب ثانوی اور مقامی اردو زبان اور ہندوستانی تہذیب اوّلین سطح پر آنا شروع کر دیتی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ اس تہذیب کا رخ عوام کی طرف مڑتا چلا گیا جو کبھی صرف اشرافیہ کے لیے ہی مخصوص تھی۔ اشرافیہ کی فارسی و عجمی تہذیب زوال کی طرف جانا شروع ہو گئی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں،

> علم و ادب جو اب تک فارسی زبان کے تعلق سے خواص کی جاگیر تھا، نئی زبان کے ابھرنے اور اہمیت اختیار کرنے کے ساتھ ہی عوام بھی اس میں شریک ہو جاتے ہیں۔ اور فارسی زبان، اس کا ادب اور اس کے اسالیب و اصناف اس نئی وادبی زبان میں جذب ہونے لگتے ہیں۔ شمالی ہند میں اٹھارھویں صدی سے پہلے اردو زبان میں لکھنا، کوئی قابل ذکر بات نہیں تھی۔ لیکن اس صدی کے ختم ہونے سے پہلے ہی اردو زبان نہ صرف فارسی کی جگہ لے لیتی ہے بلکہ ادبی زبان بن کر برصغیر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیل جاتی ہے۔۔۔
> جب انگریزوں کا اقتدار قائم ہوا تو اردو کو نہ صرف ہندو مسلمان ایک ساتھ استعمال کر رہے تھے، بلکہ معاشرت کی جڑوں تک پہنچنے کے لیے خود انگریز بھی اس زبان کو سیکھ کر وسیلۂ ابلاغ بنا رہے تھے۔ [۲]

ولی دکنی کی زبان کو ایک اور اہمیت بھی دی جانی چاہیے اور وہ یہ کہ ولی کی ریختہ گوئی کا نمونہ اصلاح زبان کی پہلی کاوش کے طور پر لیا جانا چاہیے۔ اس عہد کو مورخین و ماہرِ لسان 'اصلاح زبان' کا عہد کہتے ہیں اور عام طور پر اصلاحِ زبان کا عمل ایہام گوئی کی تحریک کے بعد پوری شدومد سے سامنے آتا ہے لیکن اس میں اگر یہ عنصر بھی شامل کر لیا جائے کہ ولی کے عہد سے ہندوستانی زبان یعنی دکنی میں اصلاح زبان یا تبدیلی کا عمل شروع ہوتا ہے اسی طرح اصلاح زبان کی روایت بھی دکن سے شروع ہو سکتی ہے۔ اس عہد میں دکن (اورنگ آباد) کا

اہم شاعر سراج اورنگ آبادی اصلاح زبان کے فریضے سے دہلی والوں سے کئی سال پہلے عہدہ
برآ ہو چکا تھا اور اس کی شاعری اس انوکھے اسلوب کی مثال بن کر سامنے آئی ہے جو دہلی کو
نصف صدی بعد میسر ہوا۔ ولی کی اصلاح زبان کی کاوشوں سے زبان کا ایک گوارہ اور خوش نما
روپ سامنے آیا تھا۔

اصلاحِ زبان کے ضمن میں یہ بات اہمیت کی حامل ہے کہ ولی کے دیوان کی دہلی آمد
کے مابعد اثرات کے تحت اصلاح زبان وسخن کی جو تحریک چلی اس نے میر و مرزا کے لیے
جدید اردو روپ ہموار کرنے میں بڑی معاونت کی۔ ولی سے میر و مرزا تک کے عہد کو البتہ،
اصلاح زبان کا دوسرا دَور شمار کیا جانا چاہیے۔[۳] اس اصلاح کے دَور سے اردو کی وہ صورت
سامنے آئی جو آج کی اردو کی شکل میں ملتی ہے۔ اصلاح زبان کے دَور میں شاہ حاتم، مرزا
مظہر، خان آرزو اور ان کے بہت سے شاگردوں کا ایک ایسا کردار سامنے آتا ہے جس سے
ہندوستانی زبان پراکرتی عناصر کو، مقامی اور دکنی محاورات و الفاظ کو قلم زد کرتے ہوئے عربی
فارسی تراکیب و الفاظ کو اپنے دامن میں جگہ دیتی چلی گئی۔

ا۔غرائب اللغات از ملا عبدالواسع ہانسوی:

اردو زبان میں لغت وقواعد نویسی کی مشرقی روایت کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے
کہ اس میدان میں مقامی علما زبان کی طرف سے شعوری سطح پر کوئی کاوش نہیں کی گئی تھی۔ مغل
بادشاہ اورنگ زیب عالم گیر کے زمانے کے ایک بزرگ ملا عبدالواسع ہانسوی نے اپنے
شاگردوں کی تدریسی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے فارسی زبان میں اردو لغت مرتب کی جو
اپنی نوعیت کی واحد کتاب بن کر سامنے آئی تھی۔ ''غرائب اللغات'' کے نام سے لکھی گئی یہ
لغت اردو زبان کی پہلی باقاعدہ لغت جانی جاتی ہے۔ اس سے قبل باضابطہ اور باقاعدہ لغت کی
کوئی کتاب نہیں ملتی۔ ایک منظوم لغت ''خالق باری'' کو جسے امیر خسرو سے منسوب کر کے
اوّلیت دی جاتی ہے اسے مکمل لغت تسلیم نہیں کیا جا سکتا، دوسرا اس کے مصنف اور زمانۂ تالیف
کے بارے میں بھی محققین نے خاصا اختلاف پایا جاتا ہے۔ چناں چہ ''غرائب اللغات'' کو ہی

پہلی لغت سمجھا جاتا ہے، غرائب اللغات سے قبل مختلف نصاب ناموں کے طور پر چیدہ چیدہ رسائل اس روایت کا حصہ بنتے ہیں۔ ان کو اردو لغات کے ابتدائی کے ابتدائی نمونے تو کہا جا سکتا ہے، لیکن با قاعدہ لغت کا درجہ نہیں دیا جا سکتا اس سلسلے میں یہ بات پیش نظر رہے کہ یہ نصاب نامے فارسی زبان میں ہی لکھے جاتے تھے جو اس عہد کی سرکاری زبان کے طور پر رائج تھی۔ ان نصاب ناموں میں خالق باری، رازق باری، حامد باری، ایزد باری، واحد باری، صمد باری اور قادر نامہ کے نام ملتے ہیں ان کو اگرچہ لغت تسلیم نہیں کیا جاتا، البتہ ان میں لغت کی ابتدائی نمونے تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ ان نصاب ناموں کا رواج ہندوستان میں اس لیے تھا کہ ہندوستانی بچوں کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ عربی فارسی زبان کو اپنی مادری زبان ہندوی کے ذریعے سیکھیں اس مقصد کے لیے نصاب ناموں کو مرتب کیا جاتا تھا ان کتب کا ایک فائدہ یہ تھا کہ بچہ اپنی مادری زبان کے ذریعے عربی فارسی الفاظ ذہن نشین کر لیتا تھا۔

ملا عبدالواسع ہانسوی کی ''غرائب اللغات'' کو کسی مقامی ادیب کی طرف سے لکھی جانے والی پہلی لغت تسلیم کیا جاتا ہے۔[۴] غرائب الغات او پر مذکور نصاب ناموں کی ارتقائی صورت تھی جو لغت کے مرتبے پر پہنچی۔ اس لغت کی سب سے پہلے خوبی وہ اوّلیت تھی جو اس کے مولف کو نصیب ہوئی۔ طالب علم کی ضروریات کے لیے یہ لغت اس دور میں ایک بہتر اضافہ ثابت ہوئی۔ جس طرح کسی بھی نئی شروع ہونے والی صنف یا روایت میں سقم موجود ہوتے ہیں یہ کتاب ان سے مبرّا نہیں تھی۔ جن پر آگے چل کر خان آرزو نے نہ صرف تنقیدی نظر کی بلکہ ان کی تصحیح بھی کی۔ یہ کتاب اردو فاسی زبانوں کے الفاظ و مترادفات کی تفہیم کے لیے لکھی گئی۔ یہ لغت طالب علم کی سہولت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے لکھی گئی تھی، اس لیے اس کو آج کے لغت نویسی کے معیارات پر نہیں پرکھا جانا چاہیے۔ ملا عبدالواسع ہانسوی عالم گیری عہد کے عالم تھے۔ اسے اردو کی پہلی با قاعدہ اردو، فارسی لغت کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ رام بابو سکسینہ اس بارے میں لکھتے ہیں:

> قریب قریب عالم گیر کے زمانے میں اہل ہندوستان کو اردو لغات کی ترتیب و تدوین کا خیال پیدا ہوا۔ ملا عبدالواسع ہانسوی نے (جن کی قواعد فارسی اور

گلستان و بوستان کی شرحیں نہایت مشہور ہیں) عالم گیر کے زمانے میں اردو،
ہندی الفاظ کی یک لغت مدون کی اور اس کا نام غرائب اللغات رکھا۔ اردو
الفاظ کے معنے فارسی میں لکھے۔ ایک عرصے بعد سراج الدین علی خان آرزو نے
اس کی نظرثانی کی۔ بہت سے الفاظ اور معنی میں اضافے کیے۔ غلطیاں درست
کہیں اور اسے ''نوادر الالفاظ'' کے نام سے موسوم کیا۔ (۵)

اس لغت کو جدید معیارات پر کھتے ہوئے ناقدین بہت معیاری لغت تسلیم نہ بھی کریں، لیکن ایک بات بہر حال یاد رکھنی چاہیے کہ اس کے مولف کے سامنے لغت نویسی کا کوئی پیکر یا اصول موجود نہیں تھے جس کی وجہ سے ان کی اس تالیف کو عہدِ حاضر کے کڑے معیارات پر پرکھنا مناسب نہیں۔ ملا ہانسوی کے پیش نظر دراصل درمیانے اور عام ذہن کے درمیانے طالب علم تھے جن کی تدریسی ضروریات پوری کرنے کے لیے یہ لُغت لکھی گئی۔ لیکن یہ بات ان کی محنت کی دلیل ہے کہ اس لغت کے لیے انھوں نے کافی فارسی لغات کی ورق گردانی کی ہے۔ ملا عبدالواسع ہانسوی کے حالات زندگی محفوظ نہیں کیے جا سکے۔ ان کے بارے میں صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ وہ ہریانہ کے رہنے والے تھے اور اورنگ زیب عالم گیر کے زمانے میں فارسی کے استاد اور فارسی کتب لکھنے کے حوالے مشہور تھے۔ ملا ہانسوی اپنی فارسی تصنیفات کے حوالے سے علمی حلقوں میں مشہور تھے لیکن ان کے بارے میں تذکروں میں کوئی مواد نہیں ملتا جو ان کی تصنیفی کاوشوں سے بہرہ ور کر سکے ان کی لغت اور اس کا دیباچہ ہی ہمارے پاس وہ ذریعہ ہے جس سے ہم ان کی اس کاوش کو جان سکتے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے ''نوادر الفاظ'' (خان آرزو) کو مرتب کر کے اس میں غرائب اللغات کا حصہ بھی شامل کیا ہے اور ۱۹۹۱ء میں اسے شائع کروایا تھا۔ ان کی تحقیق اس کتاب کے مقدمے کے طور پر شامل ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ ملا عبدالواسع ہانسوی نے ایک رسالہ ''رسالہ در قواعد فارسی'' بھی تدریسی مقاصد کے لیے مرتب کیا تھا۔ اس کے علاوہ ''یوسف زلیخا'' کی ایک شرح بھی لکھی تھی۔ جس میں مدرسانہ انداز غالب ہے۔ تنقیدی حوالے سے یہ زیادا اہم کتاب نہیں ہے۔ لغت کی ذیل میں یہ بات خاص اہمیت کی حامل ہے کہ ان کے پیش نظر صرف ان کے وہ شاگرد ہی تھے جن کے لیے

مشکل الفاظ کے معنی کو انھوں نے آسان کر کے اپنے رسالہ ''صمد باری یا پہچان یا غرائب اللغات'' کا حصہ بنایا تھا۔ وہ اس کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ہر چند ایں ہیچ مدان را لیاقت ترتیب و قابلیت تالیف نبود لیکن کثرت الحاح جمع کثیر اصحاب و فرط اک طرح جم غفیر اولی الالباب باعث براں شد کہ اسماء غیر مشہورہ و اشیا موفورہ و الفاظ غیر مانوسہ معانی بین الانام مذکورہ را بہ عبارات واضحہ و اشارات لائحہ بیان نماید تا فائدہ آں عام و نفع آں تام باشد۔(۶)

مصنف کے اس بیان کی روشنی میں لغت کے مقاصد کو بہ خوبی سمجھا جا سکتا ہے کہ گو ان کے ہاں اس ضمن میں لغت نگاری کے اصولوں سے اغماض ملتا ہے اور ترتیب بھی ڈھیلی ڈھالی نظر آتی ہے، لیکن یہ امر بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ تدریسی مقاصد (Pedagogy) کے لیے تحریر کی گئی یہ لغت چوں کہ کسی روایت کی پیروی کرتے ہوئے نہیں لکھی گئی تھی اس لیے جدید دور کے ان اصولوں کا اس لغت پر اطلاق قرینِ انصاف نہیں۔ مصنف کو اس لغت کے معیاری ہونے کا زعم بھی نہیں ہے۔ اس لغت کو لغت نویسی کے میدان میں اوّلیت کا حامل ہونے کی وجہ سے اہم مقام دیا جاتا ہے۔ درج بالا پیرا گراف مصنف کے انکسارانہ اعتراف صداقت پر مبنی ہے جسے پیشہ وارانہ دیانت داری کے تحت اہمیت دی جانی ضروری ہے۔ غرائب اللغات لغت نویسی کے سلسلے کا مطلعِ اوّل ہے جس کی بنیاد پر ''نوادر الالفاظ'' جیسی اہم لغت ترتیب دی گئی اور خان آرزو کو ماہر لسانیات کے طور پر متعارف کرانے کا سبب بنی۔ ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

> اردو میں لغت نگاری کی تاریخ کے سلسلے میں غرائب کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں خصوصاً تقدم زبانی کی وجہ سے اس کو جو اہمیت حاصل ہوگئی ہے، اس کو کسی طرح گھٹایا نہیں جا سکتا۔ درحقیقت ہانسوی کی اس کتاب میں وہ سب خصوصیتیں موجود ہیں جو کسی فن کے موسس اور ابتدا کرنے والے شخص کی تصنیف میں ہوا کرتی ہیں۔ ایسی کوششیں اس لحاظ سے بڑی قابل قدر ہوتی ہیں کہ وہ بعد میں آنے والوں کو راستہ دکھاتی ہیں۔ بہ ایں ہمہ تحقیق و صحت کے اعتبار سے غرائب

کو بلند پایہ تصنیف نہیں کہا جا سکتا۔ اس کی تشریحیں مختصر اور بعض اوقات بے حد تشنہ ہوتی ہیں۔ بلکہ بیشتر عربی یا فارسی مرادفات تک محدود ہیں۔ (۷)

عبدالواسع ہانسوی کی یہ کاوش بتاتی ہے کہ اس عہد میں گو عوامی بول چال کے لیے فرہنگوں یا ڈکشنریوں کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی تھی لیکن طالب علم کو عوامی سطح سے بلند کرنے اور بلند خیال کرتے ہوئے اس کی تدریس زبان کے لیے لغات لکھی جا رہی تھیں۔ آنے والے عہد میں مستشرقین نے اسی انداز کی لغات لکھیں جن کا مقصد نئے سیکھنے والوں کے لیے معنی بتانا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اُن کے پاس لغات کی پوری روایت موجود تھی، لیکن مشرق میں ابھی اس طرف توجہ نہیں دی گئی تھی۔

۲۔ ''نوادرالالفاظ'' از سراج الدین علی خان آرزو:

سراج الدین علی خان آرزو (وفات ۱۷۵۶) اٹھارھویں صدی میں لسانیات کا شعور رکھنے والے ادیب گزرے ہیں۔ شاعری میں ان کی حیثیت سے قطع نظر، زبان ولسانیات کے حوالے سے ان کی شعوری کاوشیں ''نوادر الالفاظ''، ''سراج اللغات'' اور ''مثمر'' کی صورت میں منظر عام پر آئیں۔ خان آرزو کے عہد میں ابھی اردو زبان ہندوستانی اور دوسری مقامی زبانوں پر تحقیقی کام کی ابتدا نہیں ہوئی تھی۔ خان آرزو اردو کے وہ پہلے عالم ہیں جنھوں نے پہلی مرتبہ لسانی تنقید کے میدان میں عملی طور پر لکھنے لکھانے کے کام کا آغاز کیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے ملا عبدالواسع ہانسوی کی ''غرائب اللغات'' کا عمیق مطالعہ کیا۔ اس کتاب میں موجود تسامحات کو دور کر کے تصحیح کی، لغت کو نئے سرے سے ترتیب دیا اور ''نوادرالالفاظ'' کے نام سے مرتب کیا۔ نوادرالالفاظ میں اردو الفاظ اور ان سے متعلق تلفظ اور مترادفات کی صحت و درستی کے معیارات کو بروئے کار لا کر نہ صرف غرائب اللغات میں موجود خامیوں کی نشان دہی کی بلکہ ان کو درست کر کے ایک اہم لغت کے طور پر محفوظ کر دیا۔

خان آرزو کی ایک شہرت بہ طور شاعر کے بھی تاریخ میں حوالے کے طور پر موجود ہے لیکن اردو شاعری کے میدان میں ان کا بہت زیادہ کام دکھائی نہیں دیتا۔ انھوں نے البتہ اردو

زبان کے مختلف گوشوں پر کام کیا جو لسانی میدان میں اوّلیت کا حامل ہے۔ اس لغت کی ترتیب نو سے خان آرزو کے اردو زبان کے معیار و استناد کے بارے میں نظریات کا اندازہ بھی ہوتا ہے کہ وہ ہریانے کے ملے جلے عوامی تلفظ اور جہلاء کی زبان کو لغت میں شامل کیے جانے پر غرائب کو غیر معیاری سمجھتے تھے اور مزید کہ انھوں نے اس قصباتی زبان (ہریانے کی) کے مقابلے میں دہلی کے اشرافیہ کی اردو زبان دانی کو فصاحت کا معیار مانتے ہوئے نوادرالالفاظ میں اس کے مطابق الفاظ و تلفظ کو پیش کیا۔ ان کے لسانی نظریات کے بارے میں سید عبداللہ لکھتے ہیں،

> میر عبدالواسع نے جہلا اور عوام کی زبان اور الفاظ کو مستند اور صحیح قرار دے کر غرائب میں شامل کر لیا ہے مگر آرزو نے اگرچہ ایسے الفاظ کو نقل کیا مگر ان کے نزدیک عوام کے محاورہ اور جہال کے الفاظ کو صحیح اور فصیح الفاظ کے طور پر پیش کرنا درست نہیں۔ اس پر انھوں نے میر عبدالواسع پر کڑی نکتہ چینی کی ہے... دہلی کے عوام ایک مخلوط قسم کی زبان بولتے تھے جس کو بانگڑو کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس میں ہریانی الفاظ اور قصباتی محاورے کی خاص آمیزش تھی۔ خان آرزو نے اصلاح زبان کے سلسلے میں سب سے پہلے انھی الفاظ کی فصاحت اور عدم فصاحت کی طرف توجہ کی... اردو کے ابتدائی لہجہ و تلفظ کو معین کرنے اور ٹکسالی اردو کو مشتہر کرنے میں انھوں نے ایک موسس اور واضع اوّل کا کام کیا۔ (۸)

خان آرزو نے عبدالواسع ہانسوی کی لغت کو غیر معیاری سمجھتے ہوئے اس کو نئے سرے سے لکھنا شروع کیا۔ ''نوادرالالفاظ'' دراصل ''غرائب اللغات'' کی ہی ایک پختہ و ترقی یافتہ صورت ہے۔ نوادرالالفاظ میں آرزو نے الفاظ کی تشریحات و مترادفات کا بغور مطالعہ کیا اور ہانسوی سے مترادف لکھتے وقت (عربی فارسی کے) جو تسامحات ہوئے تھے ان کو درست کر کے لکھا۔ اس کے علاوہ اس لغت میں عربی و فارسی الفاظ کی املاء، تلفظ اور صحت پر جو سوالیہ نشان تھے ان کو صحیح کر کے، پیش کیا۔ نوادرالالفاظ کے مقدمے میں ڈاکٹر سیّد عبداللہ نے کہا کہ

آرزو نے غرائب اللغات کے تمام الفاظ کو نوادر میں لے لیا۔ ان پر اعتراضات بھی کیے اور ان کی صحت اور تلفظ وغیرہ کے مسائل کو حل کر کے پیش کیا۔

خان آرزو کا لسانی کارنامہ دراصل اس لسانی تحقیق کا آغاز تھا جو اس سے قبل اردو طبقے کے ہاں موجود نہیں تھی۔ ہندوستانی فلالوجی کے ضمن میں مغربی افراد کا کام تو ہمیں ملتا ہے لیکن مشرقی علمائے لسانیات میں خان آرزو اس کو شروع کرنے والے پہلے مشرقی ماہر زبان کا درجہ حاصل کیا۔ انھوں نے ہندوستانی زبانوں اور فارسی عربی میں توافق پر لسانی تحقیق کا آغاز کیا۔ ہندی، فارسی اور سنسکرت زبانوں میں مشترک الفاظ اور ان میں تلفظ کے تغیرات کا تفصیلی بیان ان کے ہاں ملتا ہے۔ ان سے یہ تسامح بھی ہوا کہ عربی زبان کے الفاظ کے توافق کو بھی ہندی، سنسکرت وغیرہ سے منسلک کر کے دیکھتے رہے لیکن اس سلسلے میں اعتراض کی بجائے یہ امر ملحوظ رہنا چاہیے کہ انھوں نے کہیں سے بھی لسانیات کی باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ ان کے بعد بنگال میں ولیم جونز نے تقابلی لسانیات کا آغاز کیا تو اس سے قبل خان آرزو کی تقابلی تحقیق کو بھی تقابلی لسانیات کے اوّلین نمونے کے طور پر دیکھا جانا چاہیے۔ نتائج جو بھی ہوں، آرزو کی لسانی تحقیق کو ہندوستان کی مقامی زبانوں کے تقابل کے باعث تقابلی لسانیات کا باب اوّل سمجھے جانے کی ضرورت ہے۔ مشرقی روایت کے اس حصے میں ہم دیکھتے ہیں کہ یہ بنیادی اور پرائمری سطح کی کاوشیں لغت نویسی کے میدان کا احاطہ تو کر رہی تھیں، لیکن ابھی کسی مشرقی ماہر زبان نے اردو (ہندوستانی) کی گریمر مرتب کرنے کی طرف توجہ نہ دی تھی۔

حوالہ جات اور حواشی

۱۔ محی الدین قادری زور، ہندوستانی لسانیات (لاہور، مکتبہ معین الادب، ۱۹۶۱، طبع سوم) ص ۴۶-۱۴۵

۲۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو جلد دوم، (لاہور، مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۷، اشاعت پنجم) ص ۱۶-۱۵

۳۔ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی، جامع القواعد (حصہ صرف) (لاہور، اردو سائنس بورڈ، ۲۰۰۴ء، طبع دوم) ص ۲۵

۴۔ مسعود ہاشمی، ڈاکٹر، اردو لغت کا تنقیدی جائزہ (نئی دہلی؛ ترقی اردو بیورو، ۲۰۰۰ء،) ص ۵۳

۵۔ رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو، مترجمہ حسن عسکری (لکھنو؛ مطبع منشی نول کشور، س۔ن) ص ۸۲-۸۱

۶۔ عبدالواسع ہانسوی، ملا، مشمولہ: مقدمہ نوادر الالفاظ از ڈاکٹر سید عبداللہ، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۵۱ء، ص ۴

۷۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، مقدمہ نوادر الالفاظ ص ۵

۸۔ ایضاً۔ ص ۲۸-۱۸

1.4

اصلاحِ زبان، شاہ حاتم سے ناسخ تک

ا۔ دیوان زادہ اور اصلاح زبان کا عمل:

شیخ ظہور الدین شاہ حاتم اٹھارھویں صدی کے ربع اوّل کے اہم شاعر تھے۔ ولی دکنی کا دیوان دہلی پہنچا تو دہلوی شعرا کی وہ جماعت جس نے ولی کے ریختہ کے تتبع میں اردو شاعری کا آغاز کیا ان میں شاہ حاتم ایک بڑا نام ہے۔ وہ دلی دکنی کی اردو غزل کے ایسے اسیر ہوئے کہ اردو ریختہ گوئی شروع کی۔ اس عہد کے مذاق کے مطابق ایہام گوئی کے مضامین کو اپنی شاعری میں برتا۔ جب ایہام گوئی کا شعلہ بھسم ہوا اور اردو کی شعری روایت حبسیہ ماحول کا شکار ہوئی تو شاہ حاتم نے ایہام گوئی جیسی ذہنی ورزش سے چھٹکارا حاصل کیا اور اس سلسلے کی تحریر کی گئی شاعری کو اپنے دیوان سے خارج کرنا شروع کیا۔ شاہ حاتم نے ایہام گوئی کے تجربے کی حامل اپنی شاعری کو اپنے دیوان سے نکال کر دیوان کا جامع انتخاب شائع کیا جس کو ''دیوان زادہ'' کا نام عطا کیا۔ ''دیوان زادہ'' سے خارج کیے گئے موضوعات کے مطالعے سے اس عہد کے شعری رجحانات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ شاہ حاتم کی لسانیات کے میدان میں

ایک اور عطا یہ تھی کہ انھوں نے ''دیوان زادہ'' کے دیباچے میں (فارسی زبان میں) اصلاح زبان کے سلسلے کے اصول وضع کر دیئے جن کی وجہ سے ان کے شاگردوں نے زبان کا وہ روپ اپنانا شروع کیا جو اس دور کے مروج ریختے سے ہٹ کر تھا۔ اس لسانی کاوش کے ساتھ ساتھ دوسرے مصلحین کی کاوشوں کا ذکر ضروری ہے تاکہ اصلاحِ زبان کے ضمن میں شاہ حاتم کی اہمیت واضح ہو سکے۔

شاہ حاتم کا دیوانِ قدیم کا نظر ثانی شدہ نسخہ، ''دیوان زادہ'' کی شکل میں سامنے آتا ہے اور اٹھارھویں صدی کے وسط تک کے عرصے کے لسانی رجحان کو واضح کرتا ہے۔ شاہ حاتم نے ایہام گوئی کے عروج کے دَور میں اپنی شاعری میں ایہام گوئی کی طرف خاص توجہ دینی شروع کی تھی اور اس ضمن میں دیوان قدیم شائع کیا۔ لیکن جب یہ تحریک بلبلے کی طرح پھٹی اور شاعری کی زبان میں اصلاح وتبدیلی کی لہریں چلنا شروع ہوئیں تو شاہ حاتم نے بھی صاف گوئی/سادہ گوئی کی راہ اپنائی، اور ایہام کا عنصر شاعری سے نکالنے کا فریضہ شروع کیا۔

ولی کے دیوان نے شمالی ہندوستان میں شعرا کو حوصلہ، جواز اور موقع فراہم کر دیا کہ وہ ریختہ، جسے ابھی شمال میں اس قابل نہ سمجھا جاتا تھا کہ اس میں کوئی شعر پارہ تخلیق کیا جا سکے، وہ اس قابل ہو گیا تھا کہ اس میں جاندار اور معیاری غزل کہی جا سکے۔ چناں چہ اس کے بعد شمالی ہند میں تلاشِ لفظِ تازہ کی تحریک، ایہام گوئی، صاف گوئی اور ردِعمل کی تحریکوں نے اردو زبان کے موجودہ روپ میں کافی تبدیلیاں پیدا کر دیں۔ اس عہد کے مسلم شعرا نے کثیر تعداد میں مقامی ہندی، دکنی الفاظ کو غیر معیاری اور غیر فصیح قرار دے کر شعری زبان سے ترک کیا، اصلاحِ زبانِ اردو کا یہ عمل ادبی حلقوں میں غیر معمولی طور پر محسوس کیا گیا۔ اردو شعرا نے اردو زبان کو فصیح و بلیغ بنانے کے لیے عربی و فارسی زبانوں سے الفاظ وتراکیب کو اخذ کر کے اردو زبان کا حصہ بنایا۔ اس ضمن میں نزاعی مباحث کسی ایسے محقق کے منتظر ہیں جو معروضی طور پر اصلاحِ زبان کے اس عمل کی تحقیقی جہات کو سامنے لا سکے۔

شاہ حاتم مرزا مظہر جان جاناں، خان آرزو، میر وسودا کے عہد تک واضح طور پر اردو زبان میں فرق دیکھا جا سکتا ہے جو ولی کی دکنی اردو سے بہت حد تک الگ ہے۔ اردو زبان

میں عربی فارسی الفاظ وتراکیب اور محاورے کو ترجمہ کر کے اور کہیں بالکل اسی حالت میں لے کر شامل کیا گیا۔ اس عہد میں اصلاح زبان کے سلسلے کی ان تبدیلیوں کو معروضی انداز سے دیکھے جانے کی ہنوز ضرورت موجود ہے۔ مرزا مظہر شاہ حاتم کے ہم عصر تھے اور اصلاحِ زبان کے عمل میں ان کی کاوشیں شامل ہیں۔

مرزا مظہر جانِ جاناں کے ہاں سب سے پہلے زبان کی اصلاح کا عمل نظر آتا ہے۔ اصلاح کا ایک پہلو طبعیت کا تصوف کی طرف مائل ہونا اور دوسرا پہلو مغلوں کے زوال (عجمی زوال) کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ مرزا مظہر اس زوال پر بڑے متفکر تھے۔ انعام اللہ خاں یقین کی صورت ایک ہونہار شاگرد میسر آیا جن کی ذہنی مناسبت اصلاح زبان کی طرف خاص طور پر تھی چناں چہ اصلاح زبان کا یہ فریضہ انؔ ادیبوں کی وجہ سے شاعری کا حصہ بنا اور ان کے شاگردوں کی تقلید کے باعث یہ عمل وقوع پذیر ہوا۔ خان آرزو اور مرزا مظہر جان جاناں کی کوششوں سے اردو زبان ''اصلاح زبان'' کے عمل سے گزری۔ اس دور میں ذومعنی الفاظ کی شاعری میں استعمال ایہام گوئی کے ادبی رجحانات کی سمت کا پتا دیتا تھا لیکن جب مرزا مظہر اور خان آرزو نے اپنی لسانی بصیرت شامل کی تو یہ عملی پہلو زبان کی اصلاح کا محرک بن گیا۔ مرزا مظہر کی ''مظہری تحریک'' اصلاح زبان کے اس رویے کا عملی ثبوت ہے۔ جن کی ذہنی مناسبت اصلاح زبان کی طرف خاص طور پر تھی چناں چہ اصلاح زبان کا یہ فریضہ ان ادیبوں کی وجہ سے شاعری کا حصہ بنا اور ان کے شاگردوں کی تقلید کے باعث اصلاح کا عمل وقوع پذیر ہوا۔ شاہ حاتم نے ان دو ادیبوں کے لسانی نظریات کو اپنا کر اپنے دیوان کی تصحیح کی اور لسانی منظر نامے میں اصلاح زبان کی ذیل میں معروف ہوئے۔

شاہ حاتم کے دور کی ابتدائی غزل اس ریختے میں لکھی جا رہی تھی جس کو کسی مکتبہ فکر سے معیاری ہونے کی سند نہیں ملی تھی، شاہ حاتم نے ریختہ کا ایک معیار مقرر کیا۔ دراصل اس دور کی ریختہ زبان میں ہندوستان کی مقامی زبانوں برج، کھڑی بولی، پنجابی، راجستھانی اور سنسکرت کے ساتھ عربی، فارسی زبانوں کے اختلاط سے ایک ملغوبہ زبان بنی ہوئی تھی جس کو بھاکھا زبان کہا جاتا تھا، شاہ حاتم کی لسانی خدمت یہ ہے کہ اس میں رائج الفاظ کی املا کی درستی سے لے کر

غیر فصیح الفاظ کے ترک سے اسے معیاری بنانے کا عملی کام انجام دیا۔ شاہ حاتم نے بہت سے مقامی ہندی الفاظ کو شاعری سے ترک کیا جس کی مختصر فہرست حسب ذیل ہے۔ ہندی الفاظ کی اس مختصر فہرست پر ایک نظر ڈالیے، جن کے ساتھ ہی وہ الفاظ بھی دیے گئے ہیں، جو ان کی بجائے رائج کیے گئے، نین = (آنکھ، چشم)۔ سجن = میاں، صنم۔ گال = رخسار۔ جگ = جہاں۔ سبھا = محفل۔ مکھ = منہ۔ درپن = آئینہ۔ رین = رات۔ سنسار = دنیا۔ پنڈا = بدن۔ سریجن = رب۔ سمرن = مالا پھیرنا۔۔۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ''دیوان زادہ'' کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

> دیون زادہ میں بعض ٹھیٹھ ہندی الفاظ اور تراکیب، تقریباً خارج ہو جاتے ہیں، لیکن بعض ہندی الفاظ باقی رہ جاتے ہیں۔۔۔ اصلاح زبان کی تحریک کا یہ مقصد نہیں تھا کہ ہندی عنصر کو اردو سے نکال کر ایک ادبی معیار قائم کیا جائے بلکہ اس کا مقصد یہ تھا کہ زبان سے ناہموار اور غیر شستہ عناصر کو نکال کر ایک ادبی معیار قائم کیا جائے اور اسی خاطر لسانِ عربی اور زبان فارسی سے بھی وہی الفاظ لیے جاتے تھے جو عام فہم اور خاص پسند تھے۔ (1)

شاہ حاتم کے پیشِ نظر اردو زبان سے ایسے الفاظ کو ترک کر کے نئے الفاظ شامل کرنا تھا جو کہ عوامی بول چال کے بگڑے ہوئے تلفظ کی ساتھ اردو زبان میں شامل ہو چکے تھے۔ اب یہ الفاظ محض ہندی، سنسکرت یا مقامی بولیوں کے ہی نہ تھے بلکہ عربی فارسی حروف بھی ان کی ٹکسال میں ایسے انداز سے ڈھل کر اردو زبان کا حصہ بنے کہ اس زبان کا ذخیرہ الفاظ بڑھنا شروع ہوا۔ عوامی بول چال کی زبان کو معیاری بنانے کی کوشش کی گئی۔ شاہ حاتم نے عوامی بول چال میں شامل ناگزیر الفاظ کو درجہ استناد بخش کر اپنے کلام میں استعمال کیا۔ نئے الفاظ کی شمولیت کے ساتھ ساتھ ان کی کوششوں سے ریختہ گوئی کو سادہ اور سلیس اسلوب ملا اور یہ وہی معیاری اسلوب تھا جو میر تقی میر کے ہاتھوں بلند مرتبے پر فائز ہوا۔ شاہ حاتم کے دور تک آتے آتے اردو زبان معیاری ہو گئی۔ اٹھارھویں صدی میں زبان کے اس معیاری روپ کو حاتم کے اوّل دور کی شاعری میں مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ جب کہ اردو زبان کے ارتقائی اسلوب کو

''دیوان زادہ'' کے شعری اسلوب میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ شاہ حاتم کے لسانی مطالعے کی بغیر اس صدی کے لسانی مزاج کو مکمل طور پر سمجھا نہیں جا سکتا۔ عبدالحق ''دیوان زادہ'' کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

> حاتم نے لسانی اکتساب و اجتہاد میں بڑی دور اندیشی کا ثبوت دیا۔۔۔زبان کی فطری ساخت اور تقاضوں کے تحت عربی و فارسی ذخیرہ الفاظ کو مزاجِ اردو کے مطابق تحلیل کیا گیا۔ حاتم کے کلام میں ہندی آب و رنگ زبان کی حد سے گزر کر لب و لہجے میں منتقل ہو گیا ہے یہ لب و لہجہ ہندی کا نہیں بلکہ خاص اردو کا اپنا لہجہ ہے۔۔۔اور اسی ترکیب سے اردو کی بنیاد قائم کی گئی۔ شاہ حاتم کے ہاں ہندی پن اردو کی گھلاوٹ میں نرمی و لطافت کا حسن پیدا کرتا ہے۔ یہ الفاظ اجنبی محسوس نہیں ہوتے نہ زبان و بیان کی ناہمواری اور پیوندکاری کا شائبہ ہوتا ہے۔(۲)

شاہ حاتم کا یہ عمل اس بات کا مظہر تھا کہ اردو زبان بہت جلد اس خلا کو پر کرنے کے لیے خاص اہمیت اختیار کر لے گی جو آنے والے عہد میں فارسی کے زوال کے نتیجے میں بنے گا۔ چناں چہ انھوں نے بدلتے وقت کی رفتار اور رُخ کو سمجھا اور زبان اردو کی اصلاح اور عملی نمونوں کی طرف توجہ دی۔ شاہ حاتم سے لے کر ناسخ کے عہد تک اردو زبان بہت سی تبدیلیوں سے گزری اور یہ تبدیلیاں کسی دبستان میں اصلاح سمجھی گئیں اور کہیں تخریب کا عمل محسوس کی گئیں، لیکن آج کے دَور میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس عہد میں جو تبدیلیاں فطری یا غیر فطری طور پر اردو زبان میں ہوئیں، زبان کا وہی نمونہ آج اکیسویں صدی میں پاکستان میں معیاری زبان کا درجہ پا چکا ہے۔ اردو ادب کی اوّلین تاریخ لکھنے والے رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں:

> اس دَور میں سنسکرت و بھاشا و قدیم دکنی الفاظ کا اخراج ہوا جو کہ میر و سودا کے زمانہ میں جاری رہا۔ شیخ ناسخ کے عہد تک جس کی تکمیل ہوئی۔ مورخین ان کو مصلحین زبان کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بہت سے بھونڈے

الفاظ خارج کر دیے گئے، مگر اس کے ساتھ ہی بھاشا کے بہت سے شیریں
خوب صورت اور خوش آہنگ الفاظ بھی نکال دیے گئے۔ عربی فارسی کے
مترادف قبول کیے گئے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ عربی فارسی الفاظ کی صحت کا
خیال ہونے لگا۔ شاہ حاتم نے اس طرف توجہ کی اور بہت سے الفاظ کی اصلاح
کی، جیسا کہ ان کے دیوان زادہ کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے۔'' (۳)

شاہ حاتم کی اصلاح زبان کے ضمن میں کی گئی کاوشوں کا اردو زبان کے تشکیلی دور سے گہرا تعلق ہے۔ زبان معیاری ادبی روپ جس میں ایہام گوئی کے غیر سنجیدہ اثرات کی وجہ سے بھی بہت سی غیر مانوس تراکیب اور کثیر معنی کے حامل مقامی الفاظ جو دہلی کے ٹکسالی اردو کے معیار سے متصادم تھے، غیر فصیح قرار دے کر زبان سے نکال باہر کیے گئے۔ دیوان زادہ معیاری اردو زبان بنانے کی طرف ایک بڑا عملی قدم تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اردو زبان کا معیار ''لب ولہجہ'' جس کی تکمیل ابراہیم ذوق، آتش، ناسخ اور غالب کے زمانے میں ہوئی تھی اس کا آغاز ایک صدی قبل شاہ حاتم کے دیوان زادہ سے ملتا ہے جو اصلاحِ زبان کے ضمن میں ان کی اہمیت کی دلیل ہے۔

شاہ حاتم ان اوّلین ادیبوں میں سے تھے، جنھوں نے نہ صرف 'دیوان زادہ، کے دیباچے میں اصلاح کے اصول و ضابطے مقرر کر کے لکھے بلکہ عملی اقدام کے تحت اپنی شعری تخلیقات کو قلم زد کر کے 'دیوان زادہ، کے روپ میں نئے تبدیلیوں کا نمونہ پیش کر دیا۔ غرض اس عہد سے آگے چل کر برصغیر میں مشرقی ادیبوں نے زبان کے روپ میں جو تبدیلیاں لانا شروع کیں، ان کی ابتدا شاہ حاتم نے دیوان زادہ کی صورت میں کی تھی۔ شاہ حاتم اور اس کے معاصرین کے عہد میں اردو زبان عہد ولی کی زبان سے زیادہ صاف ہوگئی تھی۔ لیکن ابھی تک اس میں ہندوی کی جھلک ملتی تھی۔ یعنی ابھی شاعری کی زبان سے ہندی پن مکمل طور پر ختم نہیں ہوا تھا۔ بلکہ ہندی پن آنے والے عہد میر سودا کے دَور کی عطا ہے جب اردو زبان کا مکمل ترقی یافتہ روپ سامنے آیا۔ گو اس میں بھی قدیم ہندی جھلکیاں موجود ہیں۔ مگر مجموعی سطح پر زبان کا مطالعہ کریں تو ایک بدلی ہوئی فضا اور مکمل طور پر تبدیل ہوئی اردو زبان ملتی ہے۔ اصلاً اس کو

اردوئے معلٰی کا دور قرار دیا جا سکتا ہے۔

اٹھارھویں صدی کے وسط کے قریب قریب نادر شاہ درانی (۱۷۳۹ء) اور احمد شاہ ابدالی (۱۷۵۶) کی افغانی فوجوں نے دہلی میں وہ تباہی مچائی کہ جس کی مثال تاریخ میں شائد ہی پیش کی جا سکے۔ سقوط دہلی سے ریاست اودھ میں لکھنؤ کا مرکز، علم و ادب کی سرپرستی کے لیے میدان میں آیا۔ لکھنؤ نے دہلی کے عوام و خواص کو ہجرت کرنے کی ترغیب دی اور یوں میر تقی میر و سودا، مصحفی، قائم چاند پوری، میر سوز، میر اثر، جرأت اور ان کے علاوہ بے شمار شعرا کی کھیپ عازمِ لکھنؤ ہوئی۔ میر سودا کے لکھنؤ آنے سے لکھنؤ میں شاعری کا ایک نیا دبستان کھلا، جس میں داخلی خارجیت، یا خارجی داخلیت سے ہوتے ہوتے ہوائے سخن خارجیت کی شاہراہ پر چل نکلی۔ لکھنؤ میں شعر و ادب سے قطع نظر زبان کی بات کی جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ لکھنؤ میں پُرتکلف و آراستہ پیراستہ زبان کو پسند کیا جاتا تھا۔ لکھنؤ کے شعرا بھی خیال سے زیادہ طرز ادا کو سنوارنے نکھارنے میں صلاحیتیں صرف کر دیتے۔ چناں چہ دلی جس کی فضا کو اپنی داخلیت اور زبان کی سادگی پر افتخار تھا لکھنؤ کے ادیبوں کے طنز و تشنیک کا شکار ہو گئی۔ اور آراستہ و پیراستہ اسلوب میں بدل گئی۔

میر تقی نے لکھنؤ میں آ کر اپنے دہلوی مزاج اور اسلوب سخن میں کوئی تبدیلی پسند نہ کی البتہ باقی شعرا پر لکھنوی رنگ چڑھتا گیا یا ہم کہہ سکتے ہیں، کہ مصحفی، سودا، قائم وغیرہ لکھنؤ آراستہ و پیراستہ اسلوب سے متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکے جو کہ عوامی بول چال کا نمائندہ اسلوب تھا۔ لکھنؤ میں اردو زبان و ادب دہلی سے آگے ارتقائی منازل طے کرتا چلا گیا۔ لکھنؤ کی محفل سخن دراصل مشرقی تمدن کی آخری جھلکیاں تھیں جسے بہت جلد مغربی عسکریت نے اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ لکھنؤ میں زبان کی تبدیلی کا ایک ''مظہر خان آرزو'' کا لکھنؤ میں ہونا بھی تھا۔ خان آرزو تو وہاں ۱۷۵۶ء میں فوت ہو گئے البتہ دہلی سے آئی ہوئی باقی شعرا کھیپ جس میں ممنون، جرات، مصحفی، میر، سودا، انشاء وغیرہ شامل تھے، موجود تھی۔ انشاء نے 'دریائے لطافت' میں جس شہر کی زبان کو دہلی کے فصیح زبان کے بعد فصاحت کا معیار قرار دیا تو وہ لکھنؤ کی زبان تھی۔

۲۔امام بخش ناسخ اور اصلاحِ زبان:

اصلاح زبان کا یہ عمل سودا کے عہد سے ہوتا ہوا امام بخش کے عہد تک پہنچا۔ ناسخ کے ہاتھوں اردو زبان کی اصلاح کے پیمانے اتنے سخت ہو گئے کہ یہ عمل غیر فطری بن گیا۔ امام بخش ناسخ (لکھنو) کے اصلاح کے عمل کو متشددانہ سمجھا گیا اور اردو زبان کو ان مقامی بھاشائی الفاظ سے ہاتھ دھونا پڑے جو فطری انداز سے اردو زبان میں رچ بس گئے تھے۔ یہ زبان لکھنو کے پرتکلف زبان کے آراستہ و پیراستہ روپ کو پیش کرتی ہے۔ بعض ناقدین نے اس کو منفی لسانی تحریک بھی کہا ہے۔ امام بخش ناسخ زبان کے معاملے میں اسم با مسمّٰی ثابت ہوئے اور زبان کو کڑے اصلاحی عمل سے ایسے گزارا کہ اس کی حمایت میں بہت کم اردو والے توصیفی کلمات ادا کرتے ہیں۔ ناسخ کے ہاتھوں اردو زبان سے وہ مقامی، پراکرتی، ہندی الفاظ بھی ترک کر دیئے گئے جو فطری انداز سے اس زبان کا حصہ بن چکے تھے۔ یہ زبان لکھنؤ کے پرتکلف، آراستہ و پرشکوہ اسلوب کی آئینہ دار ہے۔ اصلاح زبان کے لکھنوی دور سے یہ پتا چلتا ہے کہ اس عہد میں زبان میں عربی فارسی الفاظ و محاورات، تراکیب کا دخول بہت زیادہ ہو گیا تھا۔ ایسے بیش تر ہندی، پراکرتی الفاظ کو بہ یک جنبش قلم اردو سے نکال باہر کیا جائے کہ جن کی موجودگی سے زبان اردو کی خوب صورتی میں کوئی قدغن نہیں ٹھہرتی تھی بلکہ زبان کا دامن ان کی موجودگی میں زیادہ وسیع تھا۔ ان الفاظ کو نکالا جانا بہت ضروری نہ تھا۔ لکھنؤ کی عوامی بول چال پر نظر ڈالی جائے تو یہ بات انوکھی ہے کہ وہاں کے عوام جیسے مشکل عربی فارسی الفاظ و تراکیب اپنی روزانہ کی بات چیت میں استعمال کرتے تھے ویسے الفاظ ہندوستان کے باقی شہروں کے خواص بھی اپنی زبان میں استعمال نہیں کرتے تھے۔ ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> ولی نے جس اجتہاد کی ابتدا کی تھی، اس کا نقطہ انجام ناسخ ہے۔۔۔ ناسخ کی تحریر کا قبیح پہلو یہ ہے کہ مقامی پراکرتوں کے وہ الفاظ جو عرصے سے اردو زبان کا فطری حصہ بن چکے تھے، عمل تنسیخ کی زد میں آ گئے اور ان کی جگہ عربی فارسی کے مشکل، پیچیدہ اور ادق الفاظ کو شعوری طور پر اردو زبان میں شامل کر دیا

گیا۔ چناں چہ اردو جو اپنی سادگی، نرمی اور سلاست کی بنا پر عوام میں مقبولیت حاصل کر رہی تھی، مشکل گوئی کی راہ پر گامزن ہو گئی۔ اس لحاظ سے بیش تر ناقدین نے ناسخ کی اس تحریک کو منفی لسانی تحریک شمار کیا ہے اور اس عہد کی شاعری کو لفاظی کا کھوکھلا انبار کہا ہے۔ (۴)

ان شاء اللہ خان انشاء لکھنؤ کے اس ماحول میں منفرد ادیب کی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔ انشاء نے 'دریائے لطافت، کے عنوان سے اردو زبان کی پہلی گریمر لکھی، جو کسی بھی مشرقی ادیب کی اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہے لیکن یہ کتاب انیسویں صدی میں لکھی گئی تھی۔ قواعد سے ہٹ کر دیکھیں تو انشاء نے ''رانی کیتکی کی کہانی'' کے عنوان سے ایک داستان لکھی، جس میں کوشش کی کہ ایک لفظ بھی عربی فارسی کا داخل نہ ہو۔ اس کاوش میں وہ بڑی حد تک کام یاب بھی رہے۔ لکھنؤ کے عہد کی لسانی و اصلاحی کوششوں کا ذکر مختصر کرتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں اس عہد نے اردو زبان کو کچھ نئے شیڈز عطا کیے اور ارتقائے زبان میں اپنا حصہ شامل کیا۔ اسی عہد میں دہلی میں ''عجائب القصص'' کے عنوان سے لکھی گئی داستان پر لسانی تحقیق کی جانی چاہیے۔ یہ داستان شاہ عالم ثانی کی تخلیق تھی جو مغلیہ سلطنت کا حکمران گزرا ہے۔

حواشی و حوالہ جات:

۱۔ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، (مرتب) دیوان زادہ (لاہور، مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۹ء) ص ۲۸-۲۷

۲۔ عبدالحق، (مرتب) دیوان زادہ، (نئی دہلی، نیشنل مشن فار مینسکرپٹس، ۲۰۱۱ء) ص ۵۶

۳۔ رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو، مرزا محمد عسکری (مترجم) (لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء) ص ۸۵-۸۴

۴۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں (کراچی، انجمن ترقی اردو، ۲۰۱۳ء، ایڈیشن ہشتم) ص ۲۱۱

1.5

لسانیاتی تنقید کی خشت اوّل

ڈاکٹر محی الدین قادری کے لسانیاتی افکار:

اردو زبان دنیا کی منفرد زبانوں میں سے ایک ہے جس کی ابتدا اور تشکیل کے بارے میں نزاعی مباحث تا حال جاری ہیں۔ تاریخی تناظر میں دیکھا جائے تو مطالعے میں آتا ہے کہ اس زبان کی تشکیل پذیری، دوسری مقامی زبانوں سے صوتی، صرفی اور نحوی مماثلتوں اور لسانی اشتراکات نے اس کو ہندوستان کے ہر اہم علاقے کی مقامی زبان بنا دیا تھا، جس کی وجہ سے ماہرین السنہ ابہام کا شکار رہے ہیں۔ اردو میں تاریخی لسانیات (Historical Linguistics) پر تحقیق بہت پرانی نہیں۔ سب سے پہلے ڈاکٹر جان گل کرسٹ کے ہاں اس زبان کے آغاز کے بارے میں سنجیدہ نقطۂ نظر دیکھنے میں آیا۔ انھوں نے اپنی کتاب "A Dictionary, English & Hindoostanee" (۱۷۸۶ء) کے دیباچے میں یہ دعویٰ کیا تھا کہ اردو زبان کے آغاز کا بڑا اہم تعلق برج بھاشا سے بنتا ہے۔[1] اس کے بعد ماہرین السنہ نے اس طرف غور و فکر شروع کیا اور مزید نزاعی مباحث تاریخی لسانیات کی تاریخ کا حصہ

بنتے چلے گئے۔ اس زبان پر لسانی تحقیق کو ہم دو گروہوں میں تقسیم کر سکتے ہیں ان میں ایک گروہ ادیبوں کا ہے جن کا تحقیقی میدان لسانیات نہیں تھا لیکن انھوں نے اپنے عہد کے حساب سے اہم لسانی آرا پیش کیں جن کی اہمیت لسانی سے زیادہ تاریخی ہے۔ ان افراد میں میر امن، امام بخش صہبائی، سر سید احمد خان، مولانا محمد حسین آزاد، نصیر الدین ہاشمی، سید سلیمان ندوی اور حافظ محمود شیرانی جیسے ماہرین زبان کا نام شامل کیا جا سکتا ہے۔ دوسرا گروہ ان ماہرین کا ہے جنھوں نے ۱۹۳۰ء کی دہائی میں اور اس کے بعد یورپ کے مختلف ممالک میں لسانیات پر ڈاکٹریٹ سطح کی تعلیم و تحقیق کی طرف عملی قدم بڑھایا اور تاریخی لسانیات میں اہم اضافے کیے۔ ان افراد میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ڈاکٹر مسعود حسین خان، ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر سہیل بخاری اہم نام ہیں۔

سر جارج گریرسن نے بیسویں صدی کے شروع میں ہندوستان کی مختلف بولیوں (Dialects) اور زبانوں (Languages) کے لسانی سروے کو اپنی شہرہ آفاق کتاب (سیریز) "A Linguistic Survey of India" میں ہندوستانی زبانوں پر بالعموم اور اردو (ہندی، ہندوستانی) پر بہ طور خاص اہم تحقیق کتاب کا حصہ بنائی۔ اس کی اہم بات وہ لسانی شجرہ ہے جس کے تحت اردو دنیا اس تحقیق سے آگاہ ہوئی کہ اردو/ ہندی/ ہندوستانی کے آغاز کا سرا، ۱۰۰۰ سال قبل کے زمانے سے جڑتا ہے جس کو زبانوں کا جدید ہند آریائی دور کہا جاتا ہے۔ محی الدین قادری زور کے لسانی افکار کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اسی لسانی ماڈل کے ساتھ ساتھ اپنے لسانی افکار کو واضح کرنے کی سعی کی، جو اس سے قبل گریرسن کے مذکورہ بالا لسانیاتی جائزہ ہند میں ملتے ہیں۔ گریرسن اور محی الدین قادری کے لسانی افکار میں یہ بات قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے کہ یہ دونوں ماہرین اردو زبان کو ہند آریائی زبان کے طور پر لیتے ہیں۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زور ایسے ماہر لسانیات کے طور پر اردو زبان کی تاریخ کا حصہ بنے جنھوں نے فرانس سے باقاعدہ ڈاکٹریٹ سطح کی تحقیق کی اور آریائی زبانوں کی تشکیل اور دیگر لسانی مباحث پر مقالہ تحریر کیا۔ ۱۹۳۰ء میں ان کی ایک اہم کتاب "Hindustani

منصۂ شہود پر آئی جس نے آریائی زبانوں کی لسانی جہات پر اہم اضافے
کیے۔ یہ کتاب انگریزی زبان پیرس یونیورسٹی ساربورن سے "Phonetics" میں شائع ہوئی۔(۲) اردو
لسانیات پر یہ کتاب اوّلین کتب میں شمار ہوتی ہے۔ اس میں ہندوستانی زبان کا صوتیاتی تجزیہ
کیا گیا ہے۔ ان کو اصل شہرت ان کی ایک مختصر مگر جامع کتاب بعنوان ''ہندوستانی
لسانیات'' سے ملی۔ یہ کتاب ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب سے ان کے لسانی افکار و
نظریات کو سمجھا جانا زیادہ سود مند ہے۔

''ہندوستانی لسانیات'' کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ پہلا حصہ زبان کی ماہیت،
آغاز اور تشکیل وغیرہ کے مباحث پر مشتمل ہے۔ اس حصے میں زبان کی اہمیت، ضرورت اور
اس کی تشکیل کے پس منظر میں کارفرما عناصر کے فطری ارتقاء پر ماہر لسانیات کی نظر سے روشنی
ڈالی گئی ہے۔ زبان وہ بنیادی عنصر ہے جس کے مطالعے کے بغیر لسانیات کے مباحث
ادھورے رہتے ہیں۔ زبان انسانی تاریخ کا ایسا بہترین اکتساب ہے جس پر انسانی تاریخ جتنا
افتخار کر سکے جائز ہے۔ دنیا کی پہلی یا کوئی بھی زبان اپنے آغاز سے متعلق سائنسی سے زیادہ
قیاسی نقطہ ہائے نظر کا شکار رہی ہے۔ لیکن اردو لسانیات کی تاریخ میں محی الدین قادری زور
ایسے ماہر لسانیات کے طور پر منظر عام پر آئے ہیں جنھوں نے زبان کو کوئی الہامی عطیہ سمجھنے کی
بجائے انسانی اکتساب کے نظریے کو قبول کیا ہے (جان ہرڈر نے یہ لسانی نظریہ پیش کیا تھا)۔
کتاب کے اس حصے میں زبان کی تشکیل کے دو بڑے محرکات پر بات کی گئی ہے۔ ایک محرک
زبان کا فطری ارتقاء ہے جس میں حروف تہجی کے اشتراکات و انسلاکات سے لے کر صوتی تغیر
و تبدل کے مدارج کو سمجھایا گیا ہے۔ زبان کی تشکیل کے دوسرے محرک میں ارادی تشکیل کے
عنوان سے مضمون قلم بند کیا گیا ہے۔ اس میں عوامی بول چال کے ساتھ ساتھ عالموں کی
کاوشوں کا بھی ذکر موجود ہے۔ جن کی روزمرہ اور عالمانہ گفتگو زبانوں کی تشکیل میں اہم معاون
کے طور پر موجود ہوتی ہے۔ تشکیلِ زبان کے عمل میں عالموں کا اہم کردار اصل میں اصطلاحات
وضع کرنا ہے۔ اس امر سے میں نہ صرف ذخیرہ الفاظ میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ زبان کا ڈھانچہ
معتبر ہوتا ہے۔ اس حصے میں زبان کے جملہ پہلوؤں پر بات کرنے لسانیات کی حدود فرائض

اور تعریف کی طرف اہم پیش رفت کتاب کا حصہ ہے۔

''ہندوستانی لسانیات'' کتاب کا حصہ دوم پانچ ابواب پر مشتمل ہے،جس کا مطالعہ ان کے لسانی افکار کو سمجھنے میں معاونت کرتا ہے۔ اس حصے کے مشمولات سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اس حصے میں باقاعدہ لسانیات کے طریقہ تحقیق وتنقید کے مطابق مباحث کی پیش کش کا تجزیہ کیا ہے۔ لسانیات جس سائنسی منہاج (Methodology) کے اوپر زبان کی تحقیق کا ڈھانچہ کھڑا کرتی ہے اس کے عین مطابق ان کی لسانی منہاج متشکل ہوئی ہے۔ لسانی مطالعے میں سب سے پہلے مفروضہ/فرضیہ لسانی محقق کے کام اور مواد کی اہمیت کو واضح کرتا ہے۔ پہلا باب ''ہندوستانی کا آغاز'' اسی مفروضے کی پہلی سیڑھی بنتا ہے۔ لسانی میدان میں پہلے سے موجود مختلف لسانی نقطہ ہائے نظر کا روایتی تعارف وتجزیہ ملتا ہے۔ ۱۹۳۰ء تک کی کی گئی لسانی تحقیق کو وہ چار اقسام میں تقسیم کرتے ہوئے نشان دہی کرتے ہیں کہ ہندوستانی زبان کی ساخت ارتقا اور آغاز کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے قدیم تذکروں کو بہ طور مطالعہ پیش نظر رکھا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں اہم بات یہ ہے کہ گو ان تذکروں میں باقاعدہ لسانی مواد شاید موجود نہ ہو لیکن ان تذکروں کی اہمیت یہ ہے کہ ان میں تذکرہ نگاروں نے مختلف ادوار اور علاقوں کی ہندوستانی زبان کے شعری نمونہ کو محفوظ کر دیا ہے۔ مثال کے طور پر اگر دکنی دور کا تجزیہ کیا جانا مقصود ہو تو ولی دکنی کے علاوہ اس کے عہد کے باقی دکنی شعرا کا کلام بہ طور نمونہ و تجزیہ انھیں تذکروں سے مل سکے گا۔

''ہندوستانی لسانیات'' تحریر کرنے سے پہلے قادری زور نے اس وقت تک ہونے والی لسانی تحقیقات کا نہ صرف بہ نظر عمیق مطالعہ کیا بلکہ ان پر سائنسی اندازِ تحقیق کے ساتھ لسانی مباحث کا آغاز کیا۔ جدید اردو لسانیات کی تاریخ میں اگر ان کو پہلا لسانیاتی نقاد کہا جائے تو یہ بے جا نہیں ہوگا۔ بیسویں صدی کے پہلے عشرے سے مختلف رسائل و جرائد میں اردو اور پنجاب سے متعلق مباحث کا آغاز ہو چکا تھا، لیکن باضابطہ طور پر کوئی ایسی کتاب سامنے نہیں آئی تھی جس سے اس لسانی تحقیق کو اعتبار کا درجہ ملتا چناں چہ ۱۹۲۳ء میں ''دکن میں اردو'' (نصیر الدین ہاشمی) شائع ہوئی۔ اس کتاب نے تاریخی لسانیات کی تحقیق کے میدان میں

خاصی اہمیت حاصل کی۔ محی الدین قادر زور نے اس کتاب میں پیش کیے گئے اس لسانی نظریے کو درست نہیں مانا کہ اردو دکن میں پیدا ہوئی ہے۔ ہاشمی کا خیال تھا کہ عرب اور جنوبی ہند کے علاقوں کے مابین تجارتی تعلقات نے اور دوسرے مرحلے پر شمال سے جنوبی ہند کی طرف مسلمانوں کی ہجرت نے اردو زبان کی تشکیل میں مرکزی کردار ادا کیا۔ اس ضمن میں قادری زور کا نقطہ نظر اس طرح سامنے آیا:

> بعض حضرات کا خیال یہ ہے کہ اس ہندو مسلمان میل جول کی وجہ سے ایک زبان بنی تھی جو موجودہ اردو کی ماں تھی... یہ خیال کچھ قابلِ لحاظ نہیں ہے کیوں کہ اردو ایک آریائی زبان ہے اور ان قدیم عرب مہاجرین میں سے اکثر نے ایک ایسی سرزمین کو اپنا وطن بنایا جہاں ڈراویڈی زبانیں بولی جاتی تھیں... ان میں سے بعض نے مہاراشٹر میں قیام کیا تو اس قسم کے میل جول کا نتیجہ ایک ایسی زبان ہوئی جو محض عربی اور مہاراشٹری عناصر پر مبنی ہوئی حالانکہ اردو زیادہ تر فارسی سے متاثر ہوئی ہے۔ نہ کہ عربی سے۔[۳]

مذکورہ بالا اقتباس میں قادری زور کے لسانی استدلال سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہندوستانی زبانوں مختلف لسانی خاندانوں میں ہونے کی بہ خوبی معلومات رکھتے تھے جب کہ نصیر الدین ہاشمی کے ہاں اس بات کا شعور موجود نہ تھا کہ جنوبی ہند کے خطے کی زبانوں کی کثیر تعداد دراوڑی خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ یہاں یہ امر توجہ طلب ہے کہ دو مختلف خاندان کی زبانوں کے اختلاط سے کبھی بھی تیسری زبان معرضِ وجود میں نہیں آسکتی۔ اور اردو کے معاملے میں تو یہ امر دلچسپی کا باعث ہے کہ یہ آریائی خاندان کی زبان ہے۔ سادہ الفاظ میں یہ بات یوں لکھی جاسکتی ہے کہ سامی خاندان کی زبان (عربی) اور دراوڑی خاندان کی زبانیں (کنڑا، تیلگو، ملیالم اور مہاراشٹری وغیرہ) اوّل تو اس حد تک ایک دوسرے میں ضم نہیں ہوسکتیں کہ کوئی تیسری زبان ان میں سے طلوع ہو۔ دوسرا یہ بات بھی ممکن العمل نہیں کہ تیسری بننے والی زبان کسی تیسرے خاندان (آریائی) سے تعلق رکھتی ہو۔ ۱۹۱۵ء کے قریب علامہ سلیمان ندوی نے اردو زبان کے آغاز، تشکیل اور ارتقاء پر اپنے لسانی افکار مختلف مضامین کی صورت میں

اجلاس میں پڑھنا شروع کیے جو بعد میں ۱۹۳۹ء میں کتابی شکل (نقوشِ سلیمانی) میں شائع ہوئے۔ چوں کہ لسانیات کے مردِ میدان نہیں تھے اس لیے اسی رستے پر چل نکلے جس کے تحت اردو زبان کے آغاز کا سہرا کسی علاقے کی نسبت سے طے کیا جاتا تھا۔ محمد بن قاسم کی سندھ میں آمد (۷۱۲ء) اور وہاں عربی و فارسی زبان بولنے والی آبادی کی موجودگی سے ان کو یہ گمان گزرا کہ اردو سندھ میں متشکل ہوئی۔ یہ خیال درست اس لیے بھی نہیں ہے کہ عربی فارسی اور سندھی کے دو تین صدیوں پر محیط لسانی اختلاط سے نئی زبان بننا بعید از امکان ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس عرصے میں قدیم سندھی زبان میں نئی بدیسی زبانوں کے الفاظ کی آمد سے سندھی زبان کے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ ہونا شروع ہوا ہوگا۔ اس زبان کو جدید سندھی تو کہا جانا چاہیے نہ کہ اردو۔(۴)

حافظ محمود شیرانی نے اپنی کتاب پنجاب میں اردو (۱۹۲۸ء میں مختلف تاریخی اور لسانی حوالوں سے یہ نقطہء نظر ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اردو زبان کی ابتدا خطہ پنجاب بالخصوص لاہور کے علاقے میں ہوئی۔ یہ نقطہء نظر مختلف حوالوں کے ساتھ اردو زبان کے اہم معاون مواد کے طور پر تو تسلیم کیا ہے لیکن مکمل طور پر اس نظریے کی صحت سے انکار کیا ہے۔ شیرانی کے نظریے پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اُن [محمود شیرانی] کے اہم لسانی دلائل جن کی بناء پر وہ اردو کو بہ نسبت برج بھاشا کے پنجابی سے زیادہ قریب اور مشترک قرار دیتے ہیں دو قسم کے ہیں۔ پہلی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پنجابی اور اردو دونوں ایک ہی اصول کے تحت لسانی اور نحوی ارتقا پاتے رہے ہیں۔ ان کی دوسری دلیل سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اردو میں چند اجزا ایسے ہیں جن کی توضیح صرف عصرِ حاضر کی پنجابی ہی کے مطالعہ اور اس پر غور و خوض کرنے سے ہو سکتی ہے۔ نیز یہ خصوصیتیں زیادہ تر لفظی حیثیتوں اور صوتی تغیرات سے متعلق ہیں۔ جو خصوصیتیں براہِ راست تعمیر زبان سے تعلق رکھتی ہیں، موجودہ اردو میں ان کا کوئی وجود نہیں۔ وہ صرف قدیم دکنی کارناموں میں نظر آتی ہیں۔(۵)

مذکورہ بالا اقتباس شیرانی کے نظریے پر قادری زور کے لسانی افکار کی چند جہات کو نمایاں کرتا ہے۔ اوّل یہ کہ قادری زور پنجابی کے ساتھ ساتھ برج بھاشا کو بھی قدیم اردو کی تشکیل میں شراکت دار خیال کرتے ہیں۔ اردو اور برج بھاشا کے تعلق کا اعادہ کرنا غیر معمولی بات ہے۔ یہاں یہ امر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ سب سے پہلے جان گل کرسٹ نے اپنی کتب میں اردو زبان کی تشکیل کا مضبوط تعلق برج بھاشا سے طے کیا تھا اور اس پر لسانی تحقیق کا ایک در وا کیا تھا۔ (راقم نے اپنے پی ایچ۔ ڈی کے مقالے میں بعنوان ''جان گل کرسٹ کی لسانی خدمات'' (۲۰۱۴ء) میں اس نکتہ پر تفصیلی بحث کی ہے)۔ شیرانی کے نقطۂ نظر سے اختلاف کرتے ہوئے ان کا لکھنا ہے کہ ان کے لسانی دلائل سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ اردو پنجابی سے مل کر بنی ہے کیوں کہ لفظی اور صوتی تغیرات زبان کے بیرونی مظاہر کی نشان دہی کرتے ہیں۔ اس پہلو کو ہم زبان کی آلاتی حیثیت (Instrumental) کا نام دے سکتے ہیں۔ آلاتی حیثیت سے زبان کا افادی پہلو سامنے آتا ہے۔ جب کہ زبان کی تشکیل کے تغیرات کا اندازہ اس کے اندرونی نظام (گریمر) سے لگایا جاتا ہے۔ یہی پہلو زبان کی تعمیر کا محرک بنتا ہے۔ قادری زور کا خیال ہے کہ یہ تعمیر و تشکیل کا پہلو قدیم دکنی زبان کے نمونے سے ملا کر دیکھا جانا چاہیے۔ عہد حاضر کی اردو میں یہ عنصر موجود نہیں ہے۔ اس اقتباس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ یہ ضروری نہیں کہ اگر صرف نحوی سطح پر اردو کی مماثلتیں پنجابی سے ثابت ہوں تو اس کی جنم بھومی پنجاب قرار دے دی جائے۔ اردو کی مماثلتوں کو قدیم دکنی نمونوں میں تلاش کیا جائے تو کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو دکن میں پیدا ہوئی ہے؟ اگر ''دکن میں اردو'' کی صحت سے انکار کیا جا سکتا ہے تو اس بنیاد پر ''پنجاب میں اردو'' پر سنجیدہ سوالیہ نشانات لگائے جا سکتے ہیں۔

اردو کے آغاز کے مباحث میں عرب و عجم کے علاقوں سے آنے والے فاتحین کی ہندوستان آمد اور حکمرانی سے تاریخی لسانیات کی ابتدائی تحقیقات مختلف مغالطوں اور مبالغوں کا شکار ہوئی۔ اس سلسلے میں فارسی اور مقامی زبان ہندی/ ہندوی کے باہمی اختلاط کو قیاسی انداز سے زیر بحث لا کر نظریہ سازی کر لی جاتی ہے جس کی وجہ سے آغازِ زبان کا مسئلہ ہنوز تنازعات

کا باعث ہے۔ قادری زور کا لسانی نظریات کا جائزہ لیا جائے تو علم میں آتا ہے کہ قادری زور نے اس کتاب میں ایک ایسے نکتے کی طرف اشارہ دے دیا تھا جس کی توضیح آگے چل کر ڈاکٹر مسعود حسین خان کے لسانی نظریات سے بہ خوبی ہوئی۔ ان کا درج ذیل اقتباس نہ صرف یہ کہ ان کو اوّلین لسانی محقق کا درجہ دینے کے لیے معاون ہے بلکہ آگے چل کر یہ مسعود حسین خان کے لسانی نظریات کی بنیاد بنتا ہے۔ قادری زور کا یہ استدلال غور طلب ہے:

> اردو کا سنگ بنیاد دراصل مسلمانوں کی فتح دہلی سے بہت پہلے ہی رکھا جا چکا تھا... اردو اس زبان سے متعلق ہے جو بالعموم نئے "ہند آریائی دور" میں اس حصۂ ملک میں بولی جاتی تھی جس کے ایک طرف عہد حاضر کا شمال مغربی سرحدی صوبہ ہے اور دوسری طرف الہ آباد۔ اگر یہ کہا جائے تو صحیح ہے کہ اردو اس زبان پر مبنی ہے جو پنجاب میں بارھویں صدی عیسوی میں بولی جاتی تھی۔ مگر اس سے تو یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اس زبان پر مبنی نہیں ہے جو اس وقت دہلی کے اطراف اور دوآبہ گنگ و جمنا میں بولی جاتی تھی۔ کیوں کہ ہند آریائی دور کے آغاز کے وقت پنجاب کی اور دہلی کے نواح کی زبانوں میں بہت کم فرق تھا۔[(۲)]

مذکورہ بالا نقطۂ نظر اس کتاب سے قبل ان کی انگریزی کتاب "ہندوستانی فونے ٹکس" میں پیش کیا گیا تھا جو انگریزی میں تھی۔ اس ایک اقتباس کی ادھوری خواندگی اور غیر واضح لسانی تفہیم نے اکثر اوقات نقادوں کو مخمصے میں ڈالے رکھا ہے۔ اس ایک اقتباس کی بدولت جو نظریہ اخذ کیا گیا ہے راقم کی لسانی تفہیم، اس کے بالکل برعکس نتائج اخذ کر رہی ہے۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ قادری زور نے اردو کے آغاز کے پنجاب سے متعلق نظریے کی توثیق کرتے ہوئے اس کے حق میں لسانی دلائل دیے ہیں۔ راقم اس نقطۂ نظر سے اتفاق نہیں کرتا۔ عصرِ حاضر کے نامور لسانی محقق اور نقاد، ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ اپنی کتاب اردو کی لسانی تشکیل میں اردو کے آغاز کے نظریات پر تبصرہ کرتے ہوئے اس مغالطے کا شکار ہوئے ان کے ان الفاظ سے ان کا نقطۂ نظر واضح ضرور ہوتا ہے لیکن راقم بہ صد احترام ان سے اختلاف رائے رکھتا

ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

ڈاکٹر سینتی کمار چڑجی (۱۸۹۰۔ ۱۹۷۷ء) کی تصنیف دی اوریجن اینڈ ڈیولپمنٹ آف دی بنگالی لنگویج (کلکتہ، ۱۹۲۶ء) شائع ہوئی جس کی جلد اوّل کے مقدمے میں انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ نواح دہلی کی موجودہ بولیوں کا تشخص مسلمانوں کے داخلۂ دہلی کے وقت تک نہیں ہوا تھا اور لاہور تا الہ آباد ایک ہی قسم کی زبان رائج تھی۔ بعد کو اس نقطۂ نظر کی تائید ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور (۱۹۰۵ء۔ ۱۹۶۲ء) نے بھی کی جنھوں نے اس علاقے کی توسیع الہ آباد تا شمال مغربی سرحدی صوبہ تک کر دی اور اردو کو اس زبان پر مبنی بتایا جو پنجاب میں بارہویں صدی عیسوی میں بولی جاتی تھی۔ (۷)

اس کا مطلب ہوا کہ بارہویں صدی عیسوی میں شمال مغربی سرحدی صوبہ (موجودہ خیبر پختونخواہ) سے الہ آباد تک ایک جیسی زبان موجود تھی۔ دوسرا یہ کہ اردو پنجاب میں بنی، پہلے نکتے کا جواب یہ ہے کہ ہند آریائی زبانوں کی تشکیل اور ارتقاء کے جدید دور کا آغاز کم و بیش بارہویں صدی سے سمجھا جاتا ہے۔ اب اس کا مطلب یہ ہے کہ بارہویں صدی کے آس پاس اس ایک ہزار میل کے محیط میں کسی ایک زبان کا بولے جانا ناممکن الوقوع معلوم نہیں ہوتا۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو اس عہد میں مختلف علاقوں میں مختلف اشکال میں موجود تھی جس کو ادب کی زبان میں ریختہ کہا جا سکتا ہے اور لسانیات کی زبان میں بولی (Dialect)۔

اوپر کی تمام بحث سے ابھی تک قادری زور کا لسانی نظریہ واضح نہیں ہوتا۔ یہ عجیب بات ہے کہ ابھی تک کی بحث میں سے کوئی واضح نقطۂ نظر اخذ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اتنی سی بحث سے لسانی محققین نے ان کا پورا لسانی نظریہ اخذ کر لیا۔ تحقیق کو آگے بڑھائیں تو پتا چلتا ہے کہ وہ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ موجودہ زمانے میں بتانا مشکل ہے کہ کس وقت پر پنجاب کی زبان اور نواح دہلی کی زبان میں فرق آنا شروع ہوا۔ آگے لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے دہلی پر قبضے کے بعد (۱۱۹۳ء) یہ فرق آہستہ آہستہ بڑھتا چلا گیا اور دونوں مقامات کی زبانیں پنجابی اور کھڑی بولی میں بنتی چلی گئیں۔ یہ امر غور طلب ہے کہ مسلم حملہ آور

پنجاب کے علاقوں سے لاہوری زبان بولتے آئے تھے۔ یہ زبان اپنی صوتیاتی ترکیب میں برج بھاشا سے زیادہ کھڑی بولی کے قریب تھی چناں چہ ان کو کھڑی بولی اختیار کرنا زیادہ سود مند نظر آیا ہو گا چناں چہ کھڑی بولی میں تیزی سے باہر سے آئی ہوئی زبانوں کے الفاظ شامل ہوتے گئے ہوں گے۔ ان کا لسانی نظریہ ان کے الفاظ سے واضح ہوتا ہے جو نہایت اہمیت کا حامل ہے وہ لکھتے ہیں:

> اردو نہ تو پنجابی سے مشتق ہے اور نہ کھڑی بولی سے۔ بلکہ اس زبان سے جو ان دونوں کی مشترک سرچشمہ تھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ بعض باتوں میں پنجابی سے مشابہہ ہے اور بعض میں کھڑی سے۔ لیکن مسلمانوں کے صدر مقام صدیوں تک دہلی اور آگرہ رہے ہیں۔ اس لیے اردو زیادہ تر کھڑی بولی ہی سے متاثر ہوتی گئی۔ (۸)

مذکورہ بالا اقتباس سے ہرگز یہ واضح نہیں ہوتا کہ قادری زور اردو زبان کے آغاز کا سرچشمہ پنجابی کو گردانتے ہیں۔ اس لیے سب سے پہلے تو یہ صراحت ضروری ہے کہ وہ اردو کے آغاز کو پنجاب سے منسلک کرتے ہیں تو اسی عہد میں اس کے ابتدائی آثار بھی کھڑی بولی سے بھی اتنے ہی گہرے بتاتے ہیں۔ اب یہاں پر یہ امر قابل توجہ ہے کہ پنجابی اور کھڑی بولی ایک ہی مشترک سرچشمے یعنی شورسینی اپ بھرنش سے طلوع ہوئی ہیں، اس لیے ان میں قواعدی مماثلتیں ملنا غیر معمولی بات نہیں البتہ یہ بات تسلیم نہیں کی جاسکتی کہ صرفی صوتی قواعدی سطح پر پنجابی زبان اور کھڑی بولی ایک جیسی زبانیں ہوں۔ اب قیاس اغلب ہونا چاہیے کہ اگر اردو پنجابی کی نسبت کھڑی بولی سے زیادہ ملتی جلتی ہے تو اس کے آغاز کے شواہد کو دہلی کی بولیوں میں ہی تلاش کرنا چاہیے۔ یہاں یہ امر بھی اہم ہے کہ پشاور کی اردو (ہندوستانی) اور الہ آباد کی ہندوستانی میں لامحالہ خاصا فرق ہونا چاہیے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ پشاور سے لے کر الہ آباد بنگال تک اردو یا ہندوستانی بغیر کسی فرق سے بولی جاتی ہو۔ اس بات کی لسانی دلیل یہ ہے کہ بارہویں صدی کے معلوم شعری ادب پاروں کے مختلف علاقائی نمونوں میں واضح فرق دیکھا جا سکتا ہے۔ لسانیاتی تنقید میں ان کی اوّلیت اور لسانی نظریے پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر سیدہ

جعفر کا یہ بیان خصوصی اہمیت کا حامل ہے بلکہ اس میں راقم کے مقالے کی تائید بھی ملتی ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

> ہندوستان کی آوازوں کے تجزیے کا کام پہلی مرتبہ ڈاکٹر زور کے ہاتھوں عمل میں آیا تھا اور اس کی اوّلیت کا سہرا انھیں کے سر ہے۔ ڈاکٹر زور نے زبان کے آغاز سے متعلق اپنا مخصوص نظریہ پیش کیا جس کی رو سے اردو، پنجابی اور کھڑی بولی کے ماخذ سے تشکیل پائی ہوئی بولی قرار دی گئی ہے اور ڈاکٹر زور بارہویں صدی سے قبل مغرب میں صوبہ سرحد سے لے کر مشرق میں الہ آباد تک کے علاقے کو اس کا زیر اثر تصور کرتے ہیں۔ اس نظریے سے اختلاف کی گنجائش بھی موجود ہے۔ (۹)

اب تک کی گئی لسانی تنقید کو چند سطور میں سمیٹا جائے تو یہ نتائج اخذ ہوتے ہیں کہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور پہلے لسانی نقاد ہیں جنھوں نے پہلی مرتبہ ہندوستانی صوتیات (اصوات) کا لسانی تجزیہ کر کے اردو میں اطلاقی لسانیات (Applied Linguistics) کی بنیاد ڈالی۔ انھوں نے اردو زبان کی لسانی تاریخ کا قیاسات کی بجائے سائنسی انداز سے مطالعہ اور تجزیہ کیا اور ایک غیر جانبدار ماہر لسانیات کے طور پر تاریخی لسانیات کا تجزیہ کیا۔ بیسوی صدی کی تیسری دہائی میں تاریخی لسانیات ابھی سائنسی میدان میں داخل نہ ہوئی تھی۔ محی الدین قادری زور اس حساب سے وہ پہلے ماہر لسانیات کے طور پر لسانی منظر نامے کا حصہ بنتے ہیں جنھوں نے سب سے پہلے لسانی تحقیق اور تنقید کا آغاز کیا۔ چوں کہ ان کا براہِ راست تعلق لسانیات کے شعبے سے تھا اس لیے ان کی لسانی تنقید میں ایک طرح کے ابہام یا الجھاؤ کی کیفیت ملتی ہے۔ راقم کا خیال ہے کہ قادری زور نے اپنے کام سے قبل کے لسانی تنقیدی سرمائے کے مسائل کو سامنے رکھتے ہوئے ان میں موجودہ خامیوں کو پُر کرنے کی کوشش کی ہے لیکن کسی نقطۂ نظر کو سراسر غلط نہیں کہا جو ان کے لسانی مزاج کا پتا دیتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ انھوں نے اردو زبان کے آغاز پر کوئی واضح نقطۂ نظر یا نظریہ دینے کی بھی کوشش نہیں کی۔ ہمارے لسانی نقادوں کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ ہر اہم ماہرین لسانیات کی تحقیقات سے کوئی واضح نظریہ نقطۂ نظر اخذ کرنے کی

کوشش کرتے ہیں۔ راقم قادری زور کے مطالعے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ ان کے لسانی نظریات کو سمجھنے کے لیے یہ طریقہ کار موزوں نہیں کہ ان سے بھی اردو کے آغاز وابتدا کے واضح لسانی نظریے کی توقع کی جائے۔ بلکہ ان کی اس اوّلیت کا اظہار کیا جانا چاہیے کہ اردو تاریخی لسانیات کی ذیل میں وہ پہلے لسانی نقاد ہیں جنھوں نے ایک سائنس دان کی طرح ۱۹۳۰ء سے قبل کی لسانیاتی تاریخ کا لسانی تجزیہ کر کے اس میں موجود مسائل کو نہ صرف واضح کیا بلکہ ان کی درست تفہیم کو ہندوستانی لسانیات کے صفحات پر رقم کیا۔ عصر حاضر میں جدید لسانیاتی تنقید پر ان کی فہم اور منہاض کا گہرا اثر دکھائی دیتا ہے۔

حوالہ جات اور حواشی:

۱۔ جان بورتھ وک گل کرسٹ نے اپنی لغت، (A Dictionary, English and Hindoostanee...,1786) میں ایک ضخیم مقدمہ تحریر کیا تھا، جس میں اردو (ہندوستانی) اور اس کی تاریخ پر نئے مباحث کا آغاز کیا۔ ان صفحات میں ان کی ان لسانی آراء کا جائزہ لیا جاسکتا ہے۔

۲۔ ضیاء الدین انصاری، ڈاکٹر، زور صاحب کی تصانیف کا تعارف، مشمولہ، محی الدین قادری زور، مرتبہ خلیق انجم، (نئی دلی، ثمر آفسیٹ پرنٹرز، ۱۹۸۹ء) ص ۱۷۴

۳۔ محی الدین قادری زر، سید، ڈاکٹر، ہندوستانی لسانیات، (لاہور، مکتبہ معین الادب، ۱۹۵۰ء، طبع ثانی) ص ۸۸

۴۔ ہندوستانی لسانیات، ص ۸۸

۵۔ ہندوستانی لسانیات، ص ۹۰۔۸۹

۶۔ ہندوستانی لسانیات، ص ۹۱۔۹۰

۷۔ خلیل احمد بیگ، ڈاکٹر، اردو کی لسانی تشکیل، (علی گڑھ؛ ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۰۰ء، طبع سوم) ص ۱۷۔۱۶

۸۔ ہندوستانی لسانیات، ص ۹۲۔۹۱

۹۔ سیدہ جعفر، پروفیسر، ڈاکٹر زور، ہندوستانی ادب کے معمار، (نئی دہلی؛ ساہتیہ اکادمی، ۱۹۹۰ء، اشاعت دوم) ص ۱۲۲

1.6

اُردو لغت نویسی کے اصول اور لوازمات: نظری مباحث

کسی بھی زبان کے لسانی مطالعہ سے اس زبان کے الفاظ اور معنی کے درمیان پائے جانے والے رشتے کو واضح کیا جاتا ہے۔ لفظ اور معنی کے اس تعلق کو لسانیات کی ایک بڑی شاخ "معنیات" (Semantics) کے اصولوں کی رہنمائی میں دیکھا، پرکھا اور سمجھا جاتا ہے۔ زبان کے سیکھنے اور اس میں موجود ادبیات اور مذہبی صحیفوں کی تفہیم کے لیے بھی ایسی معاون کتابوں کی ترتیب و تالیف کی طرف خاص توجہ دی جاتی ہے، جس سے الفاظ کے لغوی و اصطلاحی معنوں کی تفہیم پر روشنی پڑتی ہے۔ ایسی کتاب جس میں لفظ کے معنی، مفہوم، اس کے مترادفات، الفاظ کے متنوع استعمالات، لفظ کے ماخذ و اشتقاق اور لفظ کی مختلف زبانوں میں پائی جانے والی حیثیت پر محققانہ تحریر مرتب کی جاتی ہے، اسے لغت، ڈکشنری، قاموس، فرہنگ جیسے متبادل ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ لفظ اور معنی کے مابین پائے جانے والے تعلق پر ہندوستان کی قدیم کلاسیکی روایت سے ہی اہلِ علم کا رجحان پایا جاتا تھا۔ اس مقصد کے لیے قدیم عہد سے ہی ہندوستانی خطے میں لغات وقواعد کی کتب مرتب کرنے کا رجحان تاریخ علم وادب کا حصہ ہے۔ لغت نویسی کے میدان میں ہندوستان میں سب سے پہلی دستیاب لغت "نگھنٹو" کا نام ملتا ہے جس سے اس خطے میں لغت نویسی کی روایت کے سراغ ملتے ہیں۔ ڈاکٹر

نعمت الحق اپنے پی ایچ۔ ڈی کے مقالے اردو لسانیات میں اس بارے میں لکھتے ہیں:

> قدیم ہند میں ''نگھنٹو'' پہلی دستیاب لغت ہے جس میں منیوں نے 'وید' کی تفہیم میں سہولت پیدا کرنے کے لیے مشکل الفاظ کے معنوں کی وضاحت کی تھی۔ یاسک منی نے 'نراکت' میں اس لغت کی تشریح کی اور اس میں اضافے کیے۔ پانچویں صدی قبل مسیح میں یونان میں بھی لغت نویسی کے ابتدائی نقوش نظر آتے ہیں۔ یونانی دانش ور ہومر اور دیگر کلاسیکی شاعروں کے کلام میں مشکل الفاظ کی فہرست مرتب کر کے ان کی تشریح و تفسیر کر دیتے تھے۔ (1)

پانینی کی سنسکرت قواعد ''اشٹ ادھیائے'' اور ''نگھنٹو'' جیسی لغت کے دستیاب ہونے سے علم و دانش کی شمع کے ہندوستان میں سراغ ملنے سے اس خطے کے اہلِ دانش کی اہمیت کا اندازہ بہ خوبی ہوتا ہے اور یہ خطہ یونان کی علمی و ادبی روایت سے کسی طور پیچھے نہ تھا۔ لسانیات کی شاخ معنیات دو اہم حصوں، قواعد اور لغت پر مشتمل ہوتی ہے۔ ان دونوں عناصر کے اصول و ضوابط کی روشنی میں کلمے اور کلام کی صحت و درستی، معیار اور معنی و مفہوم کے تعلق کو بہ خوبی سمجھا جاتا ہے۔ لغت کا بنیادی کام زبان کے کلمے، کلام، صرفی و نحوی شکلوں کی تفہیم، لفظ کی قواعدی حیثیت، اور اس کے اصل و غیر اصل ہونے کا فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ لغت نویس کسی بھی لفظ کے عوامی استعمال، خواص کے استعمال، ادبی روایت میں لفظ کے مفہوم و استعمال، اور اس کے متنوع اقسام کے مفہوم کے اوپر تمام موجود معلومات کو معروضی انداز سے لغت میں یک جا کر دیتا ہے۔ لغت نویس لفظ کا موجود عہد میں ہونا ہی ثابت نہیں کرتا بلکہ اس لفظ کے ماضی میں مختلف اشکال و استعمال کے ساتھ ساتھ متروک الفاظ کی فہرست کو بھی لغت کا حصہ بناتا ہے، جو اس کے عہد میں ہو سکتا ہے، مستعمل نہ ہوں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ متروک الفاظ کی پیش کش سے کونسا فائدہ اس کے پیش نظر ہے؟ متروک الفاظ کو کلاسیکی ادب کی تفہیم کے لیے بھی اکٹھا کیا جاتا ہے۔ تاکہ یہ لفظ جس عہد میں مستعمل تھا اس کے معنی کے مطابق شعر پارہ یا فن پارے کس نوعیت کا مفہوم ادا کرتا ہے۔

لغت الفاظ کے معنی تک ہی محدود نہیں رہتی بلکہ اس لفظ کی املائی صورت، اس کے تلفظ کا درست انداز، لفظ کے ماخذ و اشتقاق کی معلومات، مختلف بولیوں اور زبانوں سے ہوتے

ہوتے موجودہ زبان میں آنے کا ارتقائی سفر، تذکیر و تانیث، اس کی قواعدی حیثیت کو اس انداز سے یک جا کر دیتا ہے کہ اس سے لفظ کا درست مفہوم قاری پر واضح ہو جاتا ہے۔ اب اس اندراج میں خوب صورتی یوں بھی پیدا کی جا سکتی ہے کہ اس لفظ کے مترادف اور متبادل اس زبان اور دوسری زبانوں سے الفاظ لے کر لغت کا حصہ بھی بنائے جا سکتے ہیں جس سے لغت وقیع صورت و معیار کی حامل بن جاتی ہے۔ مولوی عبدالحق لغت کبیر کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

> ایک کامل لغت میں ہر لفظ کے متعلق یہ بتانا ضروری ہوگا کہ وہ کب کس طرح اور کس شکل میں اردو زبان میں آیا۔ اس کے بعد اور اس وقت سے تا حال اس کی شکل وصورت اور معنی میں کیا کیا تغیر ہوئے۔ اس کے کون کون سے معنی متروک ہو گئے اور کون کون سے اب تک باقی ہیں اور اس میں اب تک کون کون سے نئے معنی پیدا ہوئے۔ ہر لفظ کی اصل کی تحقیق کرنی ہوگی، یعنی یہ بتانا ہوگا کہ یہ کس زبان کا لفظ ہے۔ اصل زبان میں اس کے کیا معنی تھے اور اب کیا ہیں اور اگر درمیان میں کچھ تغیرات ہوئے تو وہ کیا تھے۔ لفظ کی تاریخی حالت معلوم کرنے کے لیے اصل میں اشتقاق کا معلوم کرنا بہت ضروری ہے۔ (۲)

لغت نویسی (Lexicography) اور معنیات (Semantics) علم لسانیات کی ذیلی شاخوں کا حصہ بنتی ہیں، اس لیے لغت نویس کے لیے الفاظ کے انتخاب کو استعمال کے لیے معروضی ہونا اہم قرار پاتا ہے۔ ماہر لسانیات کی طرح لغت نویس کا بھی یہ کام نہیں ہوتا کہ وہ لفظ کے صحیح و غلط ہونے کی نشاندہی کرے یا محاکمہ دے بلکہ اس کے استعمال کو من و عن پیش کر دے تاکہ قاری اپنا نقطۂ نظر خود بنا سکے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو لغت نویس کے لیے ہرگز ضروری نہیں ہے کہ وہ کلمے یا کلام کے مستند، فصیح و غیر فصیح ہونے کے بارے میں کوئی فیصلہ دے۔ کسی بھی لفظ سے متعلق تمام تر تفصیلات، محاورے، شعرا کے ہاں استعمال کی مثالیں دینا عملی طور پر ممکن نہیں ہوتا کیوں کہ اس تفصیل سے یا تو لغت کا حجم بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے یا الفاظ کی کمی جیسے عنصر سے اندراجات کم ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے اس لیے لغت نویس اپنے ادبی

و تنقیدی ذوق کے باعث قدیم عہد کے مفاہیم و شعری مثالوں سے لفظ کو واضح کرتا ہے
موجودہ عہد کے استعمالات عام طور پر چوں کہ قاری کے سامنے ہوتے ہیں اس لیے، عام طور
پر اس کا تذکرہ اختصار کے ساتھ کرنا ہی کافی سمجھا جاتا ہے۔ لغت نویسی میں قواعدی خوبیوں کی
اہمیت کو ڈاکٹر مسعود ہاشمی کی اس رائے سے بہ خوبی سمجھا جا سکتا ہے:

> کسی بھی لغت میں اصل یا ماٰخذِ لسانی کی نشان دہی سے زیادہ یہ بات اہمیت
> رکھتی ہے کہ اس میں اندراجات کی قواعدی نوعیت اور ان کی ادبی اور لسانی
> حیثیت کی کس حد تک نشان دہی کی گئی ہے؟ یہ ایک بہت ہی نازک کام ہے اور
> ذرا سی بے احتیاطی سے لغت کی تدوین کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔۔۔ اس کی
> اسمی، فعلی، صفتی نوعیت کے تعین کے سلسلے میں کسی بھی قسم کی غلطی یا چشم پوشی
> قابلِ درگزر قرار نہیں دی جا سکتی۔ (۳)

اس اقتباس سے لغت میں شامل لفظ کی قواعدی حیثیت بھی کسی بھی قسم کے ابہام سے
لغت کے مستند یا غیر مستند ہونے کے امکان ظاہر کر کے قواعد کی اہمیت بتائی گئی ہے۔ وجہ یہ
ہے کہ لفظ کے دوسرے استعمالات، تذکیر و تانیث یا اس کی مستعمل شکلوں سے معنی کی اونچ نیچ
ہونے سے لغت پر کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن اوپر مذکور قواعدی کلیوں کا ہر صورت خیال رکھا جانا
ضروری ہے۔ لغت نویسی کے ضمن میں اس بات کو بھی ملحوظ رکھا جانا ضروری ہے کہ الفاظ کے
مترادفات کی تفصیل حد سے تجاوز نہ کرنے پائے ورنہ لغت اپنے مشمولات کے حساب سے بے
جا طویل نویسی کا نمونہ بن جائے گا جو اس ضمن میں خامی بن جائے گا۔ لفظ کے مترادف تحریر
کرتے وقت عام طور پر اس کے محاوراتی معانی کو بھی ذیل کا حصہ بنا دیا جاتا ہے جو اس
طوالت کا سبب بن سکتا ہے۔ محاوراتی معانی دیے جانے سے عام طور پر اصطلاح اور محاورہ
کے یک جا ہونے کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ بہتر ہے کہ اصطلاح کو نہ چھوڑا جائے البتہ محاوراتی
معنی کو چھوڑا جا سکتا ہے۔ ایک معیاری لغت کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیتے وقت جن باتوں کو ملحوظ
رکھا جانا ضروری ہوتا ہے وہ ڈاکٹر مسعود ہاشمی کے الفاظ میں یوں ہیں:

> کسی بھی لغت کا تنقیدی جائزہ لیتے وقت سب سے پہلا سوال اس لغت کے

> بنیادی مشمولات کا ہی سامنے آتا ہے جو کہ عام طور پر اندراجاتِ لغت، ترتیب اندراج، املا، تلفظ، اصل و ماخذ، لسانی، قواعدی نوعیت، ادبی ولسانی حیثیت اور معنی نیز معنوی وضاحت سے ہی عبارت ہوتے ہیں۔ اندراجات کی قواعدی نوعیت (اسم، فعل، صفت وغیرہ) اور ادبی ولسانی حیثیت (فصیح، قدیم، متروک) کے تعین کی بابت نقطہ نظر یا رویہ کیا رہا ہے؟ معنوی وضاحت کے سلسلے میں تشریحی طریقہ کار اختیار کیا گیا ہے یا مترادفاتی یا دونوں؟ دیگر ترکیبات، محاورات اور ضرب الامثال وغیرہ کی شمولیت پر کس حد تک توجہ دی گئی ہے؟ نیز کیا محاورہ اور استعمال کے فرق کو ملحوظ رکھا گیا ہے؟(۴)

اس طویل اقتباس میں اٹھائے گئے سوالات کو رہنما اصول بنا کر دیکھا جا سکتا ہے۔ اور ان سوالات کا تسلی بخش جواب دینے کے بعد کسی بھی لغت کے معیاری، غیر معیاری ہونے کا اندازہ بہ خوبی کیا جا سکتا ہے۔ لغت نویسی کے سلسلے میں الفاظ سے متعلق تمام مشمولات اہم لیکن لغت نویسی کا بنیادی کام سب سے پہلے لفظ کا اشتقاق اور مادہ تلاش کر کے لکھنا ہوتا ہے کیوں کہ مفہوم و معنی اہم ہوتا ہے لیکن اس کی حیثیت ثانوی ہے جب کہ اوّل الذکر کو تقدم حاصل ہے۔ لفظ کے ماخذ سے ہی اس بات کا پتا چلنا آسان ہے۔ اس طرح لغت نویس پر یہ ذمہ داری خود بخود عائد ہو جاتی ہے ہے کہ اس کو ایک سے زیادہ زبانوں سے آگاہی ہو، اس کا مطالعہ وسیع ہو اور تقابلِ زبان کی خوبی اس میں موجود ہو۔ جس زبان میں لغت مرتب کی جا رہی ہے اس کے جملہ مباحث سے کامل واقفیت رکھتا ہو۔ عوامی بول چال، خواص کی بول چال سے لے کر ادبی ذوق کی فراوانی سے بہرہ ور ہو۔ املا، رسم الخط اور اصطلاحات و محاورات سے آگاہی بنیادی شرط ہے۔ ان علوم سے بہرہ ور ہونے کے بعد اس کو ہر دو زبانوں کے اصولِ لغت سے نہ صرف آگاہی ہو بلکہ ان کی روایت سے شد بد بھی رکھنا ضروری ہے۔ ان تمام عناصر کے بعد اہم بات یہ کہ اسے لسانیات کے علم کے متعلقہ شاخوں اور مبادیات سے بھی آگہی ہو۔ خلیل صدیقی لکھتے ہیں:

> کسی زبان کی لغت کو اس زبان کے تمام مارفیموں، الفاظ، بنیادی تصریفات،

مشتقات، مرکبات، محاوروں، کہاوتوں، نیز الفاظ کے مستند املا، تلفظ، مروّجہ لہجوں یا تلفظ کے انحرافات، معنی و مفہوم کے ساتھ ساتھ ان کی اصل صوتی و معنیاتی تغیرات اور روپ، درجے، جنس (تذکیر و تانیث، اگر غیر حقیقی مستعمل نہیں) وغیرہ کا سرمایہ ہونا چاہیے۔ (۵)

درج بالا صفحات پر اردو لغت نویسی کے بارے میں مختلف ماہرین اردو کی آرا کے مطابق چند اصول وضع کر کے لغت نویسی کے حدود و قیود کا ایک خاکہ بنانے کا مقصد یہ ہے کہ ان اصولوں اور عناصر کی موجودگی سے لغت کے معیار کو متعین کرنے میں آسانی رہے۔ مغرب میں لغت نویسی کے اصول و ضوابط سائنسی طریقۂ کار کے حامل ہونے کے باعث ان بہت سے مسائل سے آزاد ہیں جو اردو لغت نویسی کی تدوین و ترتیب میں پیش آتے ہیں۔ اردو زبان کے کلاسیکی/قدیم دور کے لغت نویس سائنسی اصولوں سے اس طرح آگاہ نہیں تھے جس طرح موجودہ دور میں ہوا جا سکتا ہے۔ قدیم عہد کی اردو لغت نویسی کے آغاز میں خالق باری کا سراغ ملتا ہے۔ اس کے علاوہ اٹھارھویں صدی تک لغت کا خاطر خواہ سرمایہ نہیں ہے۔ چند ایک لغات ملتی بھی ہیں تو ان میں بیش تر فارسی زبان اور عربی فارسی اصولوں کی رو سے مرتب کی گئی ہیں۔ ان لغات کی تالیف کا بنیادی مقصد تدریسی نقطۂ نظر سے مشکل الفاظ کی تفہیم کے لیے الفاظ کا جمع کرنا تھا۔ 'غرائب اللغات، (از ملا عبدالواسع ہانسوی) تدریسی مقصد کے لیے مرتب کی گئی لغت کی بہترین مثال ہے۔ عبدالواسع ہانسوی کے پیش نظر اس کے وہ طالب علم ہی تھے جو اسباق کے مشکل معنوں کی تفہیم کے لیے تشنہ رہ جاتے تھے۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ موجودہ دور میں بھی اردو لغت نویسوں کا رجحان بہت زیادہ سائنسی انداز سے لغت مرتب کرنے کی طرف نہیں ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ سائنسی طریقۂ کار کے مطابق اردو میں بہت کم لغات لکھی گئی ہیں۔ ان میں مولوی عبدالحق کی لغت ''لغتِ کبیر'' بہ طور مثال سامنے رکھی جا سکتی ہے۔

حوالہ جات وحواشی:

۱۔ نعمت الحق، ڈاکٹر، ''اُردو لسانیات: تاریخ وتنقید کی روشنی میں''، مقالہ برائے پی ایچ۔ ڈی، مخزونہ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، غیر مطبوعہ، ۱۹۹۵ء، ص ۴۵۲

۲۔ عبدالحق، مولوی، لغت کبیر (مقدمہ)، جلد دوم، (حصہ اوّل)، (کراچی: انجمن ترقی اُردو، ۱۹۷۷ء)، ص ۴۶

۳۔ مسعود ہاشمی، ڈاکٹر، اُردو لغت نویسی کا تنقیدی جائزہ، (نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، ۲۰۰۰ء)، ص ۹۱

۴۔ ایضاً۔ ص ۷۲۔ ۱۷

۵۔ خلیل صدیقی، پروفیسر، لسانی مباحث، (کوئٹہ: زمرد پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء)، ص ۳۱۶

۶۔ عبدالحق، مولوی، اُردو لغات اور لغت نویسی، مشمولہ: اردو لغت نویسی، ڈاکٹر رؤف پاریکھ، (مرتب)، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۰ء)، ص ۱۳۱۔ ۱۳۰

1.7

پنجاب کا لسانی لینڈ سکیپ، ادبی، سیاسی اور سماجی تناظرات کا مابعد نوآبادیاتی مطالعہ

A Post-Colonial Study of Literary, Political and Social Perspectives of The Linguistic Landscape of Punjab.

Fort William College was formed in 1800 at Calcutta by the personnel of East India Company for the main purpose of indigenous languages acquisition to its civil and military officials. The various departments like Hindoostanee, Punjabi, Persian, Arabic and other local languages were established for this purpose. John Gilchrist was the head of Hindoostanee (Urdu(language department. He devise the refined dialect of Hindoostanee language named Urdu here which was the language of command for northern Indian parts in colonial period. This language was imposed as an official language of different Indian parts included Punjab. Punjab was being governed by Maharaja Ranjeet Singh at

that time, Persian was the official and Punjabi was the language of common man at that time. The literacy rate of Punjab was above eighty percent at that time. Since 1857 ,the language landscape of Punjab was changed by the British Rulers and The Persian and Punjabi Language was replaced by Urdu Language which was not the language of commoners here. There were two types of views from local intelligentsia as well as The British officials to change the language identification of this province or not.

Due to adopt the Urdu language, the literacy rate of Punjab was reduced automatically. This action by the rulers changed political as well as the social scenario of this region. The third language Saraiki of the western part of Punjab was also accepted serious changes in itself. After 1947 ,The East Punjab restore the real Punjabi Language in India because it was the religious and first language of Sikh community, but this Language change was continued in Punjab province. This colonial agenda was the effective reason for the dramatic linguistic changes in 19th and 20th century in Punjab. The historical and socio linguistics changes will be observed and discussed in colonial and pre-colonial period in this article.

عصر حاضر کے پنجاب میں موجود زبانوں کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس صوبے میں پنجابی، سرائیکی، اردو اور انگلش زبانیں اپنی معاون بولیوں کے ساتھ عوامی بول چال، ادبی تحاریر، سرکار دربار اور دفتری امور کی انجام دہی کے لئے ایک بڑی آبادی کے زیر استعمال ہیں۔ اپنے استعمالات کے باوصف ان زبانوں کی اہمیت مسلمہ ہے جس سے پنجاب کے خطے کے لسانی منظرنامے اور قومی مزاج کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ پنجاب میں قریب قریب

گیارہ کروڑ افراد اپنے روزمرہ معاملات اور بول چال کے لئے پنجابی اور سرائیکی زبانوں سے کام لیتے ہیں۔شہروں میں عوام تیزی سے ملک کی قومی زبان اردو اپنا رہی ہے جبکہ انگلش ملک کی دوسری سرکاری زبان ہونے کی وجہ سے تعلیمی اور دفتری افراد کے زیر استعمال ہے۔اردو اور انگلش پنجاب کی اشرافیہ کی زبان بن چکی ہے جس کی وجہ سے صوبے کی پہلی زبانوں جن میں پنجابی اور سرائیکی زبانیں شامل ہے،انکے بولنے والوں کی تعداد میں کمی دیکھنے میں آرہی ہے، جو اپنی جگہ تحقیق طلب مسئلہ ہے۔زیر نظر مقالے میں اٹھارہویں، انیسویں اور بیسویں صدی میں پنجاب کے لسانی لینڈسکیپ کا عوامی بول چال، مذہبی محرکات، دہلی کی مرکزی حکومت کی لسانی پالیسی کے ساتھ ساتھ نوآبادیاتی عہد کے لسانی معاملات کو دیکھنے اور اس کے نتیجے میں بیسویں صدی کے پاکستانی پنجاب میں تشکیل پانے والے لسانی منظرنامے کو ایک غیر جانبدارانہ انداز سے دیکھنے کی سعی کی گئی ہے۔

ماقبل نوآبادیاتی عہد یعنی Pre-Colonial Period (1757ء سے 1857ء تک) وہ سو سالہ دور تھا، جس میں ایسٹ انڈیا کمپنی تجارت کے معاملات سے آگے بڑھ کر ہندوستان بھر کے ہر حکومت کے لیے تیار ہونے کے متنوع امور میں مصروفِ عمل تھی۔ 1857ء سے 1947ء تک کے نوے سال تاجِ برطانیہ نے براہ راست اپنی حکومت بنائی، جسے کالونیل دور (یعنی نوآبادیاتی دور) کہا جاتا ہے۔ ان ڈھائی سو سالوں سے قبل کا لسانی مطالعہ پنجاب میں آنے والی نوآبادیاتی تبدیلیوں کو سمجھنے میں زیادہ معاون ثابت ہو سکے گا۔ لسانی لینڈسکیپ پر انگریزی پالیسیوں کے اثرات کو ان نکات کی روشنی میں دیکھنے سے اہم نتائج کا استخراج ممکن ہے جن پر آئندہ صفحات میں پوسٹ کالونیل تھیوری کی مدد سے روشنی ڈالی جارہی ہے۔

1. انیسویں صدی سے قبل پنجاب میں عوامی بول چال کی زبان کیا تھی اور ادبی و تحریری مقاصد کے تحت اردو/ ہندی اور فارسی نے کس طرح پنجاب کی مقامی زبان کی جگہ لی؟

2. پنجابی زبان نے بطور مذہبی زبان (سکھ مت) اور شعری زبان کے کس طرح سے سماج میں مقبولیت پائی۔

3. جنوبی پنجاب کے اضلاع میں سرائیکی زبان کس انداز سے ایک الگ اور بھرپور زبان بننے کا مرحلہ طے کر رہی تھی؟

4. اٹھارہویں صدی میں پنجاب کا لسانی لینڈ سکیپ کیا تھا؟

5. پری کالونیل دور میں انگریزوں کی لسانی پالیسی کیا تھی؟

6. مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد حکومت میں پنجاب کا لسانی منظر نامہ کیا تھا؟

7. انیسویں صدی میں انگریز لسانی پالیسی کیا تھی اور اس نے پنجاب کے ادب، زبان اور اشرافیہ وعوام کو کس طرح متاثر کیا؟؟

8. پنجاب کے شعرا اور ادیب پنجابی کی بجائے کیوں اردو کی طرف مائل ہوئے؟

9. بیسویں صدی کا پنجاب کا لسانی لینڈ سکیپ کن رنگوں سے رنگا گیا؟

10. 1947 کے بعد کا لسانی لینڈ سکیپ کی صورتحال اور محرکات کیا ہیں؟

لسانیات کی دو اصطلاحات، Dialect (بولی) اور Language (زبان) کی حدود اور ان کے مابین پائے جانے والے مضبوط تعلق کو ساجی طور پر سمجھا جانا ضروری ہے۔ بولی کسی بھی زبان کے بننے (تشکیل) کا ابتدائی مرحلہ ہوتا ہے جس میں کوئی زبان زبانوں کے کسی سلسلے یا خاندان سے الگ ہو کر اپنی الگ پہچان کا سفر شروع کرتی ہے۔ بولی کسی بھی محدود سے علاقے میں موجود اور محدود ہوتی ہے۔ کوئی بولی جتنے زیادہ افراد کے استعمال میں ہوگی، وہ اتنے ہی زیادہ علاقوں میں پھیلتی چلی جائے گی۔ اردو یا پنجابی یا کوئی بھی مکمل زبان اول اول ایک بولی تھی۔ اسکا اپنا لوک ادب موجود تھا اور محدود ذخیرہ الفاظ اور علاقائی روزمرہ اور محاورہ اس کی اولیں پہچان تھا۔ اس کے ذخیرہ الفاظ کی وسعت، لسانی استقلال اور سنجیدہ ادبی روایت کے باعث یہ مکمل اور معیاری زبان کے درجے پر فائز ہوئی۔ پھر جیسے جیسے اس کے بولنے والوں کی تعداد بڑھتی گئی، اس کی دوسری بولیاں وجود میں آتی چلی گئیں۔ آج آپ کو اردو اور پنجابی کی مختلف بولیاں یعنی Sub-Dialects نظر آئیں گی۔ اور اس مثال سے باقی زبانوں کے ارتقائی سلسلے کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ ان مباحث کو تاریخی لسانیات کی ذیل میں دیکھا جا سکتا ہے۔(1)۔

بولی سے مکمل زبان بننے کا عمل اس طور وقوع پذیر ہوتا ہے کہ جب کسی علاقے کی بولی میں لسانی عمل کے تحت الفاظ کے تلفظ، معنی کے تعین اور گریمر کی پابندیوں کو لاگو کر دیا جائے تو یہ بولی زبان کا درجہ اختیار کرنا شروع کر دیتی ہے۔ ایک بولی اس وقت تیزی سے معیاری زبان بننے کا مرحلہ طے کر لیتی ہے، جب وہ کسی ایسے علاقے میں بولی جارہی ہو جو، طاقت اور حکومت کا مرکز بن جائے (مثال کے لئے لاہور شہر کو دیکھا جا سکتا ہے جو کالونیل دور سے موجودہ دور تک حکومتی مشینری کا صدر مقام ہے)۔ اس کے ساتھ جب کسی بولی میں کسی مذہب کی تبلیغ کا عمل شروع ہو جائے یا کوئی مذہبی کتاب لکھی جائے تو اس کی ترقی کی رفتار تیز ہو جاتی ہے (مثال کے طور پر گرو گرنتھ صاحب جو پنجابی زبان میں مرتب ہوئی) اور یوں دور دراز کے علاقے کی بولیاں اس معیاری، سرکاری اور دفتری زبان کی معاون بولیاں یا Sub-dialect بن جاتی ہیں۔ کوئی بولی اس گروپ سے علیحدہ ہو کر اپنی انفرادیت کا اعلان بھی کر سکتی ہے، جس سے یہ بولی الگ ایک زبان بننے کا سفر شروع کر دیتی ہے، جیسے سرائیکی زبان کی مثال کو لیا جا سکتا ہے یہ خالصتاً لسانیاتی سائیکل ہے، جس کو لسانی بنیادوں پر پرکھا بھی جا سکتا ہے۔

سترہویں صدی کے اواخر میں اورنگزیب عالمگیر کا دکن کے علاقے فتح کر کے ایک مرکزی حکومت قائم کرنے کا اقدام لسانی اعتبار سے ہندوستان بھر کی تمام اطراف کی لسانی صورتحال پر اثر انداز ہوا۔ اس دور میں عام بول چال کی زبان اردو سے ملتی جلتی بولیوں کی صورت میں مختلف علاقوں میں مروج تھیں۔ چونکہ ابھی تک اردو، کسی بولی کا نام نہیں تھا اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ دکن شمالی ہندوستان، لاہور، سندھ، بنگال کی اطر ے میں ملتی جلتی بولیاں (Dialects) رواج پا رہی تھیں، جن کی اکا دکا مثالیں ان علاقوں کے شعرا کے ہاں دکھائی دیتی ہیں۔ پنجاب میں یہاں کی مقامی زبان پنجابی تھی لیکن اردو/ ہندوستانی زبان بھی ادبی و تعلیمی سطح پر موجود تھیں۔ اس عہد کے لسانی رویے کو سمجھنے کے لئے ڈاکٹر جمیل جالبی کے یہ الفاظ خاصی معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں،

اس بات کا اعادہ بے محل نہ ہوگا کہ دکنی اور شمال کی زبان چونکہ اردو زبان ہی کے دو روپ تھے اس لئے دور عالمگیری میں جب شمال اور جنوب ایک ہوئے تو سیاسی غلبے کے ساتھ

ایک طرف شمال کی زبان دکن کی ادبی زبان بننے لگی اور دوسری طرف دکن کی ادبی روایت شمال کی ادبی روایت بننے لگی۔ یہ ایک ایسا امتزاجی عمل تھا کہ زبان و ادب کی ان روایات کے ملنے سے سارے برعظیم میں اردو زبان کا ایک معیاری روپ اور مشترک روایت وجود میں آگئی جسے پنجاب، سندھ، یوپی، گجرات، دکن، وسطی ہند، بنگال، بہار، دہلی اور برعظیم کے دوسرے علاقوں میں ادبی سطح پر یکساں معیار کے ساتھ استعمال کیا جائے گا۔ (2)

اٹھارہویں صدی میں ہندوستان بھر میں مرکزی مغل حکومت کے قیام نے لازمی طور پر دارالحکومت دہلی کی سرکاری زبان فارسی اور اس کی جگہ عوامی بول چال کی زبان ہندوستانی (اردو اور ہندی کا ماخذ) نے پنجاب میں ادبی و لسانی طور پر لکھنے والوں کی توجہ حاصل کرنا شروع کردی تھی۔ اس سلسلے میں دو مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ ایک یہ کہ ولی دکنی کے اردو غزل کے دیوان کی دہلی آمد سے اردو شاعری کی باقاعدہ روایت دارالحکومت ہی میں شروع نہ ہوئی بلکہ تاریخ میں یہ واقعہ بھی موجود ہے کہ پنجاب میں اس زبان کے ادبی روپ نے شاہ مراد جیسے پنجابی شاعر کو متاثر کیا۔ اس دور میں اس ادبی زبان کا نام ریختہ بھی لکھا اور پکارا گیا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ پنجاب کے ادیبوں میں اردو زبان میں شعر کہنے کی انفرادی کاوشیں موجود تھیں۔ اس کے علاوہ اس عہد کے رزم ناموں کا مطالعہ بھی اردو زبان کے پنجاب میں رواج پانے کی تاریخی سند بنتا ہے۔

ماقبل نوآبادیاتی دور کی بات کریں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ پنجاب میں اٹھارہویں صدی کا دور ادبی لحاظ سے بڑا زرخیز دور تھا۔ اس دور میں آپ کو وارث شاہ اور بلھے شاہ کی پنجابی شاعری کا دور دورہ نظر آئے گا۔ یہ دو شاعر مسلمانوں کی اس پنجابی زبان کی مثالیں کرتے ہیں، جن میں عربی اور فارسی کے الفاظ مسلسل شامل ہو رہے تھے اور ان کے اُسلوب کا حصہ بھی تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ سکھ کمیونٹی کی نمائندہ مذہبی و بول چال کی زبان پنجابی تھی جو تحریری طور پر گورمکھی رسم الخط میں موجود تھی، (جس میں بابا گرونانک سرکار کی مذہبی کتاب گرنتھ صاحب کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے)۔ ان شعرا کی پنجابی تحریر عس میں فارسی زبان جزوی طور پر پنجابی کے ساتھ چل رہی تھی۔ وارث شاہ کی ہیر نظم میں پنجابی نظموں کی سرخیاں فارسی زبان

میں لکھی گی تھیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کی پنجاب کی ادبی زبان میں فارسی الفاظ وتراکیب کا چلن بڑھ رہا تھا۔ پنجاب میں سکھ، ہندو یا مسلم کمیونٹی میں پنجابی اور جنوبی علاقوں میں لہندا یا ملتانی زبان رابطے کا کام سرانجام دے رہی تھی، جس کو آج سرائیکی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس منظرنامے کو پورے پنجاب بشمول ریاست بہاولپور میں رائج تصور کیا جا سکتا ہے۔

اٹھارہویں صدی میں ہندوستان کی مشرقی اور جنوبی علاقوں میں پرتگالی، فرانسیسی، جرمن اور انگلینڈ کی ایسٹ انڈیا کمپنیاں تجارت کے مقاصد کے تحت سرگرم عمل تھیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی انگلینڈ نے اپنی سفارتی، تجارتی اور عسکری طاقت سے ان تجارتی کمپنیوں کو ہندوستان سے نکال باہر کیا تھا۔ 1757ء میں جنگ پلاسی میں انگریزوں کی مقامی طاقتوں سے فتح نے ان کا حوصلہ بڑھایا اور اس کے کچھ عرصہ بعد انھوں نے 1764 میں جنگ بکسر جیت کر تین بڑے ڈویژن کلکتہ، بمبئی اور مدراس پر اپنی مکمل حکومت قائم کر لی۔ کلکتہ، بمبئی اور مدراس کے علاقوں کی اہم زبانوں (بنگالی اور ہندوستانی زبان) کو حکمرانی کے مقاصد کے لیے ان کو سیکھنا ضروری ہو گیا تھا۔ چنانچہ ان علاقوں کی ضروریات کے مدنظر مختلف مستشرقین کی مدد سے لسانی پالیسی وضع کی گئی۔ اور جارج ہیڈلے نے ہندوستانی زبان سیکھنے کے لیے انگریزی زبان میں پہلی گریمر مرتب کی جو 1772 میں شائع ہوئی۔ سر ولیم جونز جو بنگال کی ہائیکورٹ کے جج تھے، انھوں نے ہندوستان کو سمجھنے کے لیے فارسی متن کی اہمیت پر زور دیا۔ سر ولیم جونز نے ہندوستان میں تقابلی لسانیات کا باقاعدہ آغاز کیا۔ فارسی مسلم حکومت کی سرکاری زبان تھی جو پنجاب میں بھی سرکاری حیثیت سے رائج تھی۔ انھوں نے ہندوستان کو سمجھنے کے لیے فارسی متن کی اہمیت پر زور دیا۔ فارسی مغل حکومت کی سرکاری زبان تھی، جو باقی علاقوں کی طرح پنجاب میں بھی سرکاری حیثیت سے رائج تھی۔ چنانچہ فارسی، عربی اور سنسکرت تینوں زبانوں کی اہمیت سمجھتے ہوئے کمپنی کے افسروں اور فوجیوں کو ان زبانوں کے سیکھنے کا منصوبہ دے دیا گیا۔ عربی اور سنسکرت مسلم اور ہندو لوگوں کے مذہب کی زبان تھی، جس کو سیکھ کر ان دو کمیونٹیز کو بہتر سمجھا جا سکتا تھا۔ فارسی کی مدد سے مغل حکومت کو سمجھنا سودمند تھا، چنانچہ ایسے مرحلے پر زبان کے اس گروپ کو کلاسیکی زبانوں کا نام دے کر اپنے ملازمین کو کمپنی نے یہ زبانیں سیکھنے کا حکم دیا۔ (3)

1785ء میں برطانیہ میں فیصلہ ہوا کہ اب ایسٹ انڈیا کمپنی کو تجارت سے توجہ ہٹا کر ہندوستان پر حکومت کرنے کا منصوبہ بنانا چاہیے، چنانچہ کمپنی کے ملازمین کو یہ ایک نیا منصوبہ دیا گیا۔(4) اس ضمن میں یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ یہاں کے گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز نے فارسی کی اہمیت پر زور دیا، کیوں کہ وہ خود فارسی اور عربی کا ماہر تھا۔ چنانچہ اس نے ان کو کلاسیکی زبانوں کا نام دے کر اپنے ملازمین کو کمپنی نے یہ زبانیں سیکھنے کا حکم دیا۔ 80 کی دہائی میں ایک اور مستشرق جان گل کرسٹ نے کمپنی کو ایک نئی لسانی پالیسی دی۔ وہ یہ کہ کلاسیکی زبانوں کی بجائے ہندوستان کی مقامی زبانوں میں، جن کو اس نے ورنیکولر زبانوں کا نام دیا، ہر سرکاری کام کیا جانا چاہیے، کیوں کہ اول تو یہ کہ فارسی اور سنسکرت ایک تیار شدہ متن ہے، جس میں انگریز کوئی نئی بات داخل یا پیش نہیں کرسکتا، جب کہ ابھی تک ورنیکولر زبانوں جن میں اہم زبان ہندوستانی تھی (جو آگے چل کر اُردو کہلائی) کو تیار کیا جائے تاکہ مقامی آبادی سے ایک تو براہ راست رابطہ ممکن ہو سکے گا، دوسرا آگے چل کر فارسی کو ہٹا کر کسی مقامی زبان کو لاگو کیا جانا آسان ہو سکے گا۔ اس منصوبے کے تحت حکمرانی کے لیے زبان کی تیاری کا منصوبہ بنایا اور اگلے بیس سال اس نے ہندوستانی زبان کی گریمر، ڈکشنری اور دیگر تراجم کر کے مقامی بولی کو ایک بڑی زبان کے طور پر تیار کیا، جو آج اُردو کے نام سے جانی جاتی ہے۔ یہ زبان شعری ادب تو رکھتی تھی، لیکن ابھی نثر کے لیے عام استعمال میں نہ تھی۔ چنانچہ 1800ء میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج بنایا گیا اور اس میں عربی فارسی سنسکرت کے ساتھ ساتھ ورنیکلر زبانوں کے شعبے بھی بنائے گئے، جن میں اُردو، بنگالی کے ساتھ ساتھ پنجابی شعبہ بھی قائم کیا گیا اور ولسن نے یہاں پنجابی کی پہلی گریمر بھی مرتب کی۔ 1800ء سے کلکتہ میں کمپنی نے اپنے فوجی اور سول افسران کے لیے کسی ایک زبان کا سیکھنا لازمی کر دیا تاکہ کل جب کمپنی ہندوستان فتح کرے تو افسروں نے جس علاقے میں تعینات ہونا ہو، وہ وہاں کی زبان سے واقف ہوں۔ یہ کالج ایسٹ انڈیا کمپنی کی لسانی پالیسی کو سمجھنے میں بہتر معاون ہے۔(5)

1799ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے پنجاب پر اپنی حکومت قائم کی۔ اس دور میں دہلی میں بیٹھا مغل بادشاہ صرف دہلی تک کی حکومت کا مالک رہ گیا تھا، باقی علاقے اس کے ہاتھ

باقی علاقوں کی طرح پنجاب میں بھی طاقت کے اصول نے حکومت رنجیت سنگھ کو قائم کرنے کا موقع دے دیا۔ دہلی میں ایلیٹ کلاس عوام سے اپنی زبان علیحدہ رکھتی تھی۔ یعنی ایلیٹ/ اشرافیہ کلاس فارسی بولتی، لکھتی اور پڑھتی تھی، جب کہ عوامی بول چال ہندی/اُردو/ ہندوستانی میں ہوتی تھی۔ یہ دارالحکومت کا مزاج تھا۔ اسی مزاج کو لاہور میں سکھوں نے برقرار رکھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے سرکاری زبان فارسی کو ہی برقرار رکھا، جب کہ عوامی بول چال پنجابی تھی، سو یہ زبان چلتی رہی۔ یہاں پنجاب کے لسانی مزاج کو یوں سمجھا جانا چاہیے کہ دہلی میں شاعر ایلیٹ (اشرافیہ) کی زبان فارسی کو چھوڑ کر عوامی زبان اُردو میں شاعری شروع کر چکا تھا، لیکن پنجابی شاعروں نے عوامی زبان پنجابی میں ہی ایک عرصے سے شعری روایت جاری رکھی جو، تحسین کے لائق ہے۔ اٹھارہویں صدی میں بڑے بڑے ناموں میں بابا بلھے شاہ، وارث شاہ، سید علی حیدر ملتانی، مولوی عبدالکریم جھنگوی، حافظ شاہجہان مقبل جیسے شاعروں کی تخلیقات کو پڑھا جا سکتا ہے۔ ان شعراء میں علی حیدر ملتانی کے شاعرانہ اُسلوب سے اندازہ ہوتا ہے کہ پنجابی زبان سے ملتی جلتی بولی، ملتانی، اپنا لب و لہجہ اور صوتیاتی نظام مرکزی پنجابی سے الگ کرتی نظر آتی ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہاں سے آنے والے عہد کی سرائیکی زبان کا ادبی طلوع تاریخ کا حصہ بنتا ہے۔(6)۔

1831ء میں انگریز نے اُردو زبان کو اپنے زیر انتظام علاقوں میں سرکاری زبان کا درجہ دیا تو اس میں صحافت کا باقاعدہ آغاز ہوا۔(7)۔ دیکھتے ہی دیکھتے پنجاب میں بھی اُردو اخبارات کی اشاعت شروع ہوئی۔ اُردو صحافت نے پنجاب کی زبانوں کو پیچھے کر دیا اور اپنی ساکھ بنانا شروع کر دی۔ 1835ء میں لارڈ میکالے نے انگریزی زبان کی محدود تعلیم مقامی افراد کو دینے کا بل پاس کیا، جس کی رو سے انگریزی زبان کو نوکری کے لیے ضروری خیال کیا گیا اور سول ملازمین اور مقامی آبادی کو دفتری امور کے لیے تیار کرنے کا منصوبہ شروع ہوا۔ اس منصوبے نے ہندوستان بھر کے افراد کو اُردو اور انگریزی زبان کی طرف مائل کیا۔ اس سلسلے میں ایک اہم بات پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ لارڈ میکالے کے انگریزی زبان کو لاگو کرنے کے منصوبے کا اولین مرحلہ چارلس گرانٹ کا 1790 میں برطانوی پارلیمنٹ کے سامنے پیش کیا گیا وہ ہیولہ تھا جس

ے ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی تھی کہ ہندوستانی لوگ جاہل اور وحشی ہیں۔اور یہ کہ انگریزوں کو چاہیے کہ ان کی تعلیم وتربیت کا ذمہ قبول کریں۔اس ضمن میں مغربی تعلیم کے ساتھ ساتھ عیسائیت کی تبلیغ کو بھی اس منصوبے کا حصہ بنانے کی سعی کی گئی تھی۔(7)۔اس لسانی منصوبے کو،دیکھا جائے تو،عملی شکل لارڈ میکالے کے انگریزی کے نفاذ کے تعلیمی منصوبے کی صورت میں دی گئی۔اس کے بارے میں ڈاکٹر ناصر عباس نیر کا نقطہ نظر یہ ہے،

چارلس گرانٹ کے موقف میں جو بات ایک خیال کی سطح پر تھی وہ لارڈ میکالے کی تعلیمی رپورٹ میں ایک زوردار نظریے میں بدل گئی۔میکالے 1834 میں حکومت ہند کے نئے رکن قانون کی حیثیت سے مدراس میں وارد ہوااور اسے مجلس تعلیمات عامہ کا صدر بنایا گیا۔اس نے 1835 کی تعلیمی رپورٹ میں قطعیت سے لکھا کہ کمپنی کو اپنا تعلیمی بجٹ صرف اور صرف انگریزی تعلیم پر خرچ کرنا چاہیےاور کمپنی کو روایتی اور مقامی مدارس کی مالی سرپرستی سے ہاتھ کھینچ لینا چاہیے--[چنانچہ]1835 میں انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنا دیا گیا۔اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ انگریزی نظام تعلیم ایک نئی ہندوستانی اشرافیہ پیدا کرنے کی غرض سے رائج کیا گیا۔(8)

انگریز نے 1849ء میں سکھوں سے حکومت چھین لی اور ان کی زبان پنجابی کو پیچھے دھکیلتے ہوئے،اردو کو رابطے کی زبان کا بنانے کا عوامی تجربہ کیا، چنانچہ یہاں انگریزوں کی لسانی پالیسی زیادہ واضح ہو کر سامنے آئی اور اُردو کو پنجاب خصوصاً لاہور میں رائج کرنے کا منصوبہ سامنے آیا۔1857ء کے سال،عنان حکومت مکمل طور پر انگریزوں کے ہاتھ آ گئی۔مغل حکمرانوں کی زبان کو ختم کرنے کی پالیسی دوبارہ عمل میں آئی اور یوں دہلی میں فارسی کو عملاً سرکاری دفاتر سے ختم کر کے انگریزی اور پنجاب کے دفاتر میں اُردو کو لاگو کر دیا گیا۔مقالات گارساں دتاسی کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ پٹیالہ کے راجہ، جے پور کے راجہ، والی کشمیر اور لاہور کی ایلیٹ کلاس انگریز کی اس لسانی پالیسی کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو گئی، چنانچہ لاہور میں عملاً اُردو نافذ کر دی گئی۔یہاں یہ بات دلچسپی کی حامل ہے کہ پنجاب میں سول حکام بالا کی اکثریت کا تعلق اردو سپیکنگ علاقوں سے تھا اور انکی پہلی/ مادری زبان (L1)اردو ہونے کی

وجہ سے انکا اور دفتری عملے کا رجحان اردو کی طرف ہونا لازمی تھا۔ دفاتر میں اردو کا چلن دیکھ
عوام کا اور ادیبوں کا اردو کی طرف رجحان ہوتا چلا گیا اور پنجاب کی مقامی زبانیں ادبی اور
سرکاری سطح پر اردو کے مقابلے میں پس منظر میں جانا شروع ہو گئیں۔ ڈاکٹر لائٹنر جو کہ لاہور
میں علمی حوالے سے ایک اہم نام ہے، اردو زبان کا ماہر تھا۔ اس نے یہاں تعلیمی اداروں کے
قیام اور ان کے نصاب کی تیاری کے لئے انجمن اشاعت مطالب مفیدہ کے نام سے ایک تنظیم
بنائی جو آگے چل کر انجمن پنجاب کے نام سے معروف ہوئی۔ لاہور میں ڈاکٹر لائٹنر کی ایما پر
کرنل ہالرائیڈ کی نگرانی میں 1869ء میں انجمن پنجاب نام کی ایک تنظیم بنائی گئی، جن کے
ذمے اس متن کی تیاری کا کام لگایا گیا جو، ستر سال پہلے گل کرسٹ کے ہاتھوں فورٹ ولیم کالج
میں شروع ہوا تھا۔ ایک منصوبے کے تحت دہلی/ میرٹھ اور یوپی سے پڑھے لکھے افراد جن میں
مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا الطاف حسین حالی کا نام نمایاں یہاں مدعو کیا گیا تا کہ مقامی
زبان کی بجائے اُردو زبان کا متن تیار کیا جائے۔ یہ متون سکولوں کے نصاب کا حصہ بنائے
گئے۔ لاہور کو نیا تعلیمی مرکز بنانے کے لیے دہلی کالج کا سیٹ اپ یہاں لایا گیا اور گورنمنٹ
کالج کی صورت میں یہاں نیا تعلیمی ادارہ شروع ہوا، جو اشرافیہ کے اولاد کے لیے موزوں تھا۔
پنجاب کو چوں کہ لاہور سے کنٹرول کیا جاتا تھا، چنانچہ یہاں اورینٹل کالج کی صورت میں
مشرقی زبانوں کا ادارہ بنایا گیا، جس کے پنجاب کے لسانی نظر نامے پر اُردو انگریزی زبانیں
کلاسیکی حیثیت اختیار کر گئیں، جب کہ مقامی پنجابی، سرائکی، پوٹھوہاری، ہندکو اور دیگر بولیاں
ورنیکلر زبانوں کے طور پر پس منظر میں چلی گئیں۔ اس انجمن میں کرنل ہالرائیڈ اور دہلی سے
تشریف لائے ہوئے دو اردو شعرا، مولونا محمد حسین آزاد اور مولانا حالی کی کاوشوں سے اردو
زبان کی شعری اور نصابی عمارت تعمیر ہونا شروع ہوئی جس نے لاہور میں پنجابی زبان کی ترویج
کو پیچھے دھکیلتے ہوئے اردو زبان کو رائج کرنے کے منصوبے کو ممکن بنایا۔ انگریز حکمرانوں کا
طبعی رجحان اردو اور انگریزی کے علاوہ مقامی زبانوں کی طرف بالکل نہ تھا۔ اس سلسلے میں اگر
گارساں دتاسی کی تاریخ ادبیات اردو میں سے ان کتب کی لسٹ تیار کی جائے جو انیسویں
صدی کے آخری ربع میں پنجاب اور بالخصوص لاہور سے شائع ہوئی تھیں تو ان کی غالب

اکثریت اردو زبان میں تحریر ہوئی تھیں۔ یہی حال اس دور کے اخبارات کا تھا۔ یہ اخبارات زیادہ تر اردو زبان میں ہی شائع ہوتے تھے۔ چنانچہ ان دونوں مثالوں سے سماجی سطح پڑھے لکھے افراد اور اخبارات سے جڑے ہوئے عوام و اشراف اردو زبان کے اسیر ہوتے چلے گئے۔ اردو ادیبوں کا رجحان بھی اس طرف ہونا یقینی تھا۔ گارساں دتاسی لکھتے ہیں:

حکومت برطانیہ ہندوستان میں انگریزی زبان کی اشاعت کرنے کا جی جان سے جتن کر رہی ہے۔ اسی غرض سے میجر ڈبلیو آر ایم ہالرائیڈ نے (جو محکمہ تعلیم پنجاب کے ناظم ہیں اور جس کی اُردو فارسی اور عربی واقفیت دیسی لوگوں میں ضرب المثل ہے) اردو میں ایک کتاب لکھی ہے، جو نستعلیق خط میں آج کل لاہور میں زیر طبع ہے۔ کتاب کا عنوان ہے: "انگریزی کو کس طرح بولنا اور لکھنا چاہیے۔ (9)

یہاں پر ایک اور تعلیمی زاویہ پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ انگریز حکمرانوں نے 1857 میں اپنے زیر تسلط تین بڑی پریزیڈنسیوں کلکتہ، مدراس اور بمبئی میں 1857 میں تین بڑی یونیورسٹیاں قائم کی تھیں جن کے زیر انتظام چلنے والے کالجز میں انگریزی تعلیم میں مشرقی اور دکنی علاقوں کے لوگوں کی دلچسپی انگلش زبان میں علوم کی طرف رہے۔ شمالی ہندوستان میں ایک تو علی گڑھ میں قائم مسلمانوں کی تعلیمی تحریک اور دوسرا لکھنوا ور دیگر علاقوں میں اشرافیہ اور پڑھنے لکھنے والے افرد کی دلچسپی مشرقی علوم کی طرف ہونے کے باعث ان علاقوں میں اردو زبان کو بدلا جانا فوری آسان نہ تھا۔ چنانچہ ان علاقوں کے کالجوں کا الحاق کرنے کے لئے اول الذکر یونیورسٹیوں کی بجائے نئی یونیورسٹیوں کا منصوبہ قابل عمل بنانا ضروری سمجھا گیا۔ مثال کے لئے لکھنو کا کیننگ کالج (1864)، گورنمنٹ کالج لاہور (1864) اور علی گڑھ کا محمڈن اینگلو اورینٹل کالج (1875) کا الحاق سامنے رکھا جائے تو نئی یونیورسٹیوں کی ضرورت اور اہمیت واضح ہوتی ہے۔ چنانچہ 1882 میں پنجاب یونیورسٹی لاہور اور 1887 میں الہ آباد یونیورسٹی کا قیام عمل میں لایا گیا اور کیننگ کالج و دیگر کا الحاق پنجاب یونیورسٹی سے کیا گیا۔ (10)۔ دوسری طرف علی گڑھ مسلم کالج اور بنارس کا ہندو کالج کا الحاق کر دیا گیا (جو بعد میں الگ سے یونیورسٹیاں بن گئے تھے۔)۔ پنجاب یونیورسٹی کے علمی، ادبی، اور اعلیٰ درجے

کے ادارے کے فرائض پر بات کرتے ہوئے عبداللہ یوسف علی لکھتے ہیں،

اول اول اس سوال پر کسی قدر بحث ہوئی کہ آیا پنجاب یونیورسٹی صرف مشرقی علوم کو ترقی دے (گی) لیکن پھر یہ دانشمندانہ فیصلہ کیا گیا کہ یہ دیسی زبانوں کے ذریعے سے مغربی علم کی اشاعت کرے اور مستند مشرقی ادبیات کے مطالب کو ترقی دے۔ تعلیم کے مطابق پنجاب یونیورسٹی کے خیالات اور ارادوں میں پرانی یونیورسٹیوں کے عمل سے ایک حد تک ضرور فرق آ گیا لیکن مسلمانوں، آریوں اور بعد میں سکھوں کے فرقہ وار مدرسوں اور کالجوں کے قیام سے مذہبی تعلیم کو رواج دینے کی صورت پیدا ہو گئی۔ (11)

اب حکومت کی طرف سے یہاں یہ جواز بھی سامنے لایا جاسکتا ہے کہ پنجاب یونیورسٹی میں پنجابی زبان کی بجائے اردو کا نفاذ اس لئے بھی ضروری تھا کہ اردو سپیکنگ افراد اور اداروں کو اس یونیورسٹی کے ذریعے امتحانات دینے میں آسانی رہے۔ اس طرح انیسویں صدی کے آخر تک تعلیمی سطح پر اردو نے مقامی زبانوں کی جگہ لے لی اور اس فیصلے کو اشرافیہ کی تائید کے باعث لاگو کر دیا گیا۔ انیسویں صدی کے آخری ربع میں سکولوں اور عوامی سطح کی تعلیم کا لسانی میڈیم دیکھنے کے لئے پرکاش ٹنڈن کی ایک کتاب 1961 میں انگلینڈ سے پنجاب سینچری کے نام سے انگلش میں شائع ہوئی تھی جس کے مطالعے سے گجرات اور اپر پنجاب کے عوامی زندگی کے روز وشب، لسانی، تہذیبی اور تعلیمی جہات کا سو سالہ ریکارڈ محفوظ ہو گیا ہے۔ اس کتاب (کے ترجمے) کے مندرجات سے ایک اقتباس مقالے کے مندرجات کو اہم لسانی زاویہ فراہم کرتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں،

میرے سکول کا نام گورنمنٹ ہائی سکول گجرات تھا۔۔۔میرے والد کے زمانے کا انگریز ہیڈ ماسٹر جاچکا تا۔ اس کی جگہ ایک ہندوستانی متعین تھا۔ پرائمری اور مڈل تک تعلیم اردو زبان میں دی جاتی تھی مگر ہائی سکول میں ذریعہ تعلیم انگریزی تھا۔۔۔ابتدائی کلاسوں میں ذریعہ تعلیم اردو تھا لیکن آخری پانچ برسوں میں انگریزی سیکھنی ہوتی تھی اور سنسکرت، فارسی، عربی سے ایک زبان بطور اختیاری مضمون رکھنا پڑتی تھی۔۔۔(12)

بیسویں صدی کے شروع سے پنجاب میں تعلیم اور دفاتر کی زبان اردو بن گئی۔ موجودہ

مغربی پنجاب میں اردو کی ادبی روایت مضبوط ہونا شروع ہوگی۔ پنجاب کا ایک بڑا شاعر علامہ محمد اقبال لاہور آکر اپنی شاعری کا آغاز اردو زبان میں کرتا ہے تو بجا طور پر کہا جاسکتا ہے تعلیمی نظام اور اشرافیہ کے اپنا لینے کے باوصف اردو کی ترقی کی رفتار تیز ہوئی اور مقامی زبانیں ان دو سطوح پر پیچھے ہٹتی چلی گئیں۔ البتہ عوامی سطح پر بالائی پنجاب کے علاقوں میں پنجابی اور جنوبی علاقوں میں سرائیکی زبان عوامی بول چال کے سنگھاسن پر متمکن رہیں۔ 1947 میں تقسیم ہندوستان، جو اصل میں پنجاب کے اضلاع کی آبادیوں کو تقسیم کرگئی، اس کے بعد مشرقی پنجاب (انڈیا) میں پنجابی زبان، گورمکھی کی تحریری صورت میں تعلیمی اداروں میں قائم کردی گئی لیکن پاکستانی پنجاب میں صرف اردو زبان کو قومی زبان کا درجہ دے کر پورے ملک میں نافذ کردیا گیا۔ موجودہ عہد کے پنجاب میں اشرافیہ کی زبان انگریزی اور اردو ہے جو تعلیمی زبانیں بھی ہیں۔ عوام کی شہری آبادی آہستہ آہستہ اردو کو بچوں کی مادری زبان بنانے میں دلچسپی رکھتی ہے جبکہ پنجاب کے دیہات میں پنجابی اپنی کئی بولیوں، اور جنوبی پنجاب سرائیکی، اپنی چند ایک بولیوں کے ساتھ بول چال کی صورت میں رائج ہیں۔ مقامی شعرا ان دو زبانوں میں ادب کی ترویج و تخلیق میں مصروف ہیں لیکن اردو زبان میں میں ادب کی تخلیق زیادہ مروج ہے۔ پنجاب میں صحافت بھی اردو زبان میں عوام کو میسر ہے اس لئے اردو یہاں کی عام آبادی کے لئے نامانوس زبان نہیں ہے۔

حوالہ جات وحواشی

1۔ بولی اور زبان پر تفصیل سے بحث، راقم کے ایک تحقیقی مضمون سے دیکھی جا سکتی ہے جس کا حوالہ یوں ہے۔ ساجد جاوید، بولی اور زبان، افتراق، وظائف اور حدود، مطبوعہ دریافت، 12 (اسلام آباد، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، 2013) ص 70 تا 80

2۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر،۔ (تاریخ ادب اردو جلد دوم (لاہور، مجلس ترقی ادب، 1994، طبع دوم) ص 27

3۔ اس موضوع پر مزید مطالعہ راقم کے اس مضمون سے سود مند ہو سکتا ہے۔ ساجد جاوید، ماقبل نوآبادیاتی عہد میں زبان حکمرانی کی تشکیل، مطبوعہ جرنل آف ریسرچ 26 (ملتان، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، 2014) ص 89-102

4۔ سمیع اللہ ڈاکٹر، فورٹ ولیم کالج۔۔۔ایک مطالعہ۔ (فیض آباد، نشاط آفسیٹ پریس، ٹانڈہ، 1989) ص 3

5۔ برنارڈ ایس کوہن نے اس کے لیے لنگویج آف کمانڈ کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اس اصطلاح کی مزید وضاحت کے لئے راقم کے پی ایچ۔ڈی کے مقالے کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ مزید بحث کے لئے راقم کا ایک مضمون بعنوان ماقبل نوآبادیاتی عہد میں زبان حکمرانی کی تشکیل، گل کرسٹ کا اہم کارنامہ دیکھا جا سکتا ہے جو بہاءالدین زکریا یونیورسٹی ملتان کے شمارہ نمبر 26/2014 میں شائع ہو چکا ہے۔

6۔ تفصیل کے لیے پنجابی ادب کی تاریخ ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

7۔ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، نوآبادیاتی عہد کا نظام تعلیم، مختصر نوٹ، مضمون مطبوعہ بازیافت، 30، (لاہور، پنجاب یونیورسٹی،) ص 474

ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، نوآبادیاتی عہد کا نظام تعلیم، ص 475

8۔ گارساں دتاسی، تاریخ ادبیات اردو، لیلیان سیکستن نازرو (اردو مترجم) (کراچی، پاکستان اسٹڈی سنٹر، جامعہ کراچی، فروری 2015) ص 61

9۔

10۔ عبداللہ یوسف علی، انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ، (لاہور، دوست ایسوسی ایٹس، 1994) ص 277

11۔ عبداللہ یوسف علی، انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ، ص 33

12۔ پرکاش ٹنڈن، پنجاب کے سو سال، ترجمہ رشید ملک، (لاہور، فکشن ہاؤس، 2018، اشاعت سوم) ص 124

حصہ دوم

اردو لسانیات اور مستشرقین

2.1

ماقبل استعماری عہد اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی لسانی ضرورتیں

اٹھارھویں صدی عیسوی سے قبل ہی ہندوستان میں مختلف وجوہات کی وجہ سے مختلف اقوام مغرب آ چکی تھیں۔ ان میں پرتگالی، ولندیزی (ہالینڈ کے لوگ) فرانس، انگلستان، جرمنی اور ڈنمارک کے افراد شامل تھے۔لیکن برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی بہتر حکمت عملی، سازگار ملکی حالات اور عسکری قوت کے رکھنے کے باعث اٹھارھویں صدی میں ہندوستان کے کافی علاقوں میں پھیلنا اور پھولنا شروع ہو گئی۔ ۱۶۰۰ء میں لندن کے بے شمار تاجروں نے اپنے شہنشاہ کی اجازت سے ہندوستان کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی کی منظوری حاصل کر لی تھی اور کنگ جیمز اول کی سفارش پر شہنشاہ ہند جہانگیر سے ایک وفد کیپٹن ہاکنز کی صدارت میں ملا اور ہندوستان میں آزاد تجارت کی اجازت طلب کی۔ جہانگیر نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو تجارت کی اجازت دے دی (بعد میں یہ اجازت منسوخ کر دی گئی تھی)۔ سورت میں اس اجازت کے نتیجے میں ہی پہلی تجارتی فیکٹری بنائی گئی تھی۔ آہستہ آہستہ مشرقی ساحل پر شمالی سرکارز (Northern Sarkars) غالب ہوتی چلی گئیں اور کمپنی قابض اور مضبوط ہوتی چلی گئی۔

۱۷۵۷ء میں جنگ پلاسی کی فتح نے ہندوستان کو بتا دیا تھا کہ اب بنگال کے صوبے کے مالک نہیں رہے اور طاقت کا محور انگریزوں کی طرف منتقل ہونے جارہا تھا۔
ہندوستان میں مغل حکومت میں (سولھویں صدی سے) یورپی افراد و اقوام کی انفرادی، اجتماعی آمد و رفت کا سراغ ملتا ہے۔ واسکوڈے گاما (۱۴۹۸ء) کی ہندوستان آمد کے بعد یورپ کی اقوام کو ہندوستان اور اس کے آسان بحری راستے سے آگاہی حاصل ہوئی تو پرتگالی قوم سب سے پہلے ہندوستان کی طرف عازم سفر ہوئی۔ پرتگالی قوم اس عہد کے یورپ میں سیاسی و معاشی طور پر اہمیت کی حامل تھی۔ ۱۵۵۰ء میں پرتگالی ہی سب سے پہلا پرنٹنگ پریس ہندوستان لائے۔ اس پرنٹنگ پریس کو ہندوستان کے جنوبی حصے میں ہی نصب کیا گیا کیوں کہ اسی حصے میں پرتگالی متمکن ہوئے۔ پہلی ہندوستانی کتاب مالابار کی تامل زبان میں ۱۵۵۷ء میں یہاں شائع ہوئی۔ (۱) سولھویں صدی کے اواخر تک ہندوستان کی مقامی بولیوں اور زبانوں پر پرتگالی زبان اثر انداز ہونا شروع ہوئی۔ حتیٰ کہ دکنی زبان (اردو) میں پرتگالی الفاظ کا خاصا ذخیرہ شامل ہو گیا تھا۔ موجودہ اردو زبان میں پرتگالی الفاظ کا خاصا ذخیرہ شامل ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر رضیہ نور محمد لکھتی ہیں:

> پرتگالی [زبان] کا اثر تمام ہندوستان کی زبانوں پر پڑا۔ خصوصاً جنوبی ہند کی دراوڑی زبانوں اور مرہٹی، بنگالی، آسامی زبانوں پر پرتگالی کے اثرات نہایت گہرے ہوئے۔ اسی طرح اردو بھی پرتگالی سے متاثر ہوئی۔ بہت سے پرتگالی الفاظ آج بھی اردو میں بے تکلف بولے جاتے ہیں اور ہمیں محسوس بھی نہیں ہوتا کہ وہ پرتگالی ہیں۔ (۲)

سترھویں صدی میں دیگر یورپی اقوام جن میں جرمن اور انگریز سرِ فہرست ہیں، ہندوستان میں وارد ہوئے۔ ابتداً ان اقوام کے پیشِ نظر ہندوستان کی تجارتی منڈیوں پر اپنی مصنوعات کی دھاک بٹھا کر قبضہ کرنا تھا۔ اس عہد تک دور دور تک ہندوستان پر حکمرانی کا خیال ان کے پیشِ نظر نہ تھا۔ اس عہد میں تجارتی مقاصد اور عوامی سطح پر اپنی بات چیت اور مصنوعات کا تعارف پہنچانے کے لیے مقامی زبان کے استعمال اور تحصیل کی طرف ان کی توجہ

مبذول ہوئی۔ ۱۵۹۹ء میں شاہ برطانیہ نے انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستان تجارت کے لیے چارٹر جاری کیا تھا۔ جس کے تحت بعد میں انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی بھی میدان میں آ گئی تھی۔ ہندوستان کے شہر سورت میں انگریزوں نے پہلی تجارتی فیکٹری لگائی۔[۳] ۱۶۱۵ء میں تھامس رو (انگریز) مغل دربار میں حاضر ہوا اور شہنشاہ جہانگیر سے انگلش ایسٹ انڈیا کے لیے تجارتی مراعات کا مطالبہ کیا۔ اس دورے سے اس انگریز سفیر نے مقامی دلال کے کردار سے، جو کہ ترجمان کا کام دے رہا تھا اطمینان محسوس نہیں کیا۔ اس واقعے سے تھامس رو کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا شائد مقامی افراد وفاداری، خلوص اور سچائی کے ساتھ ان کو خدمات نہ دے سکیں اور یہ بھی کہ ان کی بات کو بادشاہ تک جانے کس انداز میں پیش کریں۔ چناں چہ اس نے مقامی اور سرکاری زبان کی تحصیل کو کمپنی کی تجارت کے مقاصد کے لیے ضروری خیال کیا۔ تھامس رو نے ایک اور حقیقت کو بھی بھانپنے میں دیر نہیں لگائی کہ فارسی زبان سے ایسٹ انڈیا کمپنی ترقی کی بجائے تباہی کی طرف جانا شروع کر دے گی۔، چناں چہ اس نے فارسی کے مقابل کسی ایسی زبان کی طرف بھی توجہ دینا شروع کی جو عوامی بول چال کی ضروریات بھی پورا کرنے کی اہل ہو اور مغل سرکاری زبان سے علیحدہ بھی۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیّر کے مطابق:

> ۱۶۱۵ء میں طامس رو جہانگیر کے دربار میں تجارتی مراعات لے کر داخل ہوا تو اسے جو سب سے بڑا عملی مسئلہ در پیش ہوا، اس کے متعلق اس نے کمپنی کو لکھا ایک اور سخت تکلیف مجھے جو سہنی پڑی وہ ترجمان کی کمی تھی۔ کیوں کہ دلال وہی کچھ کہیں گے جو انھیں پسند ہوگا، بلکہ وہ بادشاہ کے خطوط میں ترمیم کر دیں گے۔۔۔ اس نے فی الفور بھانپ لیا تھا کہ فارسی سے ناواقفیت اس پورے نوآبادیاتی منصوبے کو چوپٹ کر سکتی ہے، جسے ابھی چند تجارتی مراعات کے پردے میں چھپائے رکھنا قرینِ مصلحت سمجھا گیا تھا۔[۴]

تھامس رو دراصل مقامی دلال کی ترجمانی سے مطمئن نہیں تھا۔ اس کے خیال میں دلال مغل حکمرانوں کو وہی بتائیں گے جو ان کو پسند ہوگا۔ کہ وہ اتنی دل جمعی اور دل چسپی کے ساتھ مغلوں کے گوش گزار نہ کر دیں، جو کہ انگریزوں کا منتہا ہوگا چناں چہ اس نے وہ لوگ فارسی

زبان کی ترجمانی کے لیے اپنے ساتھ رکھے جو ہندوستانی نہیں تھے۔ ان کا تعلق آرمینیا، اٹلی
اور یونان سے تھا (تاکہ اس کو کسی قسم کا دھوکہ نہ ہو)۔ تھامس رو کے ساتھ ساتھ ایک اور
انگریز کا تذکرہ بھی دل چسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ جہاں گیر، مغل بادشاہ کے عہد میں (۱۶۱۶ء)
Tom Coryate نامی ایک انگریز درویش کا پتا چلتا ہے جو بہ قول جان فریر (John
Fryer) سترھویں صدی میں ایران اور ہندوستان کی سیاحت کے لیے آیا اور مغل بادشاہ
کے دربار میں "مغل انڈوستان" بولتا تھا۔ اس کا ہندوستان میں موجود ہونا اور مقامی زبان بولنا دو
طرح سے اہم ہے، ایک تو یہ کہ اس صدی میں انفرادی طور پر بھی یورپی افراد کی آمد ورفت
شروع ہو چکی تھی دوسرے یہ کہ مغل دربار میں اردو زبان اپنی جگہ بنا چکی تھی۔ اس سے ظاہر
ہوتا ہے کہ جہانگیر بادشاہ کے عہد میں ہندوستانی زبان (اردو) باقاعدہ زبان کے طور پر نہ
صرف اپنی جگہ بنا چکی تھی بلکہ یہی وہ زبان ہوگی جس کی اہمیت اور ضرورت کو تھامس رو نے
تجارتی مقاصد کے لیے ضروری خیال کیا تھا۔ بہ قول عتیق صدیقی:

> جان فریر (John Fryer) جس نے سترھویں صدی کی تیسری دہائی میں
> ہندوستان و ایران کی سیاحت کی تھی، ایک انگریز درویش 'Tom Coryate'
> کا ذکر کرتا ہے جو ۱۶۱۶ء میں ہندوستان میں تھا اور "انگلش فقیر" کے لقب سے
> مشہور تھا۔ اس کو "انڈوستان زبان" پر پوری قدرت حاصل تھی۔ جان فریر
> حیرت و مسرت کے ساتھ لکھتا تھا کہ اس زبان میں مغل اعظم کے حضور میں داد
> خطابت دیتے ہوئے اسے قطعاً جھجک محسوس نہ ہوئی۔ (۵)

۱۶۳۰ء میں مسٹر کورج کی فارسی، ہندوستانی، انگریزی اور پرتگالی زبانوں کا لغت لکھا
گیا جس کا تذکرہ جارج گریرسن کے "لسانیاتی جائزہ ہند" میں موجود ہے لیکن گریرسن اس
نسخے کی کوئی کاپی نہ دیکھ سکا۔ چناں چہ یہ اہم لغت جو تاریخ میں حوالے کے طور پر تو موجود
ہے۔ لیکن دستیاب نہیں ہے، کسی بھی لغت وقواعد نویسی کی روایت کا پیش رو قرار نہیں دیا جا
سکتا۔ سترھویں صدی کے وسط تک لغت وقواعد کی کوششیں شروع ہونے کا مطلب یہ ہے کہ
مقامی انڈوستان زبان کو سیکھنا تجارتی مقاصد اور مغل دربار میں رسائی کے لیے بھی اہم سمجھا جا

شروع ہو چکا تھا۔ ۲۲ دسمبر ۱۶۷۷ء کو انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کے کورٹ آف ڈائریکٹرز نے مدراس کے سینٹ جارج قلعے کے افسران اور ملازمین کو ایک فرمان جاری کیا جس کو گریرسن کے الفاظ کے ترجمے کے طور پر نقل کیا جاتا ہے:

> اس کا اعادہ کیا جاتا ہے کہ کمپنی کے جو ملازمین فارسی سیکھیں گے ان کو دس پونڈ اور جو انڈستان زبان سیکھیں گے، ان کو بیس پونڈ بہ طور انعام دیئے جائیں گے۔ نیز یہ کہ اس زبان کی تعلیم دینے والے کسی مناسب آدمی کا تقرر بھی کیا جائے۔ (۲)

سترھویں صدی عیسوی کے شروع تک شمالی ہندوستان میں ابھی تک اردو نثر کا کوئی بڑا فن پارہ سامنے نہیں آیا تھا؛ جس سے یہ پتا چل سکے کہ یہ بول چال کی زبان تحریری طور پر رائج ہو چکی تھی یا نہیں۔ چوں کہ ابھی تحریری سطح پر اس نوزائیدہ زبان کو بروئے کار لایا جانا شروع نہیں ہوا تھا اس لیے مقامی طور پر اس زبان کی لغت اور قواعد کی ترتیب و تالیف کی طرف دھیان نہ دیا جانا فطری بات تھی۔ شمال اور جنوب ہر دو خطوں میں بھی ہندوستانی زبان کی طرف افراد نے توجہ نہ کی تھی۔ چناں چہ سولھویں صدی میں یورپی افراد نے اپنے طور پر ہندوستانی لغت وقواعد کی ترتیب و تالیف پر توجہ کی۔ اوّل اوّل سیاحت کے لیے آنے والے غیر ملکی مہمانوں نے ہندوستان کے نئے کلچر اور مشرقی علوم وفنون کو جاننے کے لیے مقامی زبانوں کی طرف توجہ کی۔ اس ضمن میں یہ بات بھی اہم ہے کہ حکمران طبقے اور اشرافیہ سے راہِ رسم بڑھانے کے لیے عربی فارسی اور سنسکرت زبانوں کو سیکھا جانا شروع ہو گیا۔ فارسی سیکھنے کی دوسری وجہ بھی تھی کہ یہ مقامی حکمرانوں کی مذہبی زبانوں کے طور پر بھی ایک اہمیت کی حامل تھیں۔

اٹھارھویں صدی میں انگریزوں اور دیگر یورپی اقوام کا دخل ہندوستان میں بڑھ گیا تھا۔ شروع میں یہ قوم تجارت کی غرض سے ہندوستان آئی۔ اس وقت تک یورپی اقوام کے پیش نظر ہندوستان کو بہ طور تجارتی منڈی کے قبضہ کرنا تھا تا کہ اتنے بڑے ملک کو اپنی تجارت اور اشیا کی خرید وفرخت کے ذریعے قابو کیا جاسکے۔ انگریز قوم کی خوش قسمتی اور ہندوستان کے عوام کی بالعموم اور مغلوں کی بالخصوص بدقسمتی یہ بنی کہ زبوں حالی کے اس منتشر سماجی ماحول میں

انگریز کے مقاصد تجارت سے بڑھ کر حکمرانی کے طرف ہو گئے۔ تجارت ہو یا حکمرانی، ہر دو صورتوں میں ان مقامی زبانوں کی تحصیل اور نشر و اشاعت ضروری تھی جو ملک کے طول و عرض میں بولی سمجھی جا سکتی تھی۔ بعد میں آنے والے سالوں میں یہ بات ثابت ہوئی کہ ہر فاتح قوم کی طرح انگریز قوم نے بھی مقامی کلچر کے سب سے توانا عنصر یعنی سرکاری زبان کو زک پہنچائی اور فارسی زبان کو یکسر ختم کر ڈالا۔

مستشرقین اور بالخصوص انگریز قوم کے سفارتکاروں، تاجروں، مشنری پادریوں اور سیاحوں نے مقامی لسانی روایت کا بہ طور خاص مطالعہ شروع کر دیا۔ مقامی لوگوں میں گھلنے ملنے اور ان کو اپنے سیٹ اپ میں داخل کرنے کے لیے مغربی افراد نے زبان کا ایک ایسا ڈسکورس تیار کیا جس نے نہ صرف کمپنی کے تجارتی معاملات میں مدد دی بلکہ اس کی مدد سے عسکری ضرورتوں، تجارتی عوامل اور دفتری زبان کے طور پر بھی اس زبان نے ان کی مدد کی۔ یہ زبان انگریزوں کو ایسی راس آئی کہ ۱۹ویں صدی میں یہ زبان برِصغیر میں بالعموم اور مستشرقین کے لیے بالخصوص علمی ضرورت بن گئی اور اسے اختیار کیے بنا کوئی چارہ نہ رہا۔ سب سے پہلے سنسکرت کی طرف بھرپور توجہ دی گئی۔ زبان کی عوامی اور ادبی ہر دو سطح پر مطالعہ اور تحقیق کا کام شروع کر دیا گیا۔ زبانوں کی گریمر (قواعد) اور ڈکشنری (لغت) کی طرف خاص توجہ دی گئی۔ عام طور پر اور ولیم جانز سے اس روایت کا آغاز سمجھا جاتا ہے۔ کیٹلر نے ''ہندوستانی زبان'' کی پہلی گریمر لکھی۔ ولیم جونز کی اہمیت یہ ہے کہ اس نے ہندوستان آ کر سنسکرت کا دوسری آریائی زبانوں سے رشتہ دریافت کیا اور یوں یہاں 'تقابلی لسانیات' کو رواج ملنا شروع ہوا۔

شروع شروع میں ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کے ملازمین کے لیے تجارتی مقاصد کے تحت مقامی زبانوں کی تحصیل کی ضرورت محسوس کی گئی جو آئندہ دَور میں حکمرانی اور مشنری مقاصد کے لیے ضروری خیال کی گئی۔ چناں چہ اس عہد میں لسانِ عامہ اور بول چال کے بنیادی و ضروری جملے سیکھنے کی طرف مغربی افراد کا رجحان ہوا۔ ان ضروریات کو پورا کرنے کے لیے جون جوشوا کیٹلر اور ان کے ہم عصر، بنجمن شلز کی قواعد اور بائبل کے تراجم، جارج ہیڈلے کی

لسانی کاوشیں، غیر ملکیوں کو مشرقی لسانی روایت سکھانے میں معاون بنیں۔ اس عہد کے مستشرقین نے آنے والے عہد کے اردو قواعد ولغات نویسوں کے لیے رستہ ہموار کیا۔ فرگوسن کی لغت، لی بی ڈف کی قواعد اور ولیم جونز کی مشرقی زبانوں کے متون کے مطالعے کی کاوشیں اور جان گلکرسٹ کی قواعد ولغات کے معیاری نمونے دراصل مذکورہ بالا افراد کی کاوشوں کی وجہ سے معیاری بنے۔

مستشرقین اور بالخصوص انگریز قوم کے سفارت کاروں، تاجروں، مشنری پادریوں اور سیاحوں نے مقامی لسانی روایت کا بہ طور خاص مطالعہ شروع کر دیا۔ سب سے پہلے سنسکرت کی طرف بھرپور توجہ دی گئی۔ زبان کی عوامی اور ادبی ہر دو سطح پر مطالعہ اور تحقیق کا کام شروع کر دیا گیا۔ زبانوں کی گریمر (قواعد نویسی) اور ڈکشنری (لغت نویسی) کی طرف خاص طور پر توجہ دی گئی۔ عام طور پر کیٹلر کے مخطوطات کی دستیابی سے ہندوستانی قواعد نویسی کی اوّلیت کا سہرہ کیٹلر کے سر باندھا گیا ہے۔ دوسری طرف ولیم جانز نے سنسکرت اور یورپی زبانوں کے تقابل سے تقابلی لسانیات کا آغاز کیا۔ جان جوشوا کیٹلر کی گریمر اس لحاظ سے اہمیت کی حامل ہے کہ یہ اس عہد میں مرتب ہوئی جب اردو شاعری کی روایت دکن سے دہلی میں داخل ہو رہی تھی۔ یعنی کیٹلر کے لیے بہ طور سیاح اور سفارت کار جو زبان بالکل نئی تھی وہ شاعری کے طور پر شمالی ہند کے لوگوں کے لیے ادبی لحاظ سے نئی چیز تھی۔ (یہ زبان ریختہ کہلائی)۔

اس عہد میں مقامی روایت کا رُخ ادب اور معیاری زبان کی طرف تھا جب کہ مستشرقین کا رُخ زبان کے عوامی روپ کی طرف تھا۔ لیکن مغربی افراد کا مطمع نظر خالص لسانیاتی تھا جس میں زبان کا میکانکی و افادی پہلو اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ ان مستشرقین نے اوّلاً ضرورت کے لیے زبان (مقامی) کو اختیار کیا۔ ثانیاً انتظامی ضروریات زبان کی طرف دل چسپی کی وجہ بنیں۔ ثالثاً ہندوستانی زبان کی تحصیل کو مشرقی ذہن کو سمجھنے کے لیے اس زبان کو بہ طور Tool استعمال کیا گیا۔

اردو قواعد ولغت نویسی اور مستشرقین کی ابتدائی کاوشیں

سولھویں صدی سے یورپی ممالک کے پادری حضرات مشنری مقاصد کے تحت تبلیغ کے فریضے کے لیے یہاں آنا شروع ہوئے اور یہاں آ کر مقامی علاقائی بولیوں اور زبانوں کو سیکھنا شروع کیا۔ زبانوں کے سیکھنے کا مقصد اپنے مذاہب کی تبلیغ تھا چناں چہ اس مقصد کے لیے ہندوستان کے جنوبی علاقے خاص طور پر ان پادریوں کی آماجگاہ بنے۔ مقامی زبانوں کو سیکھنے کے بعد ان زبانوں میں انجیل کے تراجم نے ان مقامی زبانوں کی بدیسی افراد کے لیے اہمیت کو دو چند کر دیا۔ انجیل اور بائبل کے تراجم کے لیے عوامی بولیوں کے زیادہ معیاری زبانوں کا استعمال ناگزیر تھا۔ چناں چہ زبانوں کے معیاری روپ اختیار کرنے کے لیے مقامی زبانوں کی قواعد اور لغت کی تلاش شروع ہوئی تو ان افراد کو اس سلسلے میں کوئی لغت و قواعد موجود نہ تھی جسے بہ طور نمونہ سامنے رکھ کر زبان کی تحصیل کا عمل شروع کیا جا سکے یا کوئی ایسی بہتر کتاب مرتب کی جا سکے۔ چناں چہ اس دور میں آنے والے عیسائی مشنریوں نے سنسکرت، عربی، فارسی اور ہندوستانی زبانوں کی ''لغات اور قواعدی کتب'' کی ترتیب و تالیف پر خاص توجہ کی۔ عام طور پر اس دور میں قواعد کے لیے علیحدہ سے کتب نہ لکھی گئیں بلکہ لغات کی کتب کے دیباچے یا مقدمے میں ہی قواعد کے اصول دے دیے جاتے تھے۔

مغل بادشاہ اکبر کے عہد میں ان مشنری مبلغوں نے ہندوستان کی اس عوامی بولی کی طرف توجہ کی جو بڑی تیزی سے عوام و خواص کے بول چال میں آ رہی تھی اور جسے ابھی کسی ایک متفقہ نام سے نہیں بلکہ مختلف علاقوں کی نسبت سے علاقائی ناموں سے پکارا جاتا تھا۔ یہ زبان ہندی، ہندوستانی، دہلوی، زبان ہندوستان اور ہندی کے ملتے جلتے ناموں سے بولی اور پہچانی جا رہی تھی۔ اس زبان کا چلن جنوبی ہند کے علاقوں میں عام تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دکن کی ریاستوں نے شمالی ہند کے برعکس مقامی ''دکنی زبان'' کو سرکاری زبان کے درجے پر فائز کر رکھا تھا۔ اہم بات یہ ہے کہ شمالی ہندوستان کے مرکز دہلی کے عوام میں بھی فارسی سے گریز اور اس نئی ہندوی زبان کے بارے میں انتخاب اور اپنائیت کا رویہ مقبول ہو رہا تھا، چناں چہ

ان افراد نے آنے والے عہد میں تیزی سے مقبول ہوتی اس زبان کو اپنے تبلیغی مقاصد کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ چناں چہ عہدِ اکبری میں ہی ایک ایسے مستشرق کا نام ملا ہے جس نے پہلی مرتبہ ہندوستانی، اردو، فارسی لغت مرتب کی تھی۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے بہ قول:

> سولھویں صدی کے مصنفین میں ایک نام جیرونیموزاویر (Jeronemo Xavier) کا ہے جو حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں Companions of Jesus کی تنظیم سے متعلق تھا۔ اور جہانگیر کے دربار میں بھی پیش ہوا تھا۔ اس کا قیام آگرہ میں تھا جہاں وہ سن ۱۵۸۶ء اور سن ۱۶۱۵ء کے درمیان موجود تھا۔ اس نے ہندوستانی فارسی لغت کا ایک مجموعہ مرتب کیا۔ یہ اُن کتابوں میں شامل ہے جو سن ۱۵۹۹ء سے قبل کی تصنیف ہیں۔ اس کا پورا نام "Vacabularium Portugalico Hindustano Persicum" ہے اور اس اعتبار سے اس کا شمار اردو کی قدیم ترین لغات اور قواعد اردو میں ہوتا ہے۔ (۷)

اگناسو آرکامونے (Ignacio Arcamone) نام کا دوسرا مصنف سترھویں صدی میں سامنے آتا ہے۔ جس نے دکھنی (اردوئے قدیم) اور کون کنی لغت مرتب کیا تھا۔ اس مصنف نے بھی عیسائیت کے تبلیغی مشن کے مقاصد کے تحت اردوئے قدیم کے لغت پر کام کیا۔ اس لغت میں اس نے اس بات کا اہتمام کیا کہ دکھنی کے ساتھ ساتھ اس کے لاطینی مترادفات بھی ساتھ ساتھ دیئے تا کہ لاطینی زبان جاننے والے ان مترادفات کو بروئے کار لا کر مقامی زبانوں کی تحصیل میں آسانی محسوس کریں۔ اس عہد کے طریقہ کار کے عین مطابق اس نے اس لغت میں قواعد کی بحثیں اور اصول بھی مرتب کر کے پیش کیے۔ بقول ابو اللیث صدیقی، ''اس کے رسالے میں قواعد بھی ہے اور لاطینی کون کنی لغت کے علاوہ ایک پوری فصل دکھنی اور کون کنی بولیوں کی خصوصیات پر لکھی گئی ہے۔''(۸) اس روایت کے بعد ہم مستشرقین کی اس کھیپ کی طرف بڑھتے ہیں جن کی اردو قواعد و لغات باقاعدہ دستیاب ہیں اور ان سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

حوالہ جات وحواشی:

1. M.Atique Siddiqi,Origins of modern Hindustani literature,(Aligarh,Naya kitab ghar,1962) P.177

۲۔ رضیہ نور محمد، مس، ڈاکٹر، اردو زبان و ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ (لاہور، مکتبہ خیابانِ ادب، اپریل ۱۹۸۵ء) ص ۱۳

۳۔ یہ معلومات رضیہ نور محمد کی محولہ بالا کتاب کے صفحہ ۳۴، اور عتیق صدیقی کی محولہ بالا کتاب میں کرانولوجی والے باب میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

۴۔ ناصر عباس نیر، مابعد نو آبادیات، اردو کے تناظر میں، (کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۱۳ء) ص ۸۱

۵۔ عتیق صدیقی، محمد، گل کرسٹ اور اس کا عہد (علی گڑھ، انجمن ترقی اردو (ہند)، ۱۹۶۰ئ ء) ص ۴۷

۶۔ جارج گریرسن، مشمولہ گل کرسٹ اور اس کا عہد، ص ۴۸

۷۔ ابو اللیث صدیقی ڈاکٹر، مقدمہ ہندوستانی گرائمر از بنجمن شُلزے (لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۷ء)، ص ۳

2.2

جون جوشوا کیٹلر، اردو کا پہلا قواعد نویس

جون جوشوا کیٹلر (Joan Josua Ketelaar) (۱۶۵۹ء-۱۷۱۸ء) کا نام اردو قواعد نویسی کی تاریخ میں اہمیت اور اوّلیت کا حامل ہے۔ ہندوستانی زبان یعنی اردو کی پہلی قواعد کی روایت میں یوں تو اور نام بھی گنے جاتے ہیں لیکن پہلی معلوم قواعد نے یہ جواز فراہم کیا ہے کہ ان کی قواعد کو اردو کی پہلی قواعد کہا جائے۔ کیٹلر جرمنی سپیکنگ پولینڈ کے ایک قصبے ایل بنگ (Elbing) میں ۱۶۵۹ء کو پیدا ہوا۔ اس کا باپ بہت زیادہ مالدار آدمی نہ تھا اور کتابوں کی جلد بندی سے روزی کماتا تھا۔ چناں چہ اس نے تھوڑا بڑا ہونے پر کیٹلر کو بھی ایک جلد ساز کے پاس ملازمت دلادی۔ کیٹلر وہاں سے کوئی چیز چرانے کے الزام میں معتوب ہوا تو وہ ایک دوسرے قصبے (Danzig) میں ایک دوسرے جلد ساز کے ہاں ملازم ہو گیا۔ کچھ عرصے کے بعد اس نے اپنے مالک کو زہر دے دیا۔ خوش قسمتی سے وہ مالک زہر سے جاں بحق نہ ہوا اور بچ گیا، لیکن کیٹلر کے لیے وہاں رہنا ناممکن بنا دیا گیا۔ چناں چہ یہاں سے بھی کیٹلر کو فرار ہونا پڑا۔ جرمنی کے ایک شہر سٹاک ہوم میں ان دنوں ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجارتی قافلے یورپی افراد کو معقول معاوضوں پر بھرتی کر کے ہندوستان بھیجتے تھے۔ کیٹلر نے روپوشی اور نئے

ملک میں قسمت آزمائی کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی ایمسٹرڈیم میں ملازمت اختیار کرلی اور اپنے نام کے ہجے جرمن تلفظ کے تحت بدل کر نئی شناخت سے اپنا کیریئر شروع کیا۔ ڈاکٹر غلام عباس گوندل اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

> ۱۶۸۲ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی [جرمنی] میں شپ مین کے طور پر ملازم ہوگیا۔ وہ بٹاویہ (جکارتہ) کے راستے ممبئی کے شمال میں سورت کی بندگاہ پہنچا۔ یہاں وہ کمپنی کلرک ہوا اور بعدازاں ترقی کر کے ۱۶۸۷ء میں اسسٹنٹ اور اسسٹنٹ سے کھاتہ دار (Book-Keeper) ہوا۔ بعد ازاں احمد آباد میں نائب ناظم تجارت اور ۱۷۰۰ء میں آگرہ میں ناظم تجارت مقرر ہوا۔ اگلے برس وہ جونیئر مرچنٹ بن گیا۔ ۱۷۰۵ء میں کافی کی خریداری کی غرض سے یمن کے شہر الخا (Mocha) کا تجارتی سفر کیا۔۔۔ اس نے عرب ممالک کا دوسرا سفر ۱۷۰۷ء میں کیا۔ اس بار وہ تجارتی مشن کا سربراہ تھا۔[1]

۱۶۸۳ء کے سال میں یورپ کے شہر میں قیام کرنے کے بعد کیٹلر پر ترقیوں کے دروازے کھلتے چلے گئے۔ ۱۶۹۶ء میں کیٹلر اسسٹنٹ سے ڈپٹی ہیڈ بن گیا اور احمد آباد سکونت اختیار کی۔ ۱۷۰۰ء میں جونیئر مرچنٹ بننے کے بعد ۱۷۰۶ء میں اس نے ملک عرب کا سفر کیا اور ۱۷۰۸ء میں ہندوستان واپسی پر سینئر مرچنٹ کے عہدے پر ترقی حاصل کی۔ ۱۷۰۸ء میں کیٹلر بہ طور سفارت نگار مغل بادشاہ بہادر شاہ کے دربار میں پیش ہوا۔ کیٹلر دو مغل بادشاہوں بہادر شاہ اور جہاندار شاہ کے درباروں سے منسلک رہا۔ ۱۷۱۸ء میں بندر عباس ایران کی بندرگاہ پر فوت ہوا۔ ایران میں بھی ۱۷۱۵ء میں بہ طور سفیر گیا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اسے فارسی اور ہندوستانی دونوں زبانوں میں مہارت تھی اور اس خوبی کی بنیاد پر وہ ایران کا سفارت کار بن کر وہاں گیا۔

کیٹلر فارسی اور ہندوستانی زبان میں مہارت رکھنے کی وجہ سے ہندوستانی زبان کی گریمر لکھنے کی طرف آمادہ ہوا۔ کیٹلر نے ہندوستانی زبان کی پہلی گریمر مرتب کی۔ اس گریمر کی خاص اہمیت یوں بھی سمجھی جاسکتی ہے کہ کیٹلر کے سامنے اس سے قبل گریمر کا کوئی نمونہ نہ

تھا۔ اس طرح اس گریمر کی تاریخی اہمیت یعنی کیٹلر اردو زبان کا پہلا قواعد نویس ہے، ہمیشہ رہے گی۔ کیٹلر کی قواعد ڈچ زبان میں لکھی گئی جس کا عنوان یہ ہے:

"Instructie ofte Onderwijsinghe Der Hindoustaanse en Persianse talen naven hare declinate enconjugatie, als mede hollandse maat en gewigten mitsgaders beduigdingh vergeleykinge, der Hindoustanse med de eeniger moorse namen etc. DOOR Joan Josua Ketlaar 1698.(2)

مولوی عبدالحق کی قواعد اردو کے دیباچے سے اردو دنیا کو کیٹلر کے نام اور کام سے آگاہی ملی۔ یہ بات اہم ہے کہ مولوی عبدالحق کی فراہم کردہ معلومات اس وجہ سے تسامحات کا شکار ہوئی کہ ان کی معلومات کا ذریعہ زیادہ تر جارج گریرسن کی کتاب *A Linguistic Survey of India* تھی، جن کی معلومات اپنے دور کے حوالے سے تو اہم ہوں گی لیکن آج کی تحقیق نے ان پر سوالیہ نشان لگا دئے ہیں۔ مولوی عبدالحق نے یہ انکشاف کیا کہ کیٹلر پروشیا کا باشندہ تھا اور اس نے لاطینی زبان میں ہندوستانی زبان کی پہلی گریمر لکھی جس کا زمانۂ تالیف ۱۷۱۵ء کے لگ بھگ ہے۔ ایک عرصے تک کیٹلر کی قواعد کی تالیف تاریخ ۱۷۱۵ء ہی صحیح تسلیم کی جاتی رہی۔ لیکن آج کی تحقیق میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ کیٹلر کی قواعد ۱۶۹۸ء میں لکھی گئی تھی۔ ایک عرصے تک مشرق کے ساتھ ساتھ مغرب بھی اس قواعد کی موجودگی سے بے خبر رہا۔

یو ٹریچٹ یونی ورسٹی (Utrecht University Netherland) میں Theology اور مشرقی زبانوں کے ایک پروفیسر ڈیوڈ میلیئس (DaVid Millius) نے ۱۷۴۴ء میں کیٹلر کے اس کتاب کا لاطینی ترجمہ شائع کیا اور اس ترجمے سے مغربی اور مشرقی دنیا کیٹلر کے اس کارنامے سے واقف ہوئی۔ کیٹلر کی گریمر کی اوّلیت کے بارے میں مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

جہاں تک تحقیق کی گئی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پہلا یورپین جس نے ہندوستانی زبان کے قواعد لکھے وہ جان جوشوا کیٹلر تھا۔ جو پرشیا کے شہر ایل بنگ میں پیدا ہوا۔ مذہب میں یہ لوتھر کا پیرو تھا۔ یہ شخص شاہ عالم بادشاہ (سنہ ۱۷۰۸ء۔۱۷۱۱ء) اور جہاں دار شاہ بادشاہ (سنہ ۱۷۱۲ء) کے دربار میں بہ طور ڈچ سفیر کے حاضر ہوا۔ سنہ ۱۷۱۱ء میں وہ ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ناظم تجارت بہ مقام سورت مقرر ہوا۔ وہ لاہور سے آتے اور جاتے وقت براہ دہلی آگرے سے گزرا لیکن یہ بالیقین نہیں کیا جا سکتا کہ وہ وہاں ٹھہرا بھی کہ نہیں، اگرچہ وہاں اہلِ ڈچ کا ایک کارخانہ سورت کے تحت میں موجود تھا۔ اس کا مشن لاہور کے قریب ۱۰ دسمبر سنہ ۱۷۱۱ء کو پہنچا۔۔۔ اس نے ہندوستانی زبان کے قواعد اور لغت پر کتاب لکھی جو ڈیوڈ مل نے سنہ ۱۷۴۳ء میں چھاپ کر شائع کی۔ قیاس یہ ہوتا ہے کہ کتاب اس نے ۱۷۱۵ء کے لگ بھگ تالیف کی ہو گی۔ یہ کتاب لیٹن میں ہے۔ (۳)

کیٹلر کی قواعد، ۱۶۹۸ء میں لکھی گئی۔ شروع دور میں یہ غلط فہمی محققین کے مضامین اور کتابوں میں موجود رہی کہ یہ کتاب لاطینی زبان میں لکھی گئی تھی۔ آج البتہ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ کیٹلر کی کتاب ۱۷۱۵ء میں نہیں بلکہ ۱۶۹۸ء میں لکھی گئی تھی۔ اور یہ بھی کہ یہ کتاب شروع میں ڈچ زبان میں لکھی گئی تھی۔ جسے ۱۷۴۳ء میں ڈیوڈ ملیئس نے لاطینی ترجمے میں پیش کیا۔ ۱۹۳۵ء میں پروفیسر جین فلپ ووگل (Jean Philippe Vogel) نے کیٹلر کی ہندوستانی قواعد پر ایک اہم مضمون لکھا جس کا عنوان تھا۔ Joan Josua Ketelaar of Elbing, an author of first Hindustani Grammar۔ یہ مضمون ۱۹۳۵ء میں لندن یونی ورسٹی کے بلیٹن آف دی سکول آف ساؤتھ ایشین اینڈ امریکن اسٹڈیز میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں پہلی مرتبہ یہ بات واضح کی گئی کہ کیٹلر کی قواعد، پہلی مرتبہ ۱۶۹۸ء میں لکھی گئی تھی اور اس کا مخطوطہ جرمن کے رائل آرکائیوز ہیگ میں موجود ہے۔

کیٹلر کی قواعد ۱۶۹۸ء میں لکھنؤ میں لکھی گئی۔ یہ غلط فہمی بھی اب ختم ہو گئی ہے کہ یہ کتاب لاطینی زبان میں لکھی گئی تھی۔ یہ کتاب ڈچ زبان میں لکھی گئی جسے

۱۷۴۳ء میں ڈیوڈ ملیئس نے ڈھونڈ کر شائع کیا۔ ڈیوڈ ملیئس نے بعد میں اس
کتاب کو ڈچ زبان سے لاطینی زبان میں ترجمہ کیا اور مغرب میں کیٹلر کی اس
ہندوستانی قواعد کا تعارف پہنچایا۔ ڈیوڈ ملیئس نے ۱۷۴۳ء میں ایک انتخاب
شائع کیا جس کا عنوان "Dissertationes Selectae" تھا۔ اس میں پہلی
مرتبہ کیٹلر کی قواعد کو دنیا کے سامنے پیش کیا گیا۔ (۴)

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ سلیم الدین قریشی اپنی کتاب: ''اٹھارھویں صدی کے اردو مطبوعات میں کیٹلر کی گریمر کا سال ۱۶۸۹ء لکھ گئے ہیں جو مغالطے سے لکھا گیا ہوگا۔ اور وہ ۱۶۹۸ء لکھنا چاہتے ہوں گے۔ وہ لکھتے ہیں، ''فارسی اور اردو کی مذکورہ بالا کتاب انھوں نے اپنے لکھنو کے قیام کے دوران ۱۶۸۹ء میں مکمل کی تھی۔ اس کے مخطوطے کی واحد نقل ہیگ کے رائل آرکائیوز (Rijks Archief) میں موجود ہے۔ اس کو کیٹلر کے ایک ہم پیشہ اور دوست Isaaq Vander Hoeve نے نقل کیا تھا۔ اس پر لکھنو ۱۶۹۸ء کی تاریخ درج ہے۔''(۵)

مولوی عبدالحق نے گریرسن کی کتاب A biography of Western Hindi including Hindustani سے استفادہ کیا تھا یا نہیں، اس کی تائید و تردید تو مشکل ہوگی لیکن یہ بات اہم ہے کہ مولوی عبدالحق کی فراہم کردہ معلومات اور گریرسن کی معلومات میں حیرت انگیز مماثلتیں موجود ہیں۔ یہ کتاب ۱۹۰۳ء میں ممبئی ایجوکیشنل سوسائٹی سے چھپ چکی تھی۔

گریرسن کی اس کتاب میں جان جوشوا کیٹلر اور اس کی گریمر کے بارے میں تعارفی نوعیت کا مواد موجود تھا۔ اب یہ کتاب لاطینی میں لکھی گئی تھی یا ڈچ زبان میں، اس بارے میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا اس ضمن میں واضح موقف اپناتے ہوئے لکھتے ہیں:

مولوی [عبدالحق] صاحب اسے [کیٹلر کی گریمر کو] لاطینی زبان میں بتاتے
ہیں۔ لیکن جیسا کہ [بنجمن شُلزے] کی قواعد کے حصہ سے قطعی طور پر واضح ہے۔
یہ لاطینی میں نہیں، ڈچ میں تھی۔ یہ درست نہیں کی پیٹوں میں ہندوستانی الفاظ
بعینہ لکھے ہیں اور اس کا املا ڈچ زبان کے طریقے پر ہے۔ شُلزے نے اس کا
شکوہ کیا ہے کہ کاش فاضل مؤلف ان کا املا فارسی رسم الخط میں بھی لکھ دیتا تا کہ

تلفظ کے بہت سے مقامات واضح ہو جاتے۔ (۶)

کیٹلر پر ووگل کے مضمون کے نصف صدی بعد ۱۹۸۷ء میں ڈاکٹر تیج کرشنا بھاٹیا کی کتاب بعنوان A History of Hindi Gramatical Tradition, Hindi Hindustani Grammars, Grammarians, History and Problems. شائع ہوئی۔ اس کے ابتدائی صفحات میں ہندی/ ہندوستانی زبان کی روایت کے تفصیلی تحقیق ابواب شامل ہیں۔ ان میں ہندوستانی زبان کی گریمر کی روایت کو کیٹلر سے لے کر جان گل کرسٹ تک کے عہد تک کی روایت کو شامل کیا گیا ہے۔ تیج کے بھاٹیا نے کیٹلر کی گریمر کو اردو کی بجائے ہندی کی گریمر تسلیم کیا ہے اور اس کتاب ہندوستانی یا ہندی زبان کی گریمر کی بنیاد وں میں شمار کیا ہے۔ تیج کرشنا بھاٹیا نے اپنی کتاب میں کیٹلر کے بات میں اہم معلومات اکٹھی کی ہیں اور لکھا ہے کہ ان کی تحقیق کے مطابق کیٹلر کی قواعد ۱۶۹۸ء میں لکھی گئی۔ یہ بات اہمیت کی حامل ہے لیکن نئی بات نہیں۔ ۱۹۴۱ء میں جے۔ پی اینچ۔ ووگل اپنے ایک مضمون بعنوان De eerste Grammatica van et Hindoestansch میں پہلے ہی یہ بات بیان کر چکے تھے۔ (۷)

پچھلے برس UTRECHT University کی ویب سائٹ پر Anna Pytlowany نامی ایک خاتون اسکالر کا ایک مضمون سامنے آیا جس میں اس نے دعویٰ کیا کہ کیٹلر کے قواعد کے واحد نسخے کی موجودگی کی بات حتمی نہیں ہے۔ واضح رہے پہلے کے مذکورہ تمام محققین میں نسخے کی تکمیل کے سنین میں تو اختلاف تھا لیکن اس طرف کسی نے توجہ نہیں کی تھی کہ کیٹلر کی قواعد کے اور نسخے بھی موجود تھے۔ ان کے مطابق واحد قلمی نسخہ رائل آرکائیوز ہیگ جرمنی میں موجود تھا۔ لیکن Anna Pytlowany نے اپنے مضمون "The Earliest Hindustani Grammar" میں دعویٰ کیا ہے کہ اس قواعد کے تین مخطوطے موجود ہیں۔ اس طرح دو نئے مخطوطوں کی دریافت سے کیٹلر پر ہونے والی تحقیق میں نئی جہات سامنے آئیں گی۔ (۸)

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی پچھلے برس (۲۰۱۲ء) شائع ہونے والی کتاب تپش نامہ تمنا

(مضامین کا مجموعہ) میں کیٹلر کی قواعد پر ایک اہم اور معلومات افزا مضمون شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے کیٹلر کی ہندوستانی گریمر کو اردو گریمر سے موسوم کیا ہے۔ ان کے اس گریمر کو ہندی کی بجائے اردو گریمر کہنے سے تیج کرشنا بھاٹیا کی اس گریمر کو محض ہندی گریمر کی بنیاد قرار دینے کے دعوے پر سوالیہ نشان لگ گیا ہے۔ گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

> (اس) گرامر کا مصنف (Joan Josua Ketelaa) سترھویں صدی کے آخری برسوں میں ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کا سفارتکار تھا جو سورت سے دہلی اور لکھنؤ تک سفر کیا کرتا تھا۔ گویا اس زمانے میں ان سب علاقوں میں ہندوستانی زبان (یعنی اردو بہ طور لنگوا فرینکا رائج ہو چکی تھی) جیسے کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ یہ گرامر یورپی سفارت کاروں اور ڈچ حکام کو ہندوستانی زبان سکھانے کے لیے لکھی گئی تھی۔ Moorish سے مراد ہندوستانی نام ہیں۔ ہندوستانی کے ساتھ جس طرح فارسی گرامر کا جزو بھی درج کیا گیا ہے، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ کیٹلر جس کو ہندوستان کی گرامر کہہ رہا ہے وہ دراصل اردو زبان کی گرامر ہے، جو یورپی لوگوں کے روزمرہ اور استعمال عام کی زبان سکھانے کے لیے تیار کی گئی تھی۔ (۹)

گوپی چند نارنگ کا یہ سارا مضمون بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ مذکورہ بالا پیراگراف کافی جہات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جس دور میں جان جوشوا کیٹلر سورت سے دہلی لکھنؤ کی طرف آیا تو اس کے پیش نظر تجارتی کمپنی کے مفادات کے لیے مغل دربار سے مراعات کا حصول اہم مقصد تھا۔ اس سفر نے کیٹلر کو ہندوستانی زبان کی اہمیت اور بہ طور رابطے کی زبان کے میڈیم کے طور پر سمجھنے میں مدد دی۔ چناں چہ لکھنؤ میں ۱۶۹۸ء سے قبل ہندوستانی زبان کی گریمر لکھنے کا مقصد یہ تھا کہ ان علاقوں کے لوگوں کے اندر رہ کر زبان کا معیاری و عوامی نمونوں کو دیکھا جائے اور اس کو اپنی کتاب میں پیش کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے غیر ملکی افراد کو گریمر اور لغت ہر دو کتابوں کی ضرورت پیش آئی۔ مقامی آبادی اور علما کو اس زبان کے سیکھنے کے لیے چوں کہ کوئی دقت پیش نہ تھی۔ چناں چہ اردو زبان کی گریمر اور لغت لکھنے کی طرف مقامی افراد کا رجحان نہ

ہوا۔ اس لیے کیٹلر کو گریمر ناگزیر نظر آئی۔

کیٹلر کی یہ گریمر ۲۰۰۸ء میں ڈاکٹر تیج کرشنا بھاٹیا اور ان کے جاپانی رفیق کار مچیدا (Kazuhiko Machida) نے تین جلدوں میں شائع کی۔ اس گریمر کی اشاعت میں اس مرتبہ ڈاکٹر تیج کرشنا بھاٹیا نے ہندی کی بجائے (کیٹلر کی) ہندوستانی گریمر کو اردو گریمر تسلیم کیا ہے۔ ڈاکٹر تیج کرشنا بھاٹیا اپنی پہلی کتاب "A History of Hindi Grammatical Tradition" میں اس گریمر کو ہندی گریمر لکھتے آئے تھے۔ لیکن اس کتاب کی اشاعت میں جس کا عنوان The Oldest Grammar of Hindustani رکھا گیا ہے۔ اس میں انھوں نے اس کو اردو گریمر لکھا ہے جو ان کی وسیع ظرفی کی دلیل ہے۔

ہندوستانی گریمر کے بارے میں عام تاثر یہی لیا جاتا ہے کہ یہ گریمر کی کتاب ہے۔ لیکن اس کتاب کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں ایک بڑا حصہ لغت کا ہے جو اس کی اہمیت بڑھا دیتا ہے۔ اس کتاب کو صرف گریمر نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ یہ ڈکشنری کی روایت کا حصہ بھی بنتی ہے۔ یہ طریقہ کار اس دور کی روایت کے عین مطابق ہے جس کے تحت لغت کے دیباچے یا مقدمے میں قواعد کے اصول شامل کر دیے جاتے اور اگر گریمر کی کتاب ہوتی تو اسی میں کچھ حصہ لغت کے طور پر شامل کر دیا جاتا تھا۔ کیٹلر کی گریمر بھی لغت کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے کی طرف ایک اہم قدم تھا۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل اپنے ایک مضمون میں اس بارے میں لکھتے ہیں:

> اپنی نوعیت اور اس میں شامل الفاظ کی فہرست کے اعتبار سے یہ قواعد ایک لغت بھی کہی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ چاہے ایک لغت کہی جائے یا ایک قواعد، اس نے بہر حال مقامی زبانوں کی ایک روایت کا آغاز ضرور کیا، جو اگرچہ کسی علمی یا درسی مقصد سے وجود میں نہیں آئی لیکن اس نے مقامی زبانوں کے قواعد نویسی کی اور اس وقت کی ایک اعام اور مروج صورت کو پیش کیا...... اس نے ہندوستانی قواعد نویسی کے مؤرخین کے لیے ایک ابتدائی نمونہ ضرور فراہم کر دیا، جسے تاریخ میں ایک اہم اور بنیادی ماخذ کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ یہ اس

> زمانے میں واقعتاً بڑا کام تھا جس نے اردو کے ابتدائی ذخیرۂ الفاظ کو مرتب شکل میں یک جا کر دیا ہے۔۔۔ یہ ذخیرہ اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ اس میں سماجی لسانیات کے مطالعے کے لیے بھی ایسا مواد موجود ہے۔ جس کے ذریعے گزشتہ تین سو سالوں کے لسانی تغیرات کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ (۱۰)

موضوعاتی سطح پر اس کتاب کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ شروع کے پچاس اندراجات ذخیرۂ الفاظ اور لغت کے حصے کے طور پر شامل نہیں۔ یہ صفحات لغت کا ہلکا سا تصور تو دیتے ہیں لیکن ان کو آج کی لغت کے معیارات کے اوپر پرکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کسی معیاری لغت کے نمونے کے طور پر سامنے نہیں رکھے جا سکتے۔ لغت کے اس حصے میں دکھائی یہ دیتا ہے کہ صرف ذخیرہ الفاظ کی فہرست دیے جانے تک ہی کیٹلر محدود رہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ لغت کی تیاری یا نمونہ اس کے مشن کا حصہ بھی نہیں تھا۔

کتاب میں مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد، ان کے عہدوں، ضرورت کی بول چال کے جملوں، مقامی اشیا کے نام، اور زبان سے متعلق ان ضروری چیزوں کا ذخیرہ جمع کر دیا گیا ہے جس کی ایسٹ انڈیا کمپنی کو ضرورت تھی یا پیش آ سکتی تھی۔ کیٹلر کی گریمر کا مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ کیٹلر کو مقامی افراد سے بات چیت، ملازموں سے کام لینے کے لیے مقامی زبان کی تحصیل کی ضرورت پیش آئی تھی اور دوسری جگہ اس کو یہ بات بھی اہم لگی تھی کہ سرکار دربار میں بھی اس زبان کا چلن ہے اس لیے بجائے فارسی زبان میں گریمر مرتب کرنے کے، کیٹلر نے عوامی رابطے کی زبان کو منتخب کیا اور اس طرح اردو کی پہلی گریمر کا تاج ان کے سر پر سجایا گیا۔ مختصر یہ کہ کیٹلر کی اردو گریمر، اردو قواعد نویسی کی تاریخ میں خاص اہمیت کی حامل ہے۔ اس کی تاریخی اہمیت کے ساتھ ساتھ ایک محقق کو اس دور کے نوآبادیاتی تاجر کی لسانی ضروریات کو سمجھنے میں بھی خاصی مدد مل سکتی ہے۔

حوالہ جات وحواشی:

١۔ ڈاکٹر غلام عباس گوندل، کیلٹر قواعد: کچھ نئی دریافتیں، مشمولہ معیار (تحقیق وتنقید مجلہ)، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد، پاکستان، شمارہ نمبر ۸، ص ۱۶۰

٢۔ ڈاکٹر غلام عباس گوندل نے مذکورہ بالا آرٹیکل میں کیٹلر کی قواعد کے نام کا ترجمہ یوں کیا ہے۔
''ہدایت یا تعلیم زبان ہندوستانی و فارسی مع ان کی تعریف و مطابقت مغل نیز ہندوستانی اورڈچ پیمانوں اوراوزان کا موازنہ اور چند مسلمان ناموں کے معانی۔

٣۔ مولوی عبدالحق، قواعد اردو، الناظر پریس لکھنؤ، طبع اوّل، ۱۹۱۴ء ص ۲۰۔۱۹

٤۔ کیٹلر پر ان اصحاب کی معلومات کے لیے ان کی کتب کو دیکھا جاسکتا ہے جو یہ ہے۔
(i)۔ خلیل الرحمان داؤدی، قواعدِ زبان اردو مشہور بہ رسالہ گلکرسٹ، مجلس ترقی ادب، لاہور
(ii)۔ ڈاکٹر رضیہ نور محمد، اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ، (لاہور، مکتبہ خیابان ادب،)
(iii)۔ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی، جامع القواعد (حصہ صرف) (لاہور، اردو سائنس بورڈ، طبع دوم) ۲۰۰۴

٥۔ سلیم الدین قریشی، اٹھارہویں صدی کی اردو مطبوعات
(اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۳) ص ۱۷۔۱۶

٦۔ ابو اللیث صدیقی ڈاکٹر، مقدمہ ہندوستانی گرائمر از بنجمن شلز ے
(لاہور، مجلس ترقی ادب،) ص ۶

٧۔ کیٹلر کی قواعد کی تاریخ، سین اور سوانحی کوائف کی بحثیں، ڈاکٹر غلام عباس گوندل نے اپنے مضمون بعنوان ''کیٹلر کی قواعد کچھ نئی دریافتیں'' میں اٹھائی ہیں جن کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ حوالہ اوپر موجود

۷- www.bc.library.uu.nl/node/180,accessed on 28.01.2013

۸- ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، عہد اورنگ زیب کی نثر کے تین نمونے اور ہندوستانی یعنی اردو زبان کی پہلی گرامر، مشمولہ تپش نامۂ تمنا (لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء) ص ۱۴

۹- ڈاکٹر معین الدین عقیل، اردو زبان کی اوّلین قواعد کا قضیہ، مطبوعہ، بنیاد (ادبی مجلہ)، (لاہور یونیورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز لاہور، شمارہ نمبر ۱، جلد سوم، ۲۱۲) ص ۶۰، ۷۰

۱۰-

2.3

بنجمن شُلز کی اردو قواعد نویسی اور مشنری لسانی ضرورتیں

اردو زبان کی تاریخ میں اٹھارھویں صدی کا دور خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اردو زبان جو کہ اس دور میں ہندوستانی زبانی کہلاتی تھی، تیزی سے اس خصوصی مقام (خلا) پر فائز ہونے کے لیے تیار ہو رہی تھی جو سرکاری زبان فارسی زوال آمادہ ہونے کے باعث ہندوستان بھر میں محسوس کیا جا رہا تھا۔ مغل حکومت کا زوال، فارسی زبان کا زوال بھی ثابت ہوا۔ اس عہد میں ہندوستان کے تمام علاقوں میں جو زبان رابطے کی زبان (Lingua Franka) کا درجہ پا چکی تھی وہ یہی اردو زبان (ہندوستانی) تھی۔ تواریخِ زبانِ اردو میں اردو زبان کی تشکیل کے ضمن میں عام طور پر عموماً صرف ان کاوشوں کو ہی لسانی تحقیق کا حصہ بنایا گیا ہے جو شمالی ہندوستان کے بڑے علاقوں میں اصلاحِ زبان کے مقاصد کے تحت روبہ عمل رہیں۔ اصلاح زبان کا یہ عمل دہلوی اور کچھ حد تک لکھنوی شعرا کی ریختہ کے اندر من چاہی تبدیلیوں تک ہی محدود رکھا گیا ہے۔ ابھی تک اردو زبان کی تشکیل پذیری کے دوسرے زاویے کی طرف ماہرین نے توجہ نہیں دی جو ان شعرا کی کاوشوں سے زیادہ وقیع حیثیت کا حامل تھا۔ اردو کی لسانی تحقیق میں اٹھارھویں صدی کے مستشرقین کا ایک خاص حوالہ بنتا ہے جنھوں نے اس زبان کی ترویج د

اشاعت کے لیے ابتدائی قواعد ولغات مرتب کیں۔

اُردو زبان کی پہلی قواعد جان جوشوا کیٹلر نے ۱۶۹۸ء میں مرتب کی۔[1] کیٹلر ہالینڈ کا سفیر تھا جس نے دکن کے علاقوں میں اپنے ملک کی تجارتی ضروریات کے لیے ہندوستان کی طرف سفر اختیار کیا۔ یورپی اقوام کو تجارت اور عیسائی مذہب کی تبلیغ کے مشنری مقاصد کے لیے کی وجہ سے ہندوستان کے سفر اور یہاں سکونت میں دل چسپی پیدا ہوئی۔ سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی میں عیسائی مشن کی تبلیغ کا کام ہندوستان میں یورپی پادریوں کی دل چسپی کا محرک بنا۔ اس سلسلے میں جرمن، ڈنمارک اور انگلینڈ کے افراد کی کاوشوں کا ذکر تاریخ میں زیادہ ملتا ہے۔ شاہ فریڈرک چہارم نے ہندوستان کے علاقے ٹرانکوبار میں تبلیغ مشن کے لیے خطیر فنڈز مختص کر دیے تھے۔ یہ علاقہ جنوبی ہند میں مدراس سے ۱۵۰ کلومیٹر دور تھا۔ ٹرانکوبار کے علاقے میں چوں کہ ایسٹ انڈیا کمپنیوں کے نمائندوں کی ایک بڑی تعداد موجود رہتی تھی، چناں چہ یہاں پر آکر سکونت اور اپنے مشن کی انجام دہی کے لیے پادریوں کو تحفظ کا احساس بھی رہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جرمن باشندوں کے لیے ٹرانکوبار کا علاقہ خاصہ اہم بن گیا۔ جولائی ۱۷۰۶ء میں اسی مشنری جذبے کے تحت زیگن بالگ (Bartholomous Zeigenbalg) اور Herry Pluestschau نامی مشنری ٹرانکوبار کے علاقے میں عیسائی مشن کی تبلیغ مقصد کے لیے آئے۔ زیگن بالگ کا نام عیسائی مشن کی تاریخ اور روایت میں خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے مشن کی قیادت عیسائیت کی تبلیغ کا نئے دور کا آغاز ہوا۔ زیگن بالگ کو اس دور کا ایک اہم عہدہ Provost دیا گیا۔ وہ ایک نوجوان عیسائی مبلغ تھا لیکن بدقسمتی سے وہ جوانی کے عالم میں ایک جان لیوا بیماری سے فروری ۱۷۱۹ء میں اس وقت فوت ہو گیا جب وہ ابھی ۳۶ سال کا جوان تھا۔ اس کے بعد مشن کی قیادت J. E. Gruendler نے سنبھالی۔ وہ بھی مارچ ۱۷۲۰ء میں فوت ہو گیا۔

اسی زمانے میں Benjamin Schultze نام کا عیسائی مشنری ٹرانکوبار پہنچ چکا تھا۔ ۱۷۱۹ء میں شُلز جرمن شہر ہالے "Halle" کے ڈینش مشن کے تحت جنوبی ہندوستان آیا۔ اور ۱۷۲۰ء میں ٹرانکوبار مشن کی قیادت سنبھال لی شُلز نے ہندوستانی زبان کی قواعد کے سلسلے میں

ایک کتاب ۱۷۴۱ "Grammatica Hindustanica" ء میں مرتب کی جو بعدازاں ۱۷۴۵ء میں ''ہالے'' جرمنی سے شائع ہوئی۔ (۲) بنجمن شُلز، جرمنی کے شہر Brardenberg میں پیدا ہوا (جس کا موجودہ نام Sonnenburg ہے)۔ ''ہالے'' شہر کی ایک یونیورسٹی سے اس نے دینیات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور دو ساتھیوں کے ساتھ ٹرانکوبار سکونت اختیار کی۔ جب وہ ٹرانکوبار میں داخل ہوا تو اس وقت زیگین بالگ کی وفات کو سات ماہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ بنجمن شُلز جلد ہی ٹرانکوبار تبلیغی مشن میں مرکزی اور قائدانہ حیثیت اختیار کر گیا۔ اس دور میں وہاں پر موجود جرمن مقتدر افراد اور ساتھی مزدوروں میں لڑائی جھگڑے شروع ہو گئے اور ماحول میں ایک تناؤ کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اس نے کچھ عرصہ یہاں گزارا لیکن جلد ہی وہ اس حقیقت کو بھانپ گیا کہ ٹرانکوبار میں تصنیف و تالیف کے منصوبوں کو جاری رکھنا مشکل ہو گا۔ چناں چہ ۱۷۲۶ء میں شُلز نے مدراس ہجرت کی اور انگلینڈ کی ایک سوسائٹی، سوسائٹی فار پروموٹنگ کرسچین نالج، (SPCK) کے ساتھ معاہدے کے تحت مدارس میں عیسائی مشن میں شمولیت اختیار کر لی۔ (۳) یہ سوسائٹی مدراس میں عیسائی مشن کی تعلیمات کے فروغ اور ترقی کے لیے سرگرم تھی۔ اس سوسائٹی نے شُلز کے کام کی حوصلہ افزائی اور معقول مشاہرے پر اس کی خدمات حاصل کر لیں۔ بنجمن شُلز نے تصنیف و تالیف کے لیے اپنے کام کا آغاز بائبل کے مقامی زبانوں میں تراجم سے کیا۔ شُلز کے ہندی زبان میں بائبل کے ترجمے کی اہمیت یہ ہے کہ یہ کسی مقامی زبان میں اپنی نوعیت کا پہلا ترجمہ ہے۔ Gerald H. Anderson کے بہ قول:

> The first translation of Part of the Bible in Hindi, Genesis was made in manuscript by Bengamin Schultze (1689-1760), a German Missionary who arrived in India in 1719 and relocated to Madras established an English mission in 1726 and worked on completing Bartholomous Zeigenbalg's Bible Translations into Tamil and then Bible translations in Telugu.(4)

ہندوستانی زبانوں میں بائبل کے تراجم سے مقامی زبانوں کی تحصیل کی طرف یورپی افراد کی دل چسپی کا یہ رجحان مقامی زبانوں کی ترویج وفروغ کا باعث بنا۔ ان افراد کے پیش نظر یہ زاویہ موجود تھا کہ عیسائیت کی تبلیغ کو پر اثر بنانے کے لیے مذہبی لٹریچر کو مقامی زبانوں میں ڈھالنا زیادہ سود مند ثابت ہوسکتا تھا۔شُلز کے ترجمہ کاری کے منصوبہ کو جنوبی ہند کی تاریخ میں اہم مقام ومرتبہ حاصل ہوا۔ فرگوسن نے اپنی ڈکشنری (A short dictionary of English and Hindoostan.) کے ابتدائیے میں شُلز کے اس کام کی اہمیت کا ذکر کیا تھا کہ اس کی بائبل ٹرانسلیشن ہندی زبان میں پہلی ٹرانسلیشن کے طور پر لکھی گئی۔ مدراس میں قیام کے طویل دورانیے میں شُلز نے زیگن بالگ کے ادھورے منصوبوں کی تکمیل کا ذمہ بھی اپنے سر لے لیا تھا۔ تیلگو زبان میں ترجمہ کرنا اسی اشاعتی منصوبے کا حصہ تھا۔ ۱۷۲۶ء میں شُلز نے زیگن بالگ کی تیار کردہ ''عہد نامۂ جدید'' کا تامل زبان میں ترجمہ کر کے اس منصوبے کو مکمل کیا۔ سلیم الدین قریشی لکھتے ہیں:

> [شُلز نے] زیگن بالگ کے کام کو جاری رکھتے ہوئے سب سے پہلے اس کے تیار کردہ نئے عہد نامے کے تامل ترجمے کو مکمل کر کے ۱۷۲۶ء میں ٹرانکوبار سے شائع کیا۔شُلز نے اس کے بعد ۱۷۲۷ء میں عہد نامہ جدید اور ۱۷۳۲ء میں عہد نامہ قدیم کا تیلگو زبان میں ترجمہ مکمل کرنے کے علاوہ عیسائی مذہب کی مشہور دعا لارڈز پریر (Lords Prayer) کا گجراتی زبان میں ترجمہ کیا، لیکن بعض وجوہ کی بنیاد پر یہ تینوں کتابیں شائع نہ ہوسکیں۔(۵)

ان کتب کی شائع نہ ہونے کی وجوہات یہ تھیں کہ ان کے تراجم پر دوسرے پادریوں کو کچھ تحفظات تھے جن کی وجہ سے یہ تراجم نزاعی مباحث کی زد میں آ گئے اور شائع نہ ہوسکے۔ تامل، تیلگو اور گجراتی زبان کے تراجم سے شُلز نے جنوبی ہند کی مقامی زبانوں میں البتہ کافی دستگاہ حاصل کر لی تھی۔ ۱۷۲۸ء میں شُلز نے تیلگو زبان کی گریمر مرتب کی جو اس عہد میں تو نہ چھپ سکی اور دنیا کی نظروں سے اوجھل رہی لیکن ۱۹۸۴ء میں اس کی اشاعت سے شُلز کے اس کام کا یورپی دنیا کو علم ہوا۔ یہ کتاب ۱۹۸۴ء میں ہالے جرمنی سے شائع ہوئی۔شُلز کی ایک

اہمیت اور بھی ہے کہ مدراس میں عیسائیوں کا تبلیغی مشن شُلز نے ہی شروع کیا تھا۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں:

"شُلزے کے متعلق ہماری اطلاعات کا واحد ماخذ خود یہ کتاب (ہندوستانی گرائمر) ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مدراس میں عیسائیوں کا پہلا تبلیغی مشن شُلزے نے ہی شروع کیا۔۔۔ مسٹر زیگن بالگ نے ٹرانکوبار کے قیام کے دوران بائبل کا مکمل ملاباری ترجمہ شروع کیا تھا، جسے سنہ ۱۷۲۵ء میں شُلزے نے ہی تمام کیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسٹر شُلزے کو برصغیر کی زبانوں سے دل چسپی تھی۔۔۔ ملاباری میں انجیل کے ترجمے کی تکمیل کے علاوہ تیلگو سے بھی واقفیت بہم پہنچائی اور ۱۷۲۹ء میں اس کے مبادیات پر ایک رسالہ لکھا اور اس کے بعد ہی وہ ہندوستانی قواعد کی تالیف کی طرف متوجہ ہوئے۔" (٦)

مذکورہ بالا اقتباس اور تفصیلات یہ ظاہر کرتی ہیں کہ شُلز نے جنوبی ہندوستان کی مقامی زبانوں کی تحصیل کی طرف دل چسپی کے ساتھ توجہ کی تھی۔ تیلگو، ملاباری اور دکنی (اردو) زبانوں کو سیکھنا اور ان میں بائبل کے تراجم اور قواعد کی کتب مرتب کرنا اس کی مقامی زبانوں کی تحصیل کا واضح ثبوت ہے۔ نیز ان زبانوں کے سیکھنے کے بعد ان میں قواعد کی کتب لکھنا دراصل زبان سیکھنے کی ضروریات کے لیے مواد فراہم کرنا تھا جو کہ یورپی افراد کی ضرورت تھیں۔

شُلز کو مقامی زبانیں سیکھنے کے لیے مشکلات کا سامنا رہا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ شُلز کا پہلا استاد تامل زبان بولنے والا تھا جو کہ تامل زبان بھی پوری طرح نہ جانتا تھا۔ (٧) اب اگر شُلز اسی معلم کا دست نگر رہتا تو زبانوں کی تحصیل میں سقم رہ جاتا چناں چہ اس معلم سے چھٹکارا حاصل کر لینے کے بعد شُلز ہندوستانی گریمر کی تالیف کی طرف متوجہ ہوا۔ اردو دنیا میں شُلز کا اہم کام 'ہندوستانی زبان کی قواعد' کی کتاب تالیف ہے۔ ہندوستانی گریمر کے علاوہ بھی اس نے مقامی زبانوں کے سلسلے میں تصنیف و تالیف کا کام جاری رکھا جس پر نظر ڈالتے ہیں۔ عیسائیت کی تبلیغ کے مشن کے مقاصد کے لیے شُلز کی پہلی کتاب 1743ء میں سامنے آئی جس کا

عنوان یوں ہے۔ اللہ کھی سودس فرمودی اچ۔

Sammuala Doctorinae christianae in lingvam Indoinstanicam. Translata a viro plur Reverendo Bengj. Schulzio, evengalico in India Missionario. Eidit D. Jo Henry Callenberg. Halae in Tupographia Institu Judaci, 1743.

تبلیغی مشن کے سلسلے میں دوسری ٹرانسلیشن کا عنوان یوں ہے۔ اللہ کے لائق ہے سو ایمان کی تعلیم کی کتاب اچ۔

Translata a viro Plur- Reverendo Benj. Schulzio, Evangelico in India Missionario, Edidit D. JO Henry Callenberg. Halae in Typographia Instituti Judaici 1744.[8]

''ہندوستانی گریمر'' کا مسودہ شُلز نے ۱۷۴۱ء میں تیار کر لیا تھا۔ اس کا ثبوت شُلز کی ''گریمٹیکا ہندوستانیکا'' کا مقدمہ ہے جس پر ۳۰ جون ۱۷۴۱ء کی تحریر کردہ تاریخ موجود ہے۔ Grammatica Hindustanica، اردو قواعد کی ایک اہم کتاب ہے۔ یہ کتاب ۱۷۴۵ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب اشاعت سے اردو قواعد کی تاریخ میں شُلز کا نام خاص اہمیت کا حامل بن گیا۔ یہ کتاب گوفوری طور پر چھپ نہیں سکی لیکن اس عہد تک اردو قواعد کی تاریخ میں کیٹلر کی گریمر کے سوا کوئی بڑا نام اور کام سامنے نہیں آ سکا۔ کیٹلر کی گریمر یورپ میں کافی عرصہ معروف نہ ہو سکی۔ وجہ یہ تھی کہ ابھی تک ان کتب کو یورپ کی دوسری قابل ذکر زبانوں میں ترجمہ نہیں کیا گیا تھا، اس لیے یورپ ان کتب سے ابھی متعارف بھی نہیں تھا۔ بنجمن شُلز کے لیے اس عہد میں مدراس میں حالات سازگار نہیں رہے تھے۔ مدراس میں اپنے ساتھیوں سے چپقلش کے نتیجے میں شُلز نے واپسی کا فیصلہ کیا اور ۱۷۴۴ء میں Halle (جرمنی) واپس لوٹ گیا۔ ہالے پہنچنے پر اس نے ہندوستان میں اپنے طویل قیام کے دوران مکمل کیے گئے اشاعتی منصوبوں کو منتخب کیا اور ان کی نشر و اشاعت کا کام تیزی سے شروع کر دیا۔

۱۷۴۴ء میں اس نے زیگن بالگ کے بائبل کے نامکمل ترجمے کومکمل کر کے شائع کیا۔ یہ کتاب اس سے قبل (۱۷۲۸ء) میں نامکمل چھپی تھی۔ Genesis کے حصوں کا دکنی زبان میں ترجمہ کرنا شروع کیا۔ Genesis کے کچھ حصے ترجمہ کر کے ۱۷۴۵ء میں عربی خط میں ہالے سے شائع کیے شُلز کے اشاعتی منصوبوں کے بارے میں Gerald H. Anderson لکھتے ہیں:

> He was responsible for translating part of Genesis in to a southern form of Hindustani, called Dakhini, printed at Halle in Arabic characters in 1745, followed by Psalms, Gospels and Epistles. He also compiled a grammar of the Telugu Language (1728, not printed until 1984 at Halle). As well as a grammar of Hindustani (first printed at Halle in 1745 and reprinted in 1964).(9)

شُلز کی Grammatica Hindustanica، اردو گریمر کی روایت میں دوسرا بڑا اضافہ بن کر سامنے آئی۔ یہ کتاب اصلاً لاطینی زبان میں لکھی گئی تھی۔ اس کتاب کی تصنیف ۱۷۴۱ء میں عمل میں آئی البتہ اس کی اشاعت کے سن میں اردو کے محققین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس کتاب کے بارے میں بھی گریرسن کا ''لسانیاتی جائزہ ہند'' اوّلین معلومات کا ذریعہ بنا۔ اس کے بعد مولوی عبدالحق کی کتاب ''قواعدِ اردو'' کے دیباچے میں شُلز کی گریمر کا سن ۱۷۴۴ء لکھا گیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر عتیق صدیقی کی کتاب ''گل کرسٹ اور اس کا عہد'' میں یہ معلومات ملتی ہیں کہ یہ کتاب ۱۷۴۵ء میں شائع ہوئی۔ عتیق صدیقی اور رضیہ نور محمد کو کتاب کے عنوان میں باقی احباب سے اختلاف ہے۔ ان دونوں نے کتاب کا عنوان (ترجمہ) Grammatica Industanica لکھا ہے جب کہ بعض کے ہاں Hindustanica کا لفظ ملتا ہے۔ عتیق صدیقی لکھتے ہیں:

> کیٹلر کے بعد دوسرا یورپین جس نے ہندوستانی زبان کے قواعد مرتب کرنے کی کوشش کی وہ مشہور عیسائی مبلغ بن جمن شولز تھا۔ اس نے گرامے ٹی کا ان

ڈوس ثانی کا (Grammatica Industanica) کے نام سے لاطینی زبان میں ایک رسالہ مرتب کیا جو ۱۷۴۵ء میں شائع ہوا۔۔۔شولز کی تالیف کی یہ خصوصیت قابل ذکر ہے کہ اس میں ''ہندوستانی الفاظ فارسی عربی رسم خط'' میں بھی لکھے گئے تھے اور ''دیوناگری رسم خط کی وضاحت'' بھی کی گئی تھی۔ (۱۰)

شُلز کی گریمر کو ۱۹۷۷ء میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے ترجمہ کیا اور معلوماتی مقدمے سمیت شائع کر کیا، جس سے شُلز کے اپنے حالات زندگی اور شخصیت پر تو زیادہ مواد موجود نہیں ہو سکا لیکن کتاب کو سمجھنے اور شُلز کے عہد کی قواعدی ضروریات کو سامنے رکھنے کے لیے ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ ابو اللیث صدیقی نے شُلز کو ''شُلزے'' کے نام سے متعارف کرایا۔ ان کے مطابق یہ کتاب ''گرے مے ٹکا ہندوستانی کا'' ۱۷۴۱ء میں قلم بند کی گئی تھی۔ یہ تاریخ کتاب کے دیباچے میں شُلز کی اپنی تحریر کردہ ہے۔ جب کہ یہ کتاب شُلز کے جرمنی واپس جانے کے بعد شائع ہوئی۔ اس کی اشاعت کا سال ۱۷۴۵ء ہے۔ البتہ ڈاکٹر مس رضیہ نور محمد کا خیال مختلف ہے۔ ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں:

> مولوی [عبدالحق] صاحب نے کیٹلر کی قواعد کے بعد شُلزے کی قواعد کا ذکر کیا ہے جو ان کے بہ قول سنہ ۱۷۴۴ع میں شائع ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب ۳۰ جون ۱۷۴۱ع کو مدراس میں مکمل ہوئی اور سنہ ۱۷۴۵ع میں]ہالے[سکسینی سے شائع ہوئی۔ (۱۱)

شُلز نے جنوبی ہندوستان کی مقامی زبانوں مثلاً تیلگو، ملیالم کے ساتھ ساتھ دکنی اور ہندوستانی زبانوں میں بڑی حد تک استعداد حاصل کر لی تھی۔ ہندوستانی زبان کی اس عہد میں یہ اہمیت واضح ہونا شروع ہو گئی تھی کہ باقی جنوبی خطے کی زبانوں سے قطع نظر، ہندوستانی زبان میں رابطے کی زبان "Lingua Franka" بننے کی صلاحیت بہ خوبی موجود تھی۔ چناں چہ شُلز ہندوستانی زبان کی قواعد لکھنے کی طرف متوجہ ہوا۔ اس زبان کا سفارتی پہلو بھی اس کے پیش نظر تھا کہ یہ زبان مغل دربار میں رسائی پا چکی تھی۔ کیوں کہ اس سے قبل جون جوشوا کیٹلر بھی اسی زبان میں قواعد کی کتاب مرتب کر چکا تھا، جو اس وقت تک کے مغربی افراد کی رہنمائی کے لیے

موجود تھی لیکن ناکافی تھی۔ (اردو) ہندوستانی زبان کی طرف شُلز کا رجحان ابولیث صدیقی کے
ان الفاظ سے واضح ہوتا ہے:

اس ہندوستانی زبان کے قواعد لکھنے کے محرکات کا ذکر کرتے ہوئے شُلزے نے
۱۷۴۱ء میں اس زبان کی حیثیت اور اہمیت کا اظہار کیا ہے کہ مغل اعظم کی وسیع
سلطنت میں یہ عام اور مشترک زبان کی حیثیت سے ہر جگہ عام ہے۔ برصغیر کی
اکثریت غیر عیسائی آبادی پر مشتمل تھی اور شُلزے کے عقیدے کے مطابق ان کی
روحانی نجات کا واحد ذریعہ عیسائیت کی تعلیم تھی، اس لیے اس ہمہ گیر زبان کو ہی
تبلیغ و اشاعت مذہب کا ذریعہ بنانا چاہیے۔۔۔ مختلف عیسائی مشنریوں نے
سترھویں صدی عیسوی سے ہی اس زبان کی تحصیل اس مقصد کے لیے شروع کر
دی تھی شُلزے اپنا مقصد یہ بتاتا تھا کہ وہ اس زبان کو مشنری مبلغین کے لیے
سہل الحصول بنانے کے لیے اس کی قواعد مرتب کر رہا تھا۔ (۱۲)

شُلز کی ''ہندوستانی گرائمر'' سے ثابت ہوتا ہے کہ مصنف/مولف ہندوستانی زبان کا عالم تھا۔ اس کی گریمر چوں کہ نقش ثانی تھی اور کیٹلر کا نقش اوّل وہ دیکھ چکا تھا اس لیے بھی اس کی گریمر میں غلطیاں کم ہونے کے امکانات تھے۔ اس گریمر کو اس نے مختصر کر کے لکھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر کوئی بندہ اس اختصار سے کسی الجھاؤ کا شکار بھی ہو جائے، تب بھی یہ زبان اتنی مشکل نہیں ہے۔ تھوڑی سی محنت کر کے یہ بولنے والے کو اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ زبان کی چھوٹی موٹی غلطیوں اور تبدیلیوں کا امتیاز سمجھ سکے۔ ڈاکٹر رضیہ نور محمد لکھتی ہیں:

اس میں [ہندوستانی گریمر] مطالع کو عربی قواعد کی روشنی میں نہیں پیش کیا گیا
بلکہ غیر ملکیوں کی ضروریات کے پیش نظر حروف تہجی کے بیان کے بعد ابتدائی
مشقیں درج ہیں، جن سے روزمرہ کی بول چال کے جملے ذہن نشین کرائے
گئے ہیں۔ دوسرے حصے میں اسم صفت، موصوف اور ان کے محل استعمال کی
نشان دہی کی گئی ہے۔ اس حصے میں ایک سے سو تک کی گنتی، چیدہ چیدہ الفاظ کی
فہرست اور بعض دوسری ہدایات درج ہیں۔ (۱۳)

شلز کی گریمر کل چھ ابواب میں منقسم ہے۔قواعد کا یہ ماڈل کسی نئی منہاج کی نشان دہی نہیں کرتا بلکہ یہ لاطینی زبان کی قواعد کے ماڈل کے مطابق کی گئی تقسیم ہے۔ پہلا باب حروف تہجی کے مباحث پر ہے۔اس سلسلے میں سب سے پہلے شلز نے دیوناگری حروف تہجی کا چارٹ دیا ہے۔ان حروف کی صوتی علامتوں کو رومن تلفظ سے واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ حروف تہجی کے اس سیکشن میں ہجا، حرف علت اور حرف سے متعلق مباحث کا ذکر ملتا ہے جو خاصا معلوماتی ہے۔اس حصے میں بنگلہ زبان اور گورمکھی رسم الخط کے بارے میں بھی معلومات دی گئی ہے جو مصنف کی کثیر جہتی کی طرف اشارہ ہے۔مزید یہ کہ ہندوستانی تاجروں کی مخصوص بولی، کوڈ ورڈز کو غیر ملکی باشندوں کی رہنمائی کے لیے کتاب میں شامل کیا گیا ہے جو اہم ہے۔ ان کے بعد اردو (ہندوستانی) حروفِ تہجی کی لسٹ موجود ہے جسے رومن حروف سے بھی واضح کیا گیا ہے۔ضروریات زندگی کے متعلق استعمال کی اشیا کے نام، رشتوں کے نام دیے گئے ہیں جو نو وارد افراد کی رہنمائی کے لیے لازمی تھے۔

دوسرا سیکشن اسم کی گردان (Declension of Noun) کے عنوان کے تحت ہے۔ اس میں اسم معروف، نکرہ، جمع، واحد بنانے کے قدیم طریقے، مہینوں اور دنوں کے نام موجود ہیں۔ہفتوں اور دنوں کے نام اردو، فارسی اور ہندوستانی زبان کے مطابق الگ الگ خانوں میں دیے گئے ہیں۔ پوری گنتی کے ساتھ ساتھ سابقے اور لاحقے بھی دیے گئے ہیں جن کے استعمال سے ان کو سمجھنا زیادہ آسان ہو گیا ہے۔اس بات میں اسم اور صفت کی جملہ تعریفیں اور ان کے استعمال اور گردانوں کا سلسلہ موجود ہے۔

تیسرا سیکشن ضمیر (Pronoun) کے عنوان کے تحت ہے۔ضمیر کی تمام شاخوں پر تفصیلی گردانیں موجود ہیں جس سے اردو زبان کو سمجھنا زیادہ آسان بنا دیا گیا تھا۔ضمیر کے باب میں دی گئی تفصیلات بہت جامع ہیں جن کی اہمیت سے آج کی جدید گریمر بھی بہرہ ور ہوتی ہے۔ چوتھا سیکشن فعل اور متعلقاتِ فعل کے مباحث سے بحث کرتا ہے۔ واحد جمع، مذکر مونث اور فعل کی تبدیل شدہ صورتوں اور ان کے استعمال سے یہ باب زیادہ معلوماتی حیثیت کا حامل ہے۔ ماضی، حال اور مستقبل کے صیغوں اور فعل کی شکل وصوت میں ہونے والی تبدیلیوں پر سیر حاصل

معلومات کتاب کا خاصا ہے۔ اس سیکشن میں امدادی افعال، مفرد اور مرکب افعال پر بھی معلومات ملتی ہیں۔

پانچویں سیکشن میں حروف کی ممکنہ شکلوں جن میں استفہامیہ، فجائیہ، حرفِ ربط وغیرہ کا ذکر ہے۔ چھٹا سیکشن نحو کے مباحث پر تفصیل دیتا ہے۔ اس حصے میں چھوٹے چھوٹے جملے، مرکب جملے، محاورات، مرکب الفاظ اور ضرب الامثال کا ضروری ذخیرہ شامل ہے۔ اس گریمر کے مطالعہ سے اٹھارھویں صدی میں مشنری مقاصد کے لیے اردو زبان آسانی سے سیکھی جا سکتی تھی۔ آخر میں لارڈ پریر اور کچھ دوسری عیسائی مذہبی دعاؤں کا ترجمہ اور اصل متن دیا گیا ہے۔ یہ کتاب کیٹلر کی قواعد کے بعد دوسری اہم کتاب بن کر سامنے آئی۔ لیکن اس سلسلے میں یہ امر واضح رہے کہ یہ کتاب (قواعد) بھی مکمل نہیں ہے۔ کتاب کو گریمر کے مشمولات پر پرکھیں تو بہت سے پہلو تشنہ ہیں۔ لیکن اس قواعد کی یہ خوبی بھی ہے کہ اس میں ہندوستانی الفاظ عربی فارسی رسم الخط کے ساتھ ساتھ دیوناگری خط میں بھی دیے گئے ہیں۔ یہ ایک اہم اضافہ تھا جو شُلز نے اپنی قواعد میں پیش کیا۔

شُلز نے اپنے دیباچے میں اردو زبان کے آغاز کے بارے میں بھی قیاسات کے سہارے ایک نقطۂ نظر پیش کرنے کی کوشش کی ہے شُلز کی رائے کے مطابق اردو زبان کو مغربی افراد نے "Moors" زبان کا نام دیا تھا، لیکن اس کا حقیقی نام ''ہندوستانی'' ہی ہے۔ ڈاکٹر رضیہ نور محمد نے البتہ شُلز کی تحقیق اور رائے کو نہ صرف غلط بلکہ گمراہ کن کہا ہے شُلز کے مطابق:

> The Language, whose rudiments I am about to explain, is usually known to the Europeans by the name of Moors Language,but its proper and original name is Hindoostanee.. The original livingناگری Hindee or ہندی language of Hindustanee is termed Nagaree, the mixed language, constituted of the Hindee and the persian, since the conquest of India by Taimur, is called Hindostanee and by us Moors

after the portugees who named it Morvico.(14)

اس طویل اقتباس میں چند نکات غور طلب ہیں۔ سب سے پہلے یہ کہ اس کو مورس زبان کا نام یورپی افراد نے دیا تھا اور سب سے پہلے پرتگالی قوم نے اسے Morvico نام دیا تھا۔ رضیہ نور محمد نے اس نام کو شُلز کی گمراہی اور غلط فہمی سے محمول کیا ہے۔ دوسرا یہ کہ امیر تیمور کے حملوں کے بعد یہ زبان ہندوستانی کا نام اختیار کر گئی، اس سے قبل یہ ہندی یا ناگری زبان کہلاتی تھی۔ جہاں تک ناگری لفظ کا تعلق ہے، یہ رسم الخط کا نام تھا جو شُلز کو سمجھ نہیں آیا البتہ ہندی/ہندوی نام تو اس زبان کو دیا جاتا رہا۔ اس کی مزید بحث ہمارے موضوع سے لگا نہیں کھاتی۔ اردو زبان کے بارے میں شُلز کی بحث کو رضیہ نور محمد نے غیر معیاری کہا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ شُلز کی اردو زبان کے مختلف ناموں اور آغاز و ارتقاء کے بارے میں بحث گمراہ کن ہے اور آج کی تحقیق کی روشنی میں غلط اور لسانی اعتبار سے ناقص ہے۔(۱۵)

آخر میں شُلز کے بارے میں ایک اہم بات یہ سامنے آئی ہے کہ شُلز نے اس سے قبل لکھی گئی جون جوشوا کیٹلر کی گریمر کا نہ صرف مطالعہ کیا تھا بلکہ اس سے رہنمائی لی تھی۔ اس کی اہمیت کا اعتراف اپنی گریمر کے دیباچے میں کیا تھا جو ۱۷۴۱ء میں لکھا گیا تھا۔ ۱۷۴۴ء میں ڈیوڈ ملیس (David Millius) نے جب اپنا انتخاب (Ddissertation Selectae) چھاپا تو اس میں کیٹلر اور شُلز کی قواعدی کتب کا ذکر بھی کیا۔ اس انتخاب میں ان دونوں کی گریمر کے کچھ حصے شائع بھی کیے۔ اس سے یہ گریمر یورپی دنیا میں متعارف ہوئی اور شُلز کو اور اس کے کام کو بین الاقوامی سطح پر جانا گیا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں:

> لاطینی یا کسی بھی زبان میں اردو کی قدیم ترین قواعد جان جوشوا کیٹلر کی قواعد ہے۔۔۔شُلزے اعتراف کرتا ہے کہ مستشرقین سے اس زبان کا تعارف کرانے اور اس کی اہمیت واضح کرنے میں اوّلیت کا فخر کیٹلر کو حاصل ہے اور اسی نے راہ ہموار کی جس پر شُلزے خود گامزن ہوا۔ وہ اپنی اس قواعد کو کیٹلر کی قواعد کی توضیح اور اضافہ قرار دیتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ جان جوشوا کیٹلر کی اردو کی اوّلین قواعد کے مندرجات شُلزے کے پیش نظر رہے اور اس

نے برصغیر میں اپنے قیام کے دوران اس زبان کو مختلف ذرائع سے سیکھا اور اس
کی قواعد مرتب کی۔ (۱۶)

الغرض شُلز کی مذہبی ذمہ داریاں جو بھی تھیں، اس کے مقامی زبانوں میں بائبل کے تراجم ٹھیک تھے یا متنازعہ تھے، اس کے ساتھ اس کے ساتھی افراد کا اس سے کیا سلوک یا چپقلشیں رہیں، ان سے قطع نظر یہ بات اہم ہے کہ کیٹلر کی اوّلین قواعد کے بعد اس نقش اوّل کی توضیح وتوسیع کی صورت میں شُلز کی ہندوستانی گرائمر سامنے آئی۔ اس کتاب کی تاریخی اور لسانی اہمیت ہمیشہ رہے گی۔ آج کی جدید قواعد کے اصول بھی شُلز کی قواعد نویسی اور اس کے مشمولات کی ترتیب سے بہت زیادہ مختلف نہیں ہے۔ یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ کیٹلر سے جان گل گرسٹ تک کی قواعدگی روایت میں شُلز کی گریمر ایک اہم مقام کی حامل ہے اور اس عبوری دور میں یہ اضافہ قواعد کے سفر کو آگے بڑھانے یں ممد و معاون ثابت ہوا۔ اس کی اہمیت آج تک مسلمہ ہے۔

حوالہ جات وحواشی:

۱۔ ساجد جاوید، ڈاکٹر جان بورتھوک گل کرسٹ کی لسانی خدمات، مقالہ برائے پی ایچ ڈی، نمل اسلام آباد، ۲۰۱۴ء، ص

۲۔ بنجمن شُلز کی اس قواعد کو ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے ''ہندوستانی گرائمر'' کے عنوان سے اردو ترجمے کے ساتھ ۱۹۷۷ء میں شائع کیا اور اس پر تفصیلی مقدمہ شامل ہے۔

۳۔ شُلز کے حالات زندگی کے بارے میں بہت زیادہ معلومات نہیں ملتیں۔ اس پیراگراف میں موجود مواد کا ماخذ یہ ہے۔

Biographical Dictionary of Christian Mission, By Gerld H. Anderson.

۴۔ ایضاً

۵۔ سلیم الدین قریشی، اٹھارھویں صدی کی اردو مطبوعات (توضیحی فہرست) (اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۳) ص۱۹۔۱۸

۶۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، ہندوستانی گرائمر (لاہور؛ مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۷ء)، ص۳۰

۷۔ ایضاً۔ص۳۰

۸۔ سلیم الدین قریشی کی کتاب اٹھارویں صدی میں اردو مطبوعات کے صفحہ ۱۸ پر اس کتاب کا حوالہ بنجمن شُلز کے نام سے موجود ہے۔ اس کتاب کا عنوان اطالوی زبان میں ہے۔ اس کتاب کے بارے میں

عنوان کے علاوہ اردو میں آدھی سطر کا عنوان بھی ہے۔ اس کے علاوہ اس کے بارے میں کچھ معلومات نہیں ملتیں۔ دوسری کتاب بھی تبلیغی مشن کے سلسلے میں ترجمہ شدہ کتاب ہے۔ دونوں کتب بالترتیب ۱۷۴۲ء، ۱۷۴۴ء کے سنین کے ساتھ ملتی ہیں۔

9. Biographical Dictionary, edited by Gerald H. Anderson, 1999, Wm. B.Eerdsman publishing, 1999.

۱۰۔ عتیق صدیقی، گل کرسٹ اور اس کا عہد، ص ۵۱

۱۱۔ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے شلز کی کتاب کو اردو ترجمے کے ساتھ شائع کیا تھا۔ صدیقی نے شلز کو شلزے لکھا ہے۔ اصل میں یہ نام شُلز ہے۔ دوسرے ہالے کو ہال لکھا ہے جو شائد انگریزی ہجوں کے حساب سے لکھا ہی۔ صدیقی کا ۱۷۴۵ء والی اشاعت کا دعوی ہندوستانی گرائمر کے صفحہ نمبر ۶ پر دیکھا جا سکتا ہے۔ کتاب کا حوالہ اوپر موجود ہے۔ ڈاکٹر مس رضیہ نور محمد نے اپنی کتاب ''اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی و ادبی خدمات'' میں اس کا سن ۱۷۴۱ء لکھا ہے جو صحیح ہے۔ صفحہ نمبر ۲۱ پر یہ دعویٰ دیکھا جا سکتا ہے۔

۱۲۔ ہندوستانی گرائمر، ص ۳۰

۱۳۔ رضیہ نور محمد، ڈاکٹر، اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ص ۲۲

۱۴۔ شُلز، بنجمن، دیباچہ ہندوستانی گریمر، مشمولہ اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات، ص ۲۳

۱۵۔ رضیہ نور محمد، ص ۲۳ ۔ ۲۲

۱۶۔ ہندوستانی گرائمر، ابو اللیث صدیقی، ص ۲۹

2.4

جارج ہیڈلے (Hadley) کی اردو قواعد ولغت نویسی

ماقبل نوآبادیاتی عہد میں، بنگال کی فتح (۱۷۵۷ء) نے انگریزوں کے سیاسی مقاصد کو واضح کر دیا تھا۔ جنگ پلاسی اور بکسر کی فتح نے ان میں مزید فتوحات کے لیے حوصلہ بڑھایا۔ اس خطے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے تحت جزوی طور پر حکومتی امور کو چلانے کے لیے انگریز فوجی بنگال میں تعینات کیے جانے شروع کیے گئے۔ ان انگریز افسران میں جارج ہیڈلے نامی ایک فوجی کیڈٹ ۱۷۶۳ء میں بنگال آیا۔ اسی سال ۱۹ جون کو اس کو فوج میں کمیشن ملا۔ لیفٹیننٹ کیپٹن بنا اور ۳ دسمبر ۱۷۷۱ء میں ریٹائرڈ ہوا۔(1) بنگال آرمی میں موجود مقامی ہندوستانی سپاہیوں سے گفت وشنید کے لیے جارج ہیڈلے نے مقامی ہندوستانی زبان کی تحصیل کا منصوبہ بنایا۔ اس کو یہ امر واضح ہو گیا تھا کہ جب تک مقامی افراد کی زبان نہ سیکھی جائے، ان کو سمجھنا، اور ان سے احکامات کے مطابق کام لینا مشکل امر ہوگا۔ اس کام کے لیے اس کو مقامی زبان کی قواعد ولغت کی ضرورت پڑی تو کوئی تسلی بخش معاون کتاب نہ ملی۔ چنانچہ اس نے ہندوستانی اور فارسی زبانوں کی گریمر لکھنے کی طرف توجہ کی۔ ہیڈلے نے زبانوں کی تحصیل کے لیے کسی لمبے چوڑے منصوبے کی بجائے صرف گریمر کے اصولوں تک ہی خود کو محدود رکھا۔ ۱۷۶۵ء میں اس نے ہندوستانی (اردو) گریمر لکھی۔ ہیڈلے نے اپنی

گریمر کا معیاری نسخہ ۱۷۷۲ء میں شائع کیا۔ اس گریمر کا عنوان یہ تھا:

Grammatical Remarks on the Pratical and Vulgar Dialect of the Indostan Language, commonly called Moors, with a Vocabulary of English and Persian, (London 1772).(2)

یہ کتاب ۱۷۷۲ء میں لندن سے شائع ہوئی تو پہلی مرتبہ ایک جامع قواعد ولغت کا درجہ اختیار کر گئی۔ اس کتاب کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے جس سے اس کی انگلستان اور ہندوستان میں مقبولیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کتاب کا پہلا حصہ قواعد پر مشتمل تھا لیکن اس کے دوسرے حصے میں اردو انگریزی اور فارسی الفاظ و مترادفات کی شمولیت سے یہ خاص اہمیت کی حامل لغت بن کر سامنے آئی۔ جارج ہیڈلے کی اس کتاب کی مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہ کسی پہلے انگریز مصنف کی تحریر کردہ کتاب تھی جو انگریزی زبان میں ہی لکھی گئی تھی۔ ماضی میں کیٹلر شلز وغیرہ کی کتب لاطینی زبان میں لکھی گئی تھیں جن کو بعد میں انگریزی ترجمہ کر کے مطالعہ کیا جاتا تھا چناں چہ ایک انگریز کی اپنی زبان میں لکھی گئی یہ کتاب بہت جلد مقبولیت اختیار کر گئی۔ جارج ہیڈلے بنگال میں فوجی ملازمت پر آیا تو اپنے سپاہیوں کی ہندوستانی زبان کی اصلاح کے مقصد کے تحت یہ کتاب تحریر کی۔ اس کتاب کے متعدد ایڈیشن ۱۷۷۲ء، ۱۷۷۴ء، ۱۷۷۹ء، ۱۷۹۴ء، ۱۷۹۴ء، ۱۸۰۲ء، ۱۸۰۹ء، میں شائع ہوئے جو اس کی مقبولیت کی دلیل بنتے ہیں۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں:

> مولوی عبدالحق صاحب کا بیان ہے کہ ہیڈلے کی گریمر ۱۷۷۲ء میں شائع ہوئی۔ اصل صورت حال یہ ہے کہ ہیڈلے سنہ ۱۷۶۳ء میں بنگال آرمی میں داخل ہوا اور اس سلسلے میں اسے ہندوستانیوں کی ایک کمپنی کی سربراہی پرد ہوئی۔۔۔ اس نے سنہ ۱۷۶۵ء میں بہ قول خود اپنے سپاہیوں کے لیے اس زبان کے قواعد مرتب کیے، جسے لندن کے ایک تاجر نے سنہ ۱۷۷۰ء میں شائع کیا۔ یہ گویا ہیڈلے کی قواعد کا پہلا ایڈیشن تھا اور کم وبیش اسی زبان سے

گریمر کا معیاری نسخہ ۱۷۷۲ء میں شائع کیا۔ اس گریمر کا عنوان یہ تھا:

Grammatical Remarks on the Pratical and Vulgar Dialect of the Indostan Language, commonly called Moors, with a Vocabulary of English and Persian, (London 1772).(2)

یہ کتاب ۱۷۷۲ء میں لندن سے شائع ہوئی تو پہلی مرتبہ ایک جامع قواعد و لغت کا درجہ اختیار کر گئی۔ اس کتاب کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے جس سے اس کی انگلستان اور ہندوستان میں مقبولیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کتاب کا پہلا حصہ قواعد پر مشتمل تھا لیکن اس کے دوسرے حصے میں اردو انگریزی اور فارسی الفاظ و مترادفات کی شمولیت سے یہ خاص اہمیت کی حامل لغت بن کر سامنے آئی۔ جارج ہیڈلے کی اس کتاب کی مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہ کسی پہلے انگریز مصنف کی تحریر کردہ کتاب تھی جو انگریزی زبان میں ہی لکھی گئی تھی۔ ماضی میں کیٹلر شلز وغیرہ کی کتب لاطینی زبان میں لکھی گئی تھیں جن کو بعد میں انگریزی ترجمہ کر کے مطالعہ کیا جاتا تھا چناں چہ ایک انگریز کی اپنی زبان میں لکھی گئی یہ کتاب بہت جلد مقبولیت اختیار کر گئی۔ جارج ہیڈلے بنگال میں فوجی ملازمت پر آیا تو اپنے سپاہیوں کی ہندوستانی زبان کی اصلاح کے مقصد کے تحت یہ کتاب تحریر کی۔ اس کتاب کے متعدد ایڈیشن ۱۷۷۲ء، ۱۷۷۴ء، ۱۷۷۹ء، ۱۷۹۴ء، ۱۷۹۶ء، ۱۸۰۲ء، ۱۸۰۹ء، میں شائع ہوئے جو اس کی مقبولیت کی دلیل بنتے ہیں۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں:

> مولوی عبدالحق صاحب کا بیان ہے کہ ہیڈلے کی گریمر ۱۷۷۲ء میں شائع ہوئی۔ اصل صورت حال یہ ہے کہ ہیڈلے سنہ ۱۷۶۳ء میں بنگال آرمی میں داخل ہوا اور اس سلسلے میں اسے ہندوستانیوں کی ایک کمپنی کی سربراہی سپرد ہوئی۔۔۔ اس نے سنہ ۱۷۶۵ء میں بہ قول خود اپنے سپاہیوں کے لیے اس زبان کے قواعد مرتب کیے، جسے لندن کے ایک تاجر نے سنہ ۱۷۷۰ء میں شائع کیا۔ یہ گویا ہیڈلے کی قواعد کا پہلا ایڈیشن تھا اور کم و بیش اسی زبان سے

تعلق رکھتا تھا جب شُلزے کی قواعد کی اصل لاطینی متن کا انگریزی ترجمہ ہوا تھا۔
اس کے بعد ہیڈلے نے اس پر نظر ثانی کی اور اپنی انگریزی میں اس کا دوسرا
ایڈیشن سنہ ۱۷۷۲ء میں شائع کیا۔ مولوی صاحب نے غالباً اسی دوسرے
ایڈیشن کا حوالہ دیا ہے۔ (۳)

ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کے مذکورہ بالا اقتباس سے تین باتیں واضح ہو کر سامنے آتی ہیں۔ اوّل یہ کہ ۱۷۷۲ء والا ایڈیشن پہلا نہیں تھا بلکہ دوسرا ایڈیشن تھا جو مصنف و مرتب کی ذاتی دل چسپی سے چھپا تھا۔ دوم یہ کہ لندن کے تاجر والا ایڈیشن ناپختہ نقش تھا۔ جب کہ دوسرا ایڈیشن ہیڈلے کی اپنی املا یعنی ''اپنی انگریزی زبان'' میں چھپا تھا۔ سوم یہ کہ یہ کتاب غیر ملکی افراد یا انگریزوں کے لیے نہیں چھپا تھا بلکہ اس کی اشاعت کا مقصد بنگالی سپاہیوں کی زبان کی اصلاح کرنا تھا، جن کی ہندوستانی یعنی اردو زبان معیاری نہیں تھی۔ اس عہد میں جب کہ ابھی ہندوستانی بنگال کی سرزمین پر اتنی گہرائی میں نہیں گئی تھی تو بنگالی سپاہیوں کا اس زبان میں ماہر نہ ہونا فطری سی بات ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ ہندوستانی زبان میں معیاری لب و لہجے سے بولنے پر قادر نہیں تھے تو کیا وہ انگریزی زبان میں اتنے ماہر تھے کہ اردو گریمر کے اصول انگریزی میں نہ صرف پڑھ سکیں بلکہ ان کو سمجھ بھی لیں۔ مستقبل کا محقق اس سوال کا جواب تلاش کرے گا کہ انگریزی زبان میں لکھے گئے اردو قواعدی اصول بنگال سپاہیوں کو اردو سکھانے میں کس درجہ تک معاون ہوئے۔

جارج ہیڈلے کی قواعد ایکدم اہمیت و شہرت کی حامل بن گئی۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ یہ کسی بھی انگریز کی، یہ پہلی قواعد تھی جو کہ شائع ہوئی۔ جس بہتر انداز میں ایک انگریز مصنف انگریزی سے مثالیں مترادفات اور ترجمہ کر کے غیر ملکی زبان سمجھا سکتا ہے، اتنی کامیابی سے کیٹلر شُلز کی قواعد یہ کام انجام نہ دے سکی تھی۔ اس کا تیسرا ایڈیشن ۱۷۷۴ء میں پھر ۱۷۷۹، پھر ۱۷۹۴، ۱۷۹۷، ۱۸۰۲ اور ۱۸۰۹ء میں شائع ہوتے تقریباً آٹھ ایڈیشن چھپے۔ یہ بار بار کی اشاعت اس کتاب کی اہمیت اور مقبولیت کا ثبوت ہے۔ اس کتاب کا جو ایڈیشن ۱۸۰۲ میں شائع ہوا، اس میں کتاب کے عنوان میں بھی تبدیلی کر دی گئی۔ مرزا محمد فطرت لکھنوی نے

A compendious grammar of the current corrupt dielct of the Jargon of Hindostan,(commonly called Moors),with a vocabulary English and Moors,Moors and English,with reference between words resembling each other in sound and different in signification and literal translation of the compunded words and the circumlocatory expressions and Manners of Bengal, for the use of Bengal and Bombay establishments. at Arabic and Persian press 1802.(5)

اس کتاب کی اہمیت اس طور بڑھ جاتی ہے کہ ہیڈلے نے کتاب کی ہر نئی اشاعت میں کوشش کی تھی کہ ترمیم و اضافے سے اسے بہتر بنایا جا سکے۔ راقم کے پیش نظر اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن ہے جو ۱۷۷۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اس ایڈیشن میں کتاب کے عنوان میں بھی تبدیلی کی گئی تھی جو یوں ہے:

Grammatical Remarks on the Practical and current Dialect of the Jargon of Hindoostan; with a Vocabulary where in are References between words resembling each other in sound and different in their signification.

اس کتاب کا انتساب وارن ہیسٹنگز (Warren Hastings) کے نام ہے۔ کتاب کے پہلے انتیس صفحات پر قواعدی مباحث کا مختصر سا حصہ موجود ہے۔ اس کے بعد انگریزی اور اردو (ہندوستانی) الفاظ کے نئے ذخیرہ الفاظ کے انگریزی عنوان کے تحت قواعد کا حصہ شامل ہے۔ اس کتاب میں قواعد کے ساتھ ساتھ ہندوستانی، انگریزی اور فارسی زبانوں کے مترادفات کو شامل کر کے لغت کے حصے کے طور پر کتاب کا حصہ بنایا گیا ہے۔ یہ رجحان اس عہد میں عام تھا کہ الگ سے لغت لکھنے کے بجائے مستشرقین قواعدی مشمولات کے ساتھ ساتھ

اہم اور ضروری ذخیرۂ الفاظ کی فہرست یا صفحات ساتھ ہی شامل کر دیتے تھے۔ تلفظ اور ہجا کے متبادل فارسی حروف کے استعمال سے اردو کو پڑھنا سمجھنا آسان بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس حصے میں واضح کیا گیا ہے کہ اس میں ان الفاظ کو شامل کیا گیا ہے جو بنگالی کی عمومی زندگی سے متعلق ہے۔ اس لغت کے مطالعے سے قبل دیباچے کے آٹھ صفحات شامل ہیں جن میں اصولِ لغت اور تلفظ و معنی کے مابین تعلق کی وضاحت کی گئی ہے۔ ہیڈلے کی لغت میں الفاظ کے اندراجات کی مثال یوں ہے:

(1). Accessory. Sautee, one who was together with any person, literally. Ey,aar, an assitant.

(2). to adjust, Millouna, as, a quarrel. Durust Kurana, to set to right. Baundobust Kurna, to make up, as accounts. Seedah Kurna, to make straight. Theeke Kurna, to make sitting.Burrabur Kurna, to máke even".(6)

ان دو مثالوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ لغت کا حصہ معنی و مترادفات کو واضح کرنے میں زیادہ کام یاب ثابت نہیں ہوتا۔ دوسرا اس کے رومن رسم الخط میں بھی ابہام کی صورتیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس کتاب کی مقبولیت محض پہلے انگریز مصنف کی تالیف ہونے کی وجہ سے ہو گی۔ جارج ہیڈلے کی کتاب میں اٹھانوے صفحات پر لغت کا حصہ پھیلا ہوا ہے۔ اس کے بعد تقریباً ایک سو اسی صفحات پر مکالمات کا سلسلہ دیا گیا ہے۔ اگر اس لغت کا تقابل ہیڈلے کے معاصر لغت نویسوں سے کیا جائے کے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ لغت اپنے دور کے حساب سے گو اہم ہو لیکن جان گل کرسٹ کی لغت کے نمونوں کے سامنے ایک غیر پختہ روپ پیش کرتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ جان گل کرسٹ کی تحریر کے سامنے ہیڈلے کی لغت ایک نو آموز طالب علم کی سی ہے تو بے جا نہیں ہے۔ ہیڈلے کے بعد کیپٹن جان فرگوسن کی "A Short Dictionary of Hindostani Language" شائع ہوئی۔ اس کتاب کا پہلا حصہ انگریزی ہندوستانی اور دوسرا حصہ ہندوستانی انگریزی لغت

مشتمل تھا۔ اس لغت میں قواعد کا حصہ شامل کر دیا گیا تھا۔ یہ لغت ۱۷۷۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ جارج ہیڈلے کے معاملے میں ایک چیز سامنے رکھی جانی ضروری ہے کہ ہیڈلے کا یہ کام تاریخی اعتبار سے ایک اہم کام تھا۔ اپنی قواعد و لغت کی ترتیب و تالیف کے لیے اس نے اس طرح کی جاں فشانی سے ہندوستان کے مختلف شہروں کا سفر کر کے نہ تو کوئی مواد اکٹھا کیا تھا نہ ہی اس کا عوام و خواص کے تلفظ لہجے اور ذخیرہ الفاظ کے بارے میں کوئی خاص نقطہ سامنے آیا تھا۔ اگر ہیڈلے کی اس کتاب کا جان گل کرسٹ کی کتابوں سے موازنہ کیا جائے تو اس پہلو کوئی مدنظر رکھا جانا چاہیے۔

''گریمٹیکل ریمارکس'' ہندوستان کی اس اہم زبان کی قواعد ہے جو اس دور میں ہندوستان کے عوام و خواص کی بول چال میں زیر استعمال تھی۔ اس کتاب کے مصنف نے اس زبان کو Jargon زبان کہا ہے۔ جارگن انگریزی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی بازاری زبان، پھوہڑ زبان، اصطلاح پیشہ وراں، کسی خاص طبقے کی زبان، مخلوط زبان، بے تمیز اور پھوہڑ زبان وغیرہ کے ہیں۔ لفظ جاگن کے استعمال سے پتا چلتا ہے کہ غیر ملکی افراد فارسی کے مقابلے میں ہندوستانی کو غیر واضح روپ کی بولی خیال کرتے تھے، جس کے لب و لہجے اور الفاظ و مرکبات میں علاقائی نسبت سے اختلاف پایا جاتا تھا۔ یہ گریمر دراصل اسی بول کی قواعد تھی جسے غیر ملکی اس دور میں Moors زبان یعنی غیر واضح زبان کہا کرتے تھے۔ دوسرا زاویہ اس زبان کو کمتر سمجھنے کا یوں بھی تھا کہ یہ زبان/ بولی عوام سے جڑی ہوئی تھی اور طبقہ اشرافیہ سے نہ جڑے ہونے کے باعث اسے زیادہ مقام نہیں دیا گیا تھا۔ لیکن اس کی افادیت اور اہمیت کو انگریز لوگ بہ خوبی سمجھ رہے تھے۔

ہیڈلے کی گریمر میں بول چال کے جملے اور گریمر کے قوانین کو دراصل بنگال اور بمبئی کی پریزی ڈنسیوں میں کام کرنے والے اسٹیبلشمنٹ کے اہل کاروں کی سہولت کے لیے مرتب کیا گیا تھا۔ جیسا کہ اس کتاب کے ٹائٹل سے واضح ہوتا ہے۔ اس کتاب کا انتساب وارن ہیسٹنگز (Warren Hastings) کے نام ہے جو اس عہد میں بنگال کے گورنر جنرل تھے اور فورٹ ولیم قلعے میں سکونت پذیر تھے۔ ڈاکٹر جان بورتھ وک گل گرسٹ جب

ہندوستان آئے تو اس وقت ہیڈلے کی گریمر خاصی معروف ہو چکی تھی اور اسے نو وارد مغربی افراد کے لیے رہنما کتاب کی اہمیت حاصل تھی۔ جان گل کرسٹ نے اس کتاب کا مطالعہ کیا تھا، لیکن یہ بات بھی اہم ہے کہ گل کرسٹ، ہیڈلے کے کام سے مطمئن اور معترف نہیں تھا۔

جان گل کرسٹ کی لغت کی اشاعت (۱۷۸۶ء) کے بعد ہیڈلے نے اپنی کتاب کا نظر ثانی شدہ اور ترمیم و اضافے کے ساتھ واضح ایڈیشن شائع کیا۔ اس وقت عجیب صورتحال پیدا ہوئی جب جان گل گرسٹ نے ہیڈلے پر الزام لگایا کہ اس نے بغیر پوچھے اور حوالہ دیے گل کرسٹ کی لغت سے بہت سے الفاظ اپنی کتاب میں شامل کیے تھے۔ اس جرم کی پاداش میں گل کرسٹ نے دو ایک جگہ ہیڈلے کی گوشمالی بھی کی تھی۔ گل کرسٹ کے اس سخت رویے سے ان کی علم دوستی پر سوالیہ نشان اٹھتا ہے۔ گل کرسٹ کا الزام یہ تھا کہ ہیڈلے نے اپنے ۱۷۹۷ء والے ایڈیشن میں اس کی ۱۷۹۰ء والی جلد دوم سے بہت سے الفاظ بنا پوچھے اپنی لغت میں شامل کیے تھے۔ مزید یہ کہ گل کرسٹ نے اسے دو کوڑی کی کتاب کہا تھا جو تکلیف دہ بات ہے۔ (۷) لیکن یہ سوال اپنی جگہ اہم ہے کہ ہیڈلے کی کتاب گل کرسٹ سے پہلے بھی موجود تھی۔ اس لیے یہ الزام مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

۱۸۰۲ء میں مرزا محمد فطرت لکھنوی نے ہیڈلے کی گریمر کو توسیع و اصلاح کے عمل سے گزار کر زیادہ مستند ایڈیشن چھاپا۔ یہ اس گریمر کا چھٹا ایڈیشن تھا اور اور ہیڈلے کی وفات کے بعد شائع ہوا۔ مرزا محمد فطرت کے بارے میں زیادہ معلومات تو تاریخ کا حصہ بن گئیں۔ بس اتنا پتا چلتا ہے کہ وہ لکھنؤ کا رہنے والا تھا۔ وہ چار سال کے لیے (۱۸۰۱ء۔ ۱۷۹۸ء) انگلینڈ رہا تھا۔ وہاں وہ مختلف اداروں میں عربی، فارسی اور ہندوستانی زبان کی تدریس کرتا رہا۔ اس عہد میں ہیڈلے کی گریمر کا کسی دیسی باشندے کے قلم و ذہن سے مطالعہ کرنا اور اصلاح کرنا، اس ایڈیشن کی اہمیت میں اضافے کا سبب بنا۔ یہ مرزا فطرت ۱۸۰۳ء کے قریب قریب کلکتہ میں موجود تھا۔ جان گل کرسٹ نے اس کی سفارش کر کے اسے فورٹ ولیم کالج میں اسی روپے ماہوار پر ملازم کرایا تھا۔ (۸)

ہیڈلے کی گریمر کی ایک اور خاص بات یہ ہے کہ اس کے تیسرے ایڈیشن سے، جو کہ

۱۷۸۴ء میں شائع ہوا تھا، مکالمات (Dialogues) کو گریمر میں شامل کرنے کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ غالباً یہ مکالمات آنے والے انگریزوں کی مقامی زبان سے عملی تربیت کا ہی ایک حصہ تھے تا کہ اگر وہ فوری طور پر یہ زبان سیکھ نہ بھی سکیں تو کم از کم روز مرہ زندگی کے امور چلانے کے لیے بنے بنائے جملے سیکھ کر اس سے کام چلا سکیں۔ Dialogues لکھ کر زبان سکھنے کا یہ تجربہ کام یاب رہا یہی وجہ ہے کہ آگے چل کر جان گل کرسٹ نے بھی مکالمات کے عنوان کے تحت ہر کتب میں گوشے ہی نہیں بنائے بلکہ اس کی اہمیت کے پیش نظر کتاب لکھی تھی (جس کا آگے چل کر تذکرہ کیا جائے گا)Richerd Steadman Jone لکھتا ہے:

> "Dialogues and Familiar Phrases first became available to learners of Hindustani when the third edition of Hadley's Grammatical Remarks was published in 1784. Hadley presents the material under three different headings. First there is a collection of 'familari phrases' or useful expressions in Hindustani with literal English translations organised under12 functional Headings: to consult for example, or, 'to assent and dissent'."(9)

جارج ہیڈلے کی گریمر میں اگر چہ نحو کا حصہ نہیں تھا لیکن پھر بھی مکالمات کا یہ سلسلہ، چھوٹے چھوٹے جملے (Imperatives) شامل کرنا ان کی اہمیت اور ضرورت کو واضح کرتا ہے۔ آگے چل کر جان گل کرسٹ نے اس روایت کو مزید آگے بڑھایا تھا۔ اس نے اپنی کتاب کے آخری حصے میں تقریباً ایک سو اسی صفحات پر مختلف مواقع کی مناسبت سے کارآمد مکالمات(Dialogues) درج کیے ہیں۔ یہ مکالمات بہت زیادہ واضح نہیں ہیں بلکہ تلفظ کے معاملے میں بھی ان کی صحت درست نہیں ہے۔ مزید یہ کہ اس کی اہمیت اس دور میں اس لیے تسلیم کی گئی کہ کسی انگریز کی لکھی گئی پہلی کتاب تھی البتہ گل کرسٹ کی تحریر مکالمات قواعد اور لغت کے مقابلے میں یہ کتاب کسی طور پر معیاری ثابت نہیں ہوتی۔ مکالمات کی ذیل میں

ہیڈلے نے ایک باب میں عورتوں کے گھریلو استعمال کے مکالمات بھی درج کیے ہیں۔ ان مکالمات میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ انگریز عورتوں کو گھریلو کام کاج کرانے کے لیے نوکروں اور نوکرانیوں کو کس انداز سے مخاطب کرنا ہے۔ اس حصے میں حفظ مراتب کے حساب سے بتایا گیا ہے کہ عورت نے نوکرانی سے کس انداز سے بات کرنی ہے اور مرد حضرات کو مقامی مردوں سے کس طرح کی گفتگو کی ضرورت پیش آ سکتی ہے۔

ہیڈلے کی گریمر چوں کہ بنگال آرمی میں اس کی تعیناتی اور دیسی مقامی سپاہیوں سے بول چال کے مقصد کے تحت بھی لکھی گئی تھی اس لیے اس میں (Military Dialogues) کے عنوان سے مکالمات موجود ہیں۔ یہ مکالمات فوجی افسر کی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے لکھے گئے ہیں کہ سپاہیوں کو جنگ پر کس طرح بھیجنا ہے، کسی مسئلے میں ان کو احکامات کس طرح دینے ہیں۔ فتح کا جشن کس طرح منانا ہے وغیرہ۔ ہیڈلے کے ان مکالمات سے دو زبانوں میں روزمرہ گفتگو کی ہیئت اور ترجمے کے نظام کو بہ خوبی سمجھایا جا سکتا ہے۔ غرض یہ کہ ہیڈلے کی گریمر کی منہاج اور موضوعات کو معمولی تبدیلیوں کے ساتھ جان گل کرسٹ نے جاری رکھا تھا۔

(نوٹ) یہ مضمون راقم کے پی ایچ۔ ڈی مقالے سے اخذ اور تبدیل شدہ صورت میں پیش کیا گیا ہے۔

حوالہ جات اور حواشی:

۱۔ Gordon Goodwin, A Dictionary of National Biograph (1885-1900) Volume,23, cited at, en-wikisource/wiki/Hadley-George-(d1798) (DN Boo) Accessed on 04/05/2013

۲۔ Ibid..

۳۔ ابواللیث صدیقی، مقدمہ، ہندوستانی گرائمر، ص ۸

۴۔ سلیم الدین قریشی، اٹھارھویں صدی کی اردو مطبوعات (توضیحی فہرست) (اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۳ء) ص ۳۲

۵۔ یہ کتاب google books پر pdf فارمیٹ میں موجود ہے۔ اس کو download کیا جا سکتا ہے۔ راقم کے پاس اس کا ڈاؤن لوڈ کیا ہوا نسخہ موجود ہے۔

۶۔ Hadley, George, Grammatical Remarks on the Practical and Current Dialect of the Jargon of Hindoostan with a vocabulary— T. Cadell, in the Strand, London, P.3

۷۔ عتیق صدیقی، گل کرسٹ اور اس کا عہد، ص ۵۳

۸۔ مرزا محمد فطرت لکھنوی کے بارے میں بنیادی باتیں عتیق صدیقی کی دونوں کتب اور جامع القواعد حصہ صرف میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

۹۔ Richard Steadman Jones,Colonialism and Grammatical Representation,(Oxford, Blackwell Publishing Ltd. Oxford U.K., 2007) p.96

2.5

ولیم جونز: کلاسیکی مشرقی متون کا مطالعہ اور تقابلی لسانیات کا آغاز

ولیم جونز (۱۷۹۴ء۔ ۱۷۴۶ء) کا تقرر ہندوستان میں ہائی کورٹ (بنگال) کے ایک جج کے طور پر ہوا تھا۔ لیکن قانون کے شعبے کے ساتھ ساتھ ان کی دل چسپی کے میدانوں میں فلالوجی، مشرقی علوم و زبان اور تقابلی لسانیات نمایاں رہے تھے۔ ہندوستان آ کر وہ ہندوستانیات (Indology) کے طالب علم بنے۔ یہاں پر آ کر انھوں نے سنسکرت سیکھی تو اس بڑی کلاسیکی زبان کا نظام، ذخیرۂ الفاظ اور ادبیات دیکھ کر حیران ہوئے۔ مقامی زبان کے مطالعے نے ان کو اس بات کی طرف متوجہ کیا کہ یہ زبان یورپ کی کچھ زبانوں کے ساتھ مماثلت رکھتی ہے۔ چناں چہ اس پر تحقیق شروع کی اور یورپ کو سنسکرت کی اہمیت اور یورپی کلاسیکی زبانوں کے مماثلتوں کے بارے میں آگاہ کیا۔ ہندوستان میں انھوں نے اس طرح تقابلی لسانیات کی بنیاد ڈالی۔ اس کے اعزاز میں یہ بات بھی شامل ہے کہ یہاں انھوں نے ۱۷۸۴ء میں رائل ایشاٹک سوسائٹی آف بنگال کے نام سے ایک ادارہ بنایا جس نے ہندوستانی زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے لیے ایک بڑا پلیٹ فارم لکھنے والوں کو مہیا کیا۔

ولیم جونز ۲۸ ستمبر ۱۷۴۶ء کو انگلینڈ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ولیم میری نکس جونز ایک ریاضی دان تھے اور اس سے زیادہ بڑی بات یہ کہ مشہور سائنسدان نیوٹن کے دوست تھے۔ ولیم جونز کی عمر تین سال ہی تھی کہ باپ کا سایہ دنیا سے اٹھ گیا۔ انھوں نے انگلینڈ کے مشہور سکول Harrow میں داخلہ لیا اور وہاں پر ''کلاسیکی سکالرشپ'' کا میدان منتخب کیا۔ ان کو مختلف زبانوں کے ساتھ اتنی دل چسپی پیدا ہوئی کہ مغربی زبانوں کے ساتھ ساتھ مشرقی زبانوں کی تحصیل بھی شروع کر دی۔ وہ تقریباً ۲۸ زبانوں میں مہارت رکھتے تھے۔ ۱۷۶۴ء میں آکسفورڈ کے یونیورسٹی کالج میں داخلہ لیا۔ یہاں پر ان کی دل چسپی کے شعبوں میں مشرق وسطیٰ کا خصوصی مطالعہ شامل تھا۔ عربی زبان و ادب کے ساتھ فلسفہ، مشرقی ادب، یونانی و عبرانی، ہسپانوی، پرتگالی اور چینی زبان میں مہارت حاصل کی۔ اب تک کی اپنی کارکردگی کی بدولت وہ ایک مستشرق کے طور پر اپنی پہچان بنا چکے تھے۔

۱۷۷۰ء میں ڈنمارک کے بادشاہ کرسچین ہفتم کی ایما پر نادر شاہی تاریخ کو فارسی سے فرانسیسی زبان میں ترجمہ کرنا شروع کیا۔ یہ کتاب *Historie de Nadir Chah* کے عنوان سے ترجمہ کی۔ اس ترجمے سے ان کو فارسی زبان سیکھنے اور برتنے کا بھی موقع ملا۔ مزید اس کتاب کے مطالعے سے فارسی ادب بھی ان کے مطالعے میں شامل ہو گیا اور یوں طبعی میلان کی طرف میں چل نکلا۔ ۱۷۷۱ء میں اس ترجمے کے بعد ان کی مشہور کتاب "A Grammar of Persian Language" سامنے آئی تو اس سے ان کی شہرت انگلینڈ میں مزید پھیل گئی۔ ولیم جونز کو اس کاوش کے بعد وہاں پرشین جونز، اورینٹل جونز اور لنگوئسٹ، جونز نِک نیم (عرفیت) سے پکارا جانے لگا۔ ۱۷۷۳ء میں ایم۔ اے کی ڈگری آکسفورڈ یونی ورسٹی سے حاصل کی۔ معاشی مسائل اور کیرئیر کے لیے ان کو شعبہ قانون میں بھی داخلہ لینا پڑا۔ قانون کے مطالعے کے بعد وہ ہندوستان میں ہائی کورٹ کے جج کے طور پر تعینات ہوئے۔ (۱)

ہندوستان آنے کے بعد ولیم جونز نے رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے نام سے ایک ادبی لسانی تحقیق کے پلیٹ فارم کی بنیاد ڈالی۔ اس پلیٹ فارم پر صاحبِ علم وفن اصحاب

لیکچر دیتے تھے اور ان پر بحث و مباحثہ ہوتا تھا۔ وہ خود بھی سوسائٹی میں لیکچر دیتے تھے۔ سنسکرت زبان پڑھتے ہوئے ولیم جونز اس زبان کی یورپ کی دوسری بڑی زبانوں، یونانی، لاطینی وغیرہ کے ساتھ لسانی مماثلتوں کو بھانپ گئے۔ مزید تحقیق سے ان نے یہ بات ثابت کی کہ دراصل سنسکرت اور یونانی لاطینی زبانوں کا لفظ آغاز کسی ایک مشترک سلسلے سے جا ملتا ہے۔ ۱۷۸۶ء میں انھوں نے سنسکرت زبان کے بارے میں ایک لیکچر دیا تھا جس سے یورپ کو اس زبان سے آگاہی ہوئی۔ اس کا سنسکرت سے متعلق لیکچر جو بڑا مشہور ہوا، اس کا ایک حصہ نقل کیا جاتا ہے:

> سنسکرت زبان، اس کی قدامت خواہ کچھ بھی ہو، ساخت کے اعتبار سے ایک عجیب زبان ہے، یونانی سے زیادہ مکمل، لاطینی سے زیادہ وسیع اور ان دونوں سے کہیں زیادہ شستہ و رفتہ، باایں ہمہ ان دونوں سے اس کا قریبی رشتہ معلوم ہوتا ہے، جو افعال کے مادوں اور دوسری صرفی ونحوی شکلوں میں موجود ہے، جو یقیناً صرف کسی اتفاق یا حادثے کا نتیجہ نہیں ہوسکتا۔ یہ رشتہ ایسا مضبوط ہے کہ کوئی ماہر لسانیات جو ان تینوں کا مطالعہ کرے، یہ یقین کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان سب کا ماخذ ایک ہے جواب موجود نہیں ہے۔ (۲)

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گو ان زبانوں میں فاصلہ پیدا ہو گیا تھا لیکن یہ مماثلتیں آج بھی بہ غور دیکھی جا سکتی ہیں۔ اس تحقیق نے ہندوستان کے لسانی ورثے کو آریائی خاندان میں شامل کر دینے میں بڑی معاونت کی۔ اس کے بعد یہ نقطۂ نظر بھی پختہ ہو گیا کہ یہ تمام زبانیں ہند یورپی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ مشرقی زبانوں پر اس انداز سے تحقیق اور دل چسپی کے پیچھے وہ کون سے مقاصد اور پس منظر تھا جس کے تحت ولیم جونز کو ان کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ دراصل ان کے کلاسیکی فنون کے مطالعے کے منصوبے کا مقصد یہ تھا کہ اگر مشرق کو سمجھنا ہے تو اس کے لیے بہتر ہے کہ سب سے پہلے وہاں کے علمی و ادبی و سرکاری زبان کا بخوبی علم ہو۔ اس علم کی بدولت کلاسیکی متون کا مطالعہ کیا جائے تو اس سے شرق شناسی کا کام زیادہ بہتر انداز سے انجام دیا جا سکتا ہے۔ زبانوں کا نظام، ذخیرۂ الفاظ، عوامی و ادبی بول چال کی زبان کے شعبوں میں ان کی خاص دل چسپی رہی جسے گل کرسٹ، لی بی ڈف

اور باقی مستشرقین نے آگے بڑھایا۔ Garland Cannon لکھتا ہے:

"When Linguists think of Jones, they usually recall his dramitic expression of simmilarities among languages on the basis of their derivation from some earlier language in common, giving rise to the development of comparative linguistics, modern attitude towards language study, and, in short, the beginning of serious linguistics not based mythological explanations".(3)

ولیم جونز کی فارسی گریمر نے اسے صرف مشرقی زبانوں کا شعور ہی نہیں دیا تھا بلکہ یہ کام اس کے بے مثال منصوبے رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کی بنیاد کا محرک ثابت ہوا۔ یہ گریمر خاص مقصد کے لیے لکھی گئی ابتدائی گریمر تھی جس نے جدید زبانوں کے بارے میں مستشرقین کے نظریات کو سمجھنے میں بھی خاصی مدد دی۔ ۱۷۸۴ء میں کلکتہ میں قائم کی گئی ایشیاٹک سوسائٹی آئندہ آنے والی سوسائٹیوں کی بنیاد ثابت ہوئی۔ اس سوسائٹی کے پلیٹ فارم سے فارسی اور سنسکرت زبان پر کیے گئے تحقیقی ولسانی کام نے اس سوسائٹی کو یادگار بنا دیا۔ اس ایشیاٹک سوسائٹی کا رسالہ ''سوسائٹی جنرل'' کے نام سے کئی سال تک شائع ہوتا رہا۔ ولیم جونز کے اعزاز میں ایک اور اضافہ یہ ہوا کہ انھوں نے نوآبادیاتی دور میں تقابلی اور اطلاقی لسانیات (Comparative and Applied Linguistics) بنیاد ڈالی۔ ولیم جونز کا فارسی پڑھنا ان کے عربی مطالعے کی توسیع تھی۔ فارسی کی طرف ان کا میلان یوں بھی ہوا کہ یہ زبان بنگال میں موجود برطانوی افسروں کا حصہ تھی کی تربیت کا حصہ تھی۔ یہ وہ افسران تھے جنھوں نے ہندوستان میں رہ کر معاملاتِ سرکار سرانجام دینے تھے۔

ولیم جونز کا یہ نقطہء نظر کہ اگر مشرق کو سمجھنا ہے تو ان کے کلاسیکی ادب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ ان کے لسانی منصوبوں کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ فارسی ادبی روایت کے مطالعے نے ان کو یورپی کلاسیکی ادبی روایت کو نئے سرے سے سمجھنے میں معاونت کی۔ اس گریمر کے پیش لفظ میں

وہ بتاتے ہیں کہ فارسی زبان نو آبادیاتی ہندوستان میں بڑا اہم اور ناگزیر کردار ادا کر سکتی ہے۔ ولیم جونز کو آبادیاتی اقوام کی دولت کمانے کی ہوس کا بھی علم تھا۔ چناں چہ وہ بتاتے ہیں کہ فارسی زبان کی مدد سے اس خطے سے دولت کا حصول زیادہ آسان ہو جائے گا۔ ان کے اس اشارے کی وجہ سے بھی ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کے افسروں کو فارسی زبان کے مطالعے کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ دراصل فارسی زبان سیکھنے کے باعث انگریزوں کو اردو زبان سیکھنا سہل اور مفید ثابت ہوا تھا۔

ولیم جونز نے اگرچہ اردو زبان و ادب کے لیے براہِ راست کام نہیں کیا لیکن ان کی کاوشوں سے اردو زبان کی تحقیق و تنقید کا رستہ ہموار ہوا۔ انھوں نے اپنی فارسی گریمر کو جن اصول و قواعد کے مطابق مرتب کیا، اس ماڈل کو سامنے رکھ کر دیگر مستشرقین نے اردو لغات و قواعد کو مرتب کرنا شروع کیا تھا۔ جونز کے اس ماڈل کے مشرقی زبانوں کے مطالعے کے میدان میں یہ اثرات مرتب ہوئے کہ ان کی مدد سے زبان کو صحت کے ساتھ سیکھنا عملی طور پر ممکن ہو گیا تھا۔ اس کے اطلاقی لسانیاتی اصولوں کی مدد سے انگریز طالب علم ایک سال میں اس قابل ہو جاتا تھا کہ فارسی ترجمہ کر سکتا تھا اور ہندوستانی سرکاری خط و کتابت پڑھنے اور جواب دینے پر قادر ہو سکتا۔ گریمر کے دیباچے میں انھوں نے تدریس اور رہنمائی کے اصول بھی بتائے ہیں کہ منشی سے زبان کس طرح سیکھنی ہے۔ منشی (زبان سکھانے والا) کے لیے بھی رہنمائی کے اشارے موجود ہیں جن کی مدد سے وہ آسانی سے نو وارد انگریزوں کو مقامی زبان سکھا سکتا تھا۔ مختصر یہ کہ اس گریمر کی اہمیت کا اندازہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ ۱۸۲۸ء تک اس گریمر کے تقریباً ۲۸ ایڈیشن شائع ہو کر بک چکے تھے۔ ڈاکٹر رضیہ نور لکھتی ہیں:

> مشرقی علوم کی تحقیق کا دائرہ پہلے صرف عربی فارسی تک محدود تھا اب اور وسیع ہوا۔ ولیم جونز نے اسے 'ایشیائی مطالعہ' کا نام دے کر اس کی حدود میں سنسکرت اور دوسری ایشیائی زبانوں کو بھی شامل کر دیا۔ اس رشتے سے زبانوں کے تقابلی مطالعے اور ان کی موروثی وحدت کے اصول کی شناخت ہوئی جس سے ہند آریائی زبانوں کی لسانی تاریخ ترتیب پانے لگی۔ اردو زبان و ادب کے

بارے میں ایشیاٹک سوسائٹی نے کچھ نہیں کیا لیکن بالواسطہ طور پر اس کا تعلق
اردو زبان کے ساتھ بھی ہے کیوں کہ زبانوں کی گروہ بندی اور صرف ونحو کے
اصول وقواعد اور قدیم ذخیرۂ الفاظ کے مختلف منابع کی چھان بین میں ہند
آریائی زبانوں کے ارتقاء کی تاریخ کے ساتھ اردو بھی وابستہ ہے۔ (۴)

ولیم جونز سے قبل خان آرزو ہندوستان میں فارسی اور سنسکرت زبان کا تقابلی مطالعہ شروع کر چکے تھے۔ یہ کسی مقامی ادیب کی پہلی کاوش تھی جس کی کام یابی و ناکامی کے بارے میں فیصلہ سازی کرنے سے زیادہ بہتر ہے کہ اس کی اہمیت کو محسوس کیا جائے کہ ہندوستان میں انھوں نے اپنے طور پر جو تقابلی کام کیا تھا اسے تقابلی لسانیات کے سلسلے میں پہلی سیڑھی کہا جا سکتا ہے۔ (اس سے متعلق بحث باب نمبر ا یک میں موجود ہے) ولیم جونز سے خان آرزو کی لسانی کاوشوں کا تقابل یوں بھی کیا جانا درست نہیں کہ ولیم جونز لسانیات کا عملی اور جدید شعور رکھتے تھے اور دنیا کی بڑی بڑی زبانیں جانتے تھے۔ حاصل کلام کے طور پر رضیہ نور محمد کے ان الفاظ سے ولیم جونز کی اہمیت واضح ہونے کا مزید اندازہ کیا جا سکتا ہے:

ادبیات شناسی پر ولیم جونز کے تین بڑے احسانات شمار کیے جاتے ہیں۔ اوّل
سنسکرت لاطینی اور یونانی میں مشابہت قریبہ کی نشان دہی، دوم۔ قدیم ہندی
فرماں رواؤں کے عہود کا تعین، سوم۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے قدیم فقہی
قوانین کی شیرازہ بندی۔ (۵)

مختصر یہ کہ یہ بات بخوبی کہی جا سکتی ہے کہ ولیم جونز کے ادارے رائل ایشیاٹک سوسائٹی سے برصغیر کی کلاسیکی اور ورنیکلر زبانوں پر تحقیقات کا آغاز سنجیدہ فکری سے ہوا۔ آگے چل کر فورٹ ولیم کالج کے لیے مختلف اساتذہ کی عملی تربیت کا پلیٹ فارم یہی سوسائٹی بنی۔ سوسائٹی کے جرنل نے لسانی فکر رکھنے والے مستشرقین کو لسانیات کے میدان میں عملی طور پر تیار کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ اس جرنل کے مواد کے مطالعے سے ماقبل نو آبادیاتی عہد میں ہندوستانیات (Indology) کے میدان میں غیر ملکی افراد کی علمی اور لسانی کاوشوں کے مطالعے سے تحقیق وتنقید کے نئے زاویے سامنے آ سکتے ہیں۔

حوالہ جات اور حواشی:

1. www.notablebiographies.com/supp/supplement-F1-KA/Jones-william.htm,accessed on 21-05-2012.

۲۔ ابواللیث صدیقی، جامع القواعد (حصہ صرف) (لاہور، اردو سائنس بورڈ، طبع دوم، ۲۰۰۴ء)، ص ۱۳۹

3. Garland Cannon,Sir William Jones,Sanskrit,Persian and the Asiatic Society,published in,Histoire Epistemologie langage,vol 6,issue 6.2, (P-83)

۴۔ رضیہ نور محمد، اردو زبان و ادب میں مستشرقین کی علمی و ادبی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ (لاہور، لائن آرٹ پرنٹرز، پہلا ایڈیشن، ۱۹۸۵ء)، ص ۴۴

۵۔ ایضاً۔

2.6

ہراسم لی بی ڈف (Geracim Lebedev) کی قواعد نویسی

لی بی ڈف (۱۷۴۹ء-۱۸۱۷ء) کا پورا نام Geracim Steppanovich Lebedev تھا۔ یہ نام اپنے روسی تلفظ کے تحت Heracim Lebedeff کی املا میں بھی لکھا جاتا ہے۔ ان کا تعلق روس سے تھا۔ وہ کثیر الجہات شخص تھا۔ وہ ایک سیاح، ماہر لسانیات، موسیقار، ادیب اور ترجمہ کار کے طور پر بنگال میں مشہور ہوئے۔ ان کا تعلق فنون لطیفہ سے تھا۔ بنگالی تھیٹر کے بنیاد گزاروں میں ان کا نام ہمیشہ شامل رہے گا۔ مزید یہ کہ اس نے ہندوستان آ کر ۱۷۹۵ء میں ہندو تھیٹر کے قیام و ترویج کے لیے بھی کام کیا تھا۔ اسے روس میں ہندوستانیات (Indology) کا معتبر حوالہ سمجھا جاسکتا ہے۔ لی بی ڈف روس کے علاقے Yaroslavi میں پیدا ہوا۔ اس کا خاندان چرچ سے جڑا ہوا خاندان تھا۔ وہ انگریزی، جرمن اور فرانسیسی زبانوں کا ماہر تھا۔ میوزک میں اس کا شوق وائلن نوازی تھا اور وائلن بجانے اور سنانے کے لیے اس نے سفارتی سطح پر پورے یورپ ممالک کے دورے کیے۔ اسی دور میں

اسے انگریزی فوج کے بینڈ ماسٹر کے طور پر ہندوستان جانے کی پیش کش ہوئی جسے اس نے بخوشی قبول کرلیا اور یوں انگریز فوجی بن کر بنگال آ گیا۔ (۱)

بنگال کے دارالحکومت کلکتہ میں اس نے دس سال قیام کیا۔ یہاں پر اس کی ڈیوٹی بینڈ ماسٹر کے طور پر تھی۔ لیکن زبانوں سے دل چسپی کی وجہ سے وہ مقامی زبانوں کی تحصیل کی طرف متوجہ ہوا۔ گمان غالب ہے کہ اس نے ولیم جونز کے کارناموں کو دیکھا، سنایا پڑھا ہوگا، چناں چہ فارسی کی بجائے اس نے سب سے پہلے سنسکرت زبان کی طرف توجہ کی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کی دل چسپی میں ہندی اور بنگالی زبان بھی شامل ہوگئی۔ وہاں کے کسی سکول ماسٹر سے لی بی ڈف نے مذکورہ تینوں زبانوں کا علم حاصل کیا۔ میوزک کے حوالے سے اس کا ایک اور کام ہمیشہ یادگار رہے گا کہ اس نے پہلی مرتبہ ہندوستانی گیتوں کی دھنوں کو وائلن اور یورپی سازوں پر بجایا اور خوب داد سمیٹی۔ گریرسن نے اپنے لسانیاتی جائزہ ہند میں صرف اتنی معلومات دیں کہ یہ شخص ۱۷۸۵ء میں مدراس آیا تھا اور ۱۷۸۷ء میں کلکتہ چلا گیا تھا۔ اس ضمن میں غور طلب بات یہ ہے کہ قریب قریب اسی عرصے میں (۱۷۸۴ء) ولیم جونز نے ایشیاٹک سوسائٹی بنائی تھی، جس کے ساتھ لازماً لی بی ڈف نے علم و آگہی کا رشتہ استوار کیا ہوگا۔ ۱۷۸۴ء میں جان گل کرسٹ کی لغت بھی اس کے مطالعے میں رہی ہوگی جس نے اس کو مہمیز دی کہ وہ ہندوستان زبان پر کام کرسکے۔ گریرسن کے حوالے سے ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں:

> اس نے کم و بیش بیس سال اس ملک میں گزارے اور پھر واپس انگلستان چلا گیا۔ وہاں اس نے اردو قواعد پر ایک رسالہ شائع کیا لیکن گریرسن کا بیان ہے کہ ممکن ہے کہ یہ شخص سنسکرت یا بنگالی جانتا ہو۔ لیکن اس کا ہندوستانی کا علم قطعاً ناقص ہے کیوں کہ اس نے اپنے رسالے میں ہندوستانی الفاظ کا تلفظ بھی غلط لکھا ہے اور قواعد کے بیان کرنے میں بھی بہت سی غلطیاں ہیں۔ اگر یہ بیان درست ہے کہ اس نے ہندوستانی زبان بنگال ہندو پنڈت سے سیکھی تھی تو ان غلطیوں کے امکان کا سبب سمجھ میں آ جاتا ہے۔ (۲)

لی بی ڈف نے بنگالی تھیٹر میں پیش کرنے کے لیے انگریزی اور غیر ملکی ڈراموں کو بنگالی

زبان میں ترجمہ کیا تو اسے مقامی زبانوں کے ذخیرۂ الفاظ، گریمر اور لغت کی اہمیت وضرورت کا احساس ہوا۔ اس نے ایک چھوٹی سی بنگالی لغت بھی مرتب کی تھی۔ (۳) انگریز فوج سے معاملات ختم کر کے وہ واپس انگلینڈ گیا تو روس جانے سے قبل کچھ عرصہ وہاں رک کر ہندوستانی زبانوں پر کیے گئے کام کو چھپوانے کی طرف متوجہ ہوا۔ ۱۸۰۱ء میں اس کی قواعد کی کتاب "A grammar of the pure and mixed East Indian Dialects,: with dialogues afffixed... arranged in clacutta,... according to Brahmenian system, of the Shamscrit language. اس کتاب کا عنوان اس دور کی روایت کی طرح خاصا طویل ہے۔ اس عنوان میں غور طلب لفظ Shamscrit ہے۔ یہ لفظ سنسکرت کا انگریزی تلفظ ہے جو اس سے قبل کسی اور مستشرق کے ہاں نظر نہیں آتا۔ یہ لفظ سر ولیم جونز نے اپنے خطبے میں استعمال کیا تھا جو ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے تحت ایشیاٹک ریسرچز میں شامل ہے گل کرسٹ نے بھی ایک دو جگہ لفظ استعمال کیا ہے۔ لی بی ڈف نے اپنے دیباچے میں اس کا حوالہ دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> In the first volume of the Asiatic Researches, on the orthography of Asiatic words, page13, Sir villiam Jones begins the Shamskrit alphabet thus., "O" the name of Shamscrit character. (4)

لی بی ڈف گریمر کے پہلے صفحے پر عنوان کے حصے میں یہ اشارہ ملتا ہے کہ یہ کتاب یورپیوں کی ضروریات کو مدنظر رکھ کر لکھی گئی ہے اور اس کتاب میں اس بات کا اہتمام موجود ہے کہ اس سے قبل کے قواعد نویسوں نے اپنی کتب میں مورس یا مورش نام کی ملی جلی بولی کی ذیل میں گریمر اور مکالمات کی جو غلطیاں کی ہیں ان پر لی بی ڈف کے ریمارکس موجود ہیں۔ ولیم جونز اور اس کی سوسائٹی سے چھپنے والی مشرقی شاعری کے نمونوں پر بھی لی بی ڈف نے بات کی ہے۔ کتاب کے سرِ ورق پر لی بی ڈف کے ہجے Lebedeff کے طور پر چھپے ہوئے ہیں۔ کتاب کا انتساب کسی انفرادی شخصیت کی بجائے معزز ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام ہے جو

اس عہد کی روایت سے ہٹ کر ہے۔ کتاب کا پہلا حصہ Introduction کے نام سے موجود ہے۔ اس حصے میں شروع میں خدا کی حمد وثنا کے بعد لی بی ڈف کا اپنا سوانحی خاکہ اور ہندوستان آمد اور یہاں کے گزرے دنوں کی یاداشتیں موجود ہیں۔ سنسکرت، پراکرت اور بھاشا زبانوں کے بارے میں اس کی معلومات اور مشاہدات کا ذکر ہے۔ اس باب میں لی بی ڈف اپنے قواعدی کام کی غرض وغایت بتاتے ہیں۔

کتاب کے دیباچے میں ہندوستانی زبان جسے انھوں نے عرفِ عام میں مورس بولی کہا ہے اس کے بارے میں، بنگالی، سنسکرت اور پراکرت کے دخیل الفاظ، اصوات اور ان کی قواعدی مماثلتوں کے بارے میں لی بی ڈف نے تفصیل سے بات کی ہے۔ جہاں جہاں انھوں نے ولیم جونز، اس کی ایشیاٹک سوسائٹی کی ریسرچز سے اخذ واستفادہ کیا ہے، ان کا بھی تفصیلی بیان ہے۔ دیباچے میں ان کے قیام ہندوستان کے تلخ واقعات اور جن لوگوں سے شکایات تھیں ان کے بارے میں بھی انھوں نے باتیں کی تھیں۔ اس طرح کسی ایک شخص کے نام کتاب کا انتساب نہ کرنا بھی اس کی بے خوفی کی دلیل ہے۔ لیکن اس بارے میں یہ امر بھی واضح ہے کہ باقی ادیبوں نے اپنی کتب دورانِ ملازمت اپنے افسران کی ہمدردی سے شائع کرائی ہیں جن کے وہ احسان مند رہے ہوں گے، لی بی ڈف نے تن تنہا سے کام کیا تھا اس لیے اس کا انتساب اس نے کمپنی کے نام کیا جو ان کا ایسٹ انڈیا کمپنی سے عقیدت کا مظاہرہ بھی ہے۔

کتاب کے عنوانات کی تفصیل دیکھیں تو وہ کچھ یوں ہے۔ پہلا باب Articles and post position کے عنوان کے تحت ہے۔ اس عنوان سے پتا چلتا ہے کہ اس نے اپنی گریمر کی ترتیب دیگر یا دوسرے انگریز قواعد نویسوں بالخصوص جارج ہیڈلے اور جان گل کرسٹ سے مختلف رکھی ہے۔ گل کرسٹ کی گریمر کا آغاز Elements کے عنوان کے تحت ہوتا ہے جو دونوں کی قواعد نویسی کے طریقہ کار کے مختلف رجحان کو سامنے لاتا ہے۔ اس ترتیب سے یہ بات سمجھنے میں آسانی رہتی ہے کہ انھوں نے گریمر کے مشمولات کے انتخاب میں اپنے طریقہ کار کو اپنانا زیادہ مناسب خیال کیا تھا۔

حوالہ جات اور حواشی :

1. en.wikipedia.org/wiki/gercim_lebedev, accessedon 06-07-2013

۲۔ ابواللیث صدیقی، جامع القواعد (حصہ صرف)
(لاہور" اردو سائنس بورڈ، طبع دوم، ۲۰۰۴ء)، ص ۱۴۴

3. Ghosh,Prodyot."lebedeff,Heracim(Geracim)Steppanovich." Bangla pedia, Asiatic Society of Bengal,.. accesed on 06-07-2013

4. Lebedeff, heracim, A Grammar of the pure and mixed East Indian Dialects, printed by J. Skirven, London, 1801,P-xvii

2.7

جان گل کرسٹ کا فورٹ ولیم کالج سے قبل کا علمی ولسانی منصوبہ، توقیت نامہ

جان بورتھ وک گل کرسٹ (John Borthwick Gilchrist) اردوزبان وادب کی تاریخ میں نمایاں مقام کے حامل اسکالراور ماہرلسانیات تھے۔ وہ غیرملکی افراد کی اس کھیپ کا ایک اضافہ بن کر سامنے آئے جن کی بدولت ''ہندوستان اور ہندوستانیات'' کے میدان میں حیرت انگیز اور ناقابل یقین کارنامے سامنے آئے۔ جان گل کرسٹ ولیم جانز کے ہم عصر تھے۔ ان کی ذات میں ایک محقق، ماہرلسانیات، نقاد، شاعر، مہم جو کی سی صفات یک جا تھیں جن کی بدولت اردواور ہندی زبان وادب کی ذیل میں بہترین ادبی ولسانی کام کا اضافہ ہوا۔ ان کی سب سے بڑی عطا یہ تھی کہ انھوں نے ہندوستان آ کر نہ صرف اس کی ثقافتی، لسانی اور تعلیمی ورثے کو نئے سرے سے دریافت کیا بلکہ اسے مالا مال بھی کیا۔ اس نے اردواور ہندی ادب کے اس جدیدنثری اسلوب کا آغاز کیا جس پر چلتے چلتے یہ زبان آج ترقی کی شاہراہ پر رواں دواں ہے۔ اگر وہ یہ کام نہ کرتا تو ممکن ہے کہ یہ زبان آج اتنی ترقی یافتہ بن کر سامنے نہ آتی۔ پرفیسر ہمایوں کبیر لکھتے ہیں:

He stayed in India only a little over twenty years, but during his brief period he not only set himself the took of learning Hindustani Language that made up his mind to write its grammar and dictionary. After completing his dictionary, he under took the task of producing standard books in Hindustani prose and either wrote or compited a series of books, which may be regarded as the first prose works in modern Urdu and Hindi.(1)

جان گل کرسٹ سے قبل کی روایت کو دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ ان سے قبل، (ہندوستانی) اردو زبان کی گریمر اور لغت نویسی کا آغاز ہو چکا تھا اور ان میں کچھ کتب خاص اہمیت کی حامل بھی قرار پائیں لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ پر اہم ہے کہ وہ پہلے انگریز مصنف تھے جنھوں نے پوری سنجیدگی، صداقت اور محنت کے ساتھ اردو قواعد اور لغت کے میدان میں خدمات سرانجام دیں۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں:

گل کرسٹ بلاشبہ پہلے انگریز مصنف ہیں جنھوں نے اردو زبان، اس کی لغت اور قواعد اور اس کی ادبی تاریخ پر پوری سنجیدگی سے توجہ کی۔ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس زبان کے لسانی پہلوؤں کی تحقیق اور تنقید کے لیے راہ ہموار کی۔ یہ بات بہ ظاہر بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ گل کرسٹ جو ہمارے سامنے ایک ماہر لسانیات اور زبان دان کی حیثیت سے آتے ہیں، اصلاً طب کے شعبے سے تعلق رکھتے ہیں اور انھوں نے اپنی تعلیم ایڈنبرا میں حاصل کی تھی۔ (۲)

جان بورتھ وک گل کرسٹ اسکاٹ لینڈ کے پایۂ تخت ایڈنبرگ (Edinburg) میں ۱۷۵۹ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے حالات زندگی اور دیگر سوانحی حالات و کوائف مفقود ہیں۔ عام طور پر تواریخ ادب و لسانیات میں ان کے ہندوستان سفر کے بعد کے حالات ہی دستیاب نہیں لیکن ان کے سوانحی حالات بکھری صورت میں ان کی کتب کے دیباچوں سے اخذ کیے جا

سکتے ہیں۔ ۲۰۰۷ء میں ان پر انگلستان میں ایک کتاب چھپی تھی جسے پروفیسر رچرڈ سٹیڈ مین جونز (Richard Steadman Jones) نے Colonialism and Grammatical Representation: John Gilchrist and the Analys's of the Hindustani Language. کے عنوان سے لکھا۔ اس کتاب کے ابتدائی تعارفی حصے میں پروفیسر جونز نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ان کی سوانح پر ایک کتاب بعنوان "A Succinct Narrative of Dr. Gilchrist's Services (from 1782 to 1821) ان کے انڈیا سے انگلستان واپس جانے کے تقریباً چالیس سال بعد شائع ہوئی تھی۔ مصنف کا خیال ہے کہ یہ کتاب گو بہ ظاہر کسی Third Person کی تحریر ہے لیکن درحقیقت یہ کتاب بھی گل کرسٹ نے اس صیغے میں خود لکھی ہے یا ان کا اس کے لکھنے میں ہاتھ ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> Some 40 years later, long after Gilchrist had returned from India and at a time when his relations with the Honourable company had somewhat soured, a biographical work appeared under the title of "A Succinct Narrative of Dr. Gilchrist's services from 1782 to 1821. Despite the fact that it is written in the third person, the defensive tone of the work makes it clear that the man himself had at least a hand in its composition and the entire text constitutes a self-justificatory account of his actions over the previous four decades.(3)

گل کرسٹ نے ۱۴ سال کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد طب کے شعبے میں جانا پسند کیا۔ انھوں نے جاج ہیریٹ ہسپتال سے میڈیکل میں اپرنٹس شپ کی اور اس کے بعد رائل نیوی میں کچھ سال تک ایک سرجن ڈاکٹر کے ساتھ جونیئر کے طور پر پریکٹس کی۔ اس پریکٹس کی بدولت ہی انھیں ہندوستان میں اسسٹنٹ سرجن کے عہدے پر تعینات کیا گیا تھا۔ اردو تواریخ

اور گل کرسٹ پر کیے گئے کام میں ان کے تعلیمی کوائف اور میڈیکل کی ڈگری سے متعلق معلومات کا فقدان تھا لیکن مذکورہ بالا کتاب (Colonialism...) سے اس بارے میں تھوڑی بہت معلومات ملتی ہیں۔ رچرڈ سٹیڈمین جونز لکھتے ہیں:

> In 1782, a young scot named John Gilcrist arrived in India looking for employment in the service of East India Company. After leaving school at the age 14, gilchrist had bẹen apprenticed to a surgeon in Falkirk and for some years he had served as surgeon's mate in Royal Navy. On the basis of this experience, he was now appointed to the position of Assistant Surgeon on the Bengal Establishment and took a part with a regiment stationed in Western India.(4)

ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۷۵۷ء کے بعد بنگال پر حکمرانی شروع کی تو اس کے بعد اس کے استعماری و حکمرانی کے منصوبے سے انگلستان کے نوجوانوں میں خاص طور پر ہندوستان کے خطے سے دل چسپی پیدا ہو گئی تھی۔ بہت سے نوجوانوں نے اپنا کیریئر اسی سے شروع کرنے کی کوششیں کیں جن میں گل کرسٹ بھی شامل تھے۔ وہ ہندوستان آنے سے قبل ویسٹ انڈیز گئے تھے تاکہ وہاں سے نیل کی کاشت کے طریقے سیکھ سکیں۔ ویسٹ انڈیز کے سفر سے ان کو نیل کی کاشت کا تجربہ حاصل ہوا جس کا عملی مظاہرہ انھوں نے ہندوستان کے شہر غازی پور میں کیا تھا۔ نیل کی کاشت ان کو زیادہ راس نہ آئی تھی لیکن اس کاشت کا ان کے سفر ویسٹ انڈیز سے ایک تعلق بنتا ہے۔ ویسٹ انڈیز کے بعد انھوں نے ہندوستان کی طرف قسمت آزمائی کا ارادہ کیا اور ۱۷۸۲ء میں بمبئی آ گئے۔ ۱۳ اپریل ۱۷۸۳ء کو بنگال اسٹیبلشمنٹ کے بمبئی تعینات دستے میں اسسٹنٹ سرجن کے عہدے پر تعینات کیا گیا۔ بنگال آرمی کے اس دستے کی کمان کرنل مارگن کر رہے تھے۔ ان کی سفارش پر گل کرسٹ کا تقرر کیا گیا تھا۔ چوں کہ یہ دستہ ان دنوں

بمبئی میں تعینات تھا۔ اس لیے Bombay Detachment کہلایا۔ اس دستے کا تبادلہ ۱۷۸۳ء میں سورت کے مقام سے فتح گڑھ کر دیا گیا جو کہ اُتر پردیش کا ایک شہر تھا۔ اس علاقے کی عسکری اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے انگریزوں نے اس شہر کو ایک بڑی چھاؤنی میں تبدیل کر دیا تھا۔ یو پی کے علاقے میں گل کرسٹ کا آنا اس کو ایک نئے راستے پر ڈال گیا۔ اس شہر میں سکونت سے ان کے مشاہدے میں یہ بات آئی کہ ہندوستانی زبان دکن سے لے کر شمال تک کے مرکزی علاقوں میں بولی سمجھی جا رہی تھی۔ یہ زبان رابطے کی زبان 'Lingua Franka' کے طور پر کام یابی سے بروئے کار لائی جا رہی تھی۔ لیکن ان کی نگہِ دوررس نے مستقبل میں اس زبان کی اہمیت کو محسوس کر لیا چناں چہ اس کو سیکھنے کی طرف متوجہ ہوئے۔ دوسری اہم وجہ اس کے پیشے کے لیے مقامی زبان کی اہمیت بھی تھی۔

ہندوستان آنے کے بعد گل کرسٹ کو میڈیکل شعبے سے متعلق ہونے پر بعض اوقات مقامی افراد اور مریضوں سے سابقہ پڑتا تھا۔ ایک مقامی مریض کے مرض اور اس کی کیفیات کو کسی ڈاکٹر کے لیے اس وقت سمجھنا زیادہ مشکل ہو جاتا ہے جب کہ وہ اس کی زبان سے واقفیت نہ رکھتا ہو۔ اس وقت گل کرسٹ کو یہ احساس ہوا کہ اگر اس ملک میں رہنا ہے تو اس کی زبان سے واقف ہوئے بغیر کسی بھی میدان میں ترقی نہ کی جا سکے گی۔ یہ بات بھی اپنی جگہ اہم ہے کہ گو اس عہد میں سرکاری زبان کا درجہ فارسی کے پاس تھا لیکن دکن اور بنگال کے علاقوں میں اس کے ساتھ ساتھ ہندوستانی زبان بھی کثرت سے بولی جاتی تھی۔ گل کرسٹ نے محسوس کیا کہ فارسی سے قطع نظر ہندوستانی زبان پورے ہندوستان میں رابطے کی زبان کے طور پر اپنی جگہ بنا چکی ہے۔ چناں چہ اس نے پہلی فرصت میں ہندوستان کی مقامی زبان سیکھنے کا ارادہ بنایا۔ گل کرسٹ کے بہ قول:

> ۱۷۸۲ء میں بمبئی وارد ہوتے ہی میں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ ہندوستان میں میرا قیام۔ خواہ اس کی نوعیت جو بھی ہو، اس وقت تک نہ تو میرے ہی لیے خوش گوار ہو سکتا ہے، اور نہ مرے آقاؤں ہی کے حق میں مفید ثابت ہو سکتا ہے، جب تک کہ اس ملک کی مروجہ زبان میں پوری دست گاہ میں نہ حاصل کر لوں،

جہاں عارضی طور پر مجھے قیام کرنا ہے۔ چناں چہ اس زبان کو، جسے اس زمانے میں مورس (Moors) کہتے تھے سیکھنے کے لیے میں جم کر بیٹھ گیا... (۵)

اس زبان کی زیادہ اہمیت کا اندازہ اس کو مختلف شہروں کے سفر کے بعد بھی بہ خوبی ہوا۔ چناں چہ جس دور میں گل کرسٹ ہندوستانی زبان کو سیکھنے کے مراحل میں تھے، اسی عہد میں انھوں نے زبان کی لغت اور قواعد لکھنے کا ارادہ بنا لیا تھا۔ اس دور میں ایسٹ انڈیا کمپنی اس بات سے کافی مطمئن تھی کہ اس کے ملازمین ہندوستان کی سرکاری زبان فارسی کا ضروری علم رکھتے تھے لیکن گل کرسٹ اس علم کو ناکافی سمجھ کر دراصل دور کی سوچ رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ لوگوں کے ساتھ موثر رابطے کے لیے دراصل اس زبان کو سیکھنا انگریزوں کے لیے ناگزیر ہو جائے گا۔ جو گلی کوچوں کی زبان ہے۔ اس عہد میں اس زبان کو Moors کا نام بھی دے دیا گیا تھا جو گل کرسٹ نے پسند نہیں کیا۔

اس زمانے میں جارج ہیڈلے کی قواعد اردو زبان کے سیکھنے لیے بہترین خیال کی جاتی تھی اور نو وارد انگریزوں کے مطالعے میں رہتی تھی۔ اس کی ضرورت و اہمیت کے پیش نظر ہی اس کتاب کے زیادہ ایڈیشن شائع ہوئے تھے۔ گل کرسٹ کو بھی اس کتاب سے مدد لینا پڑی لیکن یہ کتاب ان کو زیادہ متاثر نہ کر سکی۔ چناں چہ اس کام کے لیے انھوں نے کسی مقامی منشی کی خدمات مستعار لیں۔ منشی نے ہیڈلے کی کتاب سے استفادہ کو ناکافی قرار دے کر ان کو اس سے باز رہنے کا مشورہ دیا جس کا ذکر ان کے ضمیمے کے دیباچے میں موجود ہے۔ منشی سے زبان کے سیکھنے کا کام بھی اتنی تیزی سے جاری نہ تھا کہ ان کو ان کے ایک کیپٹن دوست نے اٹھارھویں صدی کے ایک بڑے استاد کلاسیکی شاعر مرزا رفیع سودا کے کلام سے استفادہ کا مشورہ دیا۔ اس مشورے پر عمل کرتے ہوئے انھوں نے سودا کی شاعری کا مطالعہ کیا تو اس سے ان کو اس زبان کی عوامی جہات کے ساتھ ساتھ ادبی جہات کا بھی علم ہوا اور اس تجربے نے ان کو لطف و انبساط کی وادی میں دھکیل دیا۔ سودا سے موانست کا رشتہ تا حیات برقرار رہا اور ان کی تحریروں میں سودا کی شاعری رواج پا گئی تھی۔ گل کرسٹ لکھتے ہیں:

[I] was of course refered to Hadley for the first

rudiments, of my new studies, but fortunately being a week or two after, attended by an expert, Moonshee,' he insisted on my unlearning what little I had picked up from that gentleman. ...about this crises I was fortunate enough torecieve from my friend Captain (now Colonel) Jon Ratary, the works of Sauda, to which and that benevolent man's advice, encouragement and assistanee I am greatly beholden for the progress I have since made in Hindoostanee Tongue.(6)

جان گل کرسٹ نے مقامی منشیوں، ساتھی انگریزوں اور سودا کی شاعری سے کافی حد تک اردو زبان کا علم حاصل کیا۔ دوسرے مرحلے میں انھوں نے اس زبان کی تحصیل شروع کی جو کتابوں سے باہر عوامی بول چال کی صورت میں شمالی ہندوستان میں موجود تھی۔ عوامی اجتماعات سے لے کر گلی کوچوں میں موجود زبان کا عوامی لب ولہجہ، الفاظ، سلینگ (Slang) الفاظ، اشرافیہ وعوامی لب و لہجے کی نزاکتیں، تلفظ کا تبدیل ہوتا ڈھانچہ، ان تمام امتیازات کے لیے گل کرسٹ کو ہندوستان کے گلی کوچوں کی خاک چھاننا پڑی۔ چناں چہ اپنی ملازمت کے تقریباً دو سال بعد ۱۷۸۵ء میں انھوں نے اپنی ملازمت سے ایک سال کی رخصت کی درخواست دی۔ رخصت منظور ہونے سے قبل ہی وہ زبانوں کی تحصیل اور اپنے اشاعتی منصوبوں کے لیے مواد تلاش کرنے نکلے اور پھر کبھی میڈیکل کے شعبے کی ملازمت پر واپس نہ آئے۔ قواعد ولغت کے حوالے سے سفر اختیار کیا۔ صدیق الرحمان قدوائی لکھتے ہیں:

While still at Fatehgarh, on 2 January, 1785, he applied to the board for one year's leave and continuation of salary and allowances during this period... the company granted him a year's leave which he spent travelling through lucknow,

Faizabad, Allahabad, Jounpur, Banaras and many other places of learning to sutdy various aspects of language and collect material for his Grammar and Dictionary.(7)

گل کرسٹ نے اردو زبان کی تحصیل کے دوران موجود دشواریوں کا سامنا کرنے کے بعد ان کے حل کے لیے کام کرنے کا منصوبہ تیار کیا۔ اس کے منصوبے کا نام ہندوستانی فلالولوجی (Hindoostanee Philology) تھا۔ اس منصوبے کے تحت انھوں نے اس زبان کی قواعد اور لغت لکھنے کا ارادہ کیا۔ اس کے لیے مواد کی فراہمی ایک مشکل امر تھا اس وجہ سے رخصت لی اور اس مقصد کے لیے شمالی ہند کے باقی شہروں کا سفر اختیار کیا۔ فیض آباد شہر میں طویل عرصے تک سکونت سے فلالولوجی کے سلسلے کی پہلی کتاب A Dictionary, English and Hindoostanee... کی پہلی جلد اور اس کی طباعت کے لیے کلکتہ عازم سفر ہوئے۔ ۱۷۸۶ء میں ان کی پہلی کتاب انگریزی ہندوستانی لغت شائع ہوئی۔ اس لغت کی اشاعت سے ان کے فلالوجی کے منصوبے کے سلسلے کا پہلا شاہکار سامنے آیا اور اپنی اہمیت منوانے میں کام یاب رہا۔

دوسرے مرحلے میں فیض آباد سے غازی پور کو ہجرت کی اور یہاں پر (۱۷۸۷ء سے لے کر ۱۷۹۵ء تک تقریباً آٹھ سال کا عرصہ گزارا۔ غازی پور میں لسانی اشاعتی منصوبوں پر کام کے ساتھ ساتھ نیل کی کاشت بھی سرکار کی اجازت سے جاری رکھی۔ یہ تجربہ اتنا سودمند ثابت نہ ہو سکا۔ اس کاروباری اتار چڑھاؤ کی وجہ سے ان کے پاس خاطر خواہ رقم موجود نہ تھی کہ اپنی کتاب شائع کروا سکتے چناں چہ ۱۷۹۰ء میں انگریزی ہندوستانی ڈکشنری کی دوسری جلد شائع کرانے کے لیے ان کو اس کے حقوق رہن رکھنے پڑے تب جا کر دوسری جلد شائع ہوئی۔ (۸)

'انگریزی ہندوستانی لغت کی پہلی جلد کی اشاعت کے بعد سے گل کرسٹ کو شہرت و ناموری تو مل گئی تھی لیکن ان کے معاشی حالات اس طور پر بہتر نہ ہو سکے تھے جس قدر ان کو

امید تھی۔ چناں چہ دوسری لغت کی اشاعت سے قبل کا دور ان کے سخت معاشی حالات کا دور ثابت ہوا۔ اس عہد میں صحت کی خرابی اور سرمائے کی کمی جیسے مسائل نے ان کو بے چین کیے رکھا۔ نیل کی کاشت کا تجربہ ابتلا کے درد کی سختیاں کم کرنے کی ہی ایک سعی تھی لیکن زیادہ سود مند نہ رہا۔ اس دور میں ان کے انگریز دوستوں نے اور افسران نے ان پر کمال مہربانی کی ان کی تنخواہ سمیت رخصت بڑھا دی۔ ان افراد میں سرجان شور، لارڈ ولزلی اور میجر کرک پیٹرک کے نام شامل ہیں۔ اس عنایت سے گل کرسٹ کو ایک طرف سے تو سکون ملا لیکن دوسری لغت کی اشاعت جبھی ممکن ہو سکی کہ ان کو اس کے حقوق گروی رکھ کر قرض لینا پڑا۔ صدیق الرحمن قدوائی لکھتے ہیں:

> Thanks to some of his sympatuisers like sir John Shore, lord Wellesley and Major Kirkpatrick, Gilchrist get patronage which helped him through grant of further leave, allowances and grants for preparation and publication of his work. But evern after this he had to mortgage to his printers all his rights in the Hindoostanee Grammar and Dictionary and in 1791, had to apply for company's help to clear his debt of Rs.12.000.(9)

۱۷۹۰ء میں انگریزی ہندوستانی لغت (A Dictionary, English and Hindoostanee) کی دوسری جلد کی اشاعت عمل میں آئی۔ جلد اوّل میں انگریزی حرف 'K' تک کے الفاظ کو شامل کیا گیا تھا۔ دوسری جلد میں 'L' سے لے کر 'Z' تک کے الفاظ کے متعلقات کو شامل کر کے ہندوستان فلالوجی کے سلسلے کی دوسری کتاب شائع کر دی گئی۔ گل کرسٹ کا ارادہ تھا کہ ہندوستانی گریمر، بھی لغت کے ساتھ ہی شائع ہوتی لیکن شدید مالی مشکلات اور دوسرے دوست مسٹر چارٹر کے صحت کے مسائل اور یورپ واپسی کی وجہ سے گریمر کی اشاعت کا منصوبہ ملتوی کرنا پڑا۔ یہ وہی ساتھی تھے جو ان کے بزنس پارٹنر تھے اور

انھوں نے ان کو مالی مشکلات سے نکالنے کے لیے نیل کی کاشت کے کاروبار میں سخت محنت کی تھی لیکن ان کی صحت بھی خراب رہنے لگ گئی تھی۔ وہ تو کاروبار ختم کر کے یورپ واپس چلے گئے لیکن گل کرسٹ نے ہمت نہیں ہاری اور کلکتہ مراجعت کی۔ ۱۷۹۵ء میں گل کرسٹ گریمر کی طرف متوجہ ہوئے اور اس ادھورے کام کو ۱۷۹۶ء میں اشاعت کے مرحلے تک پہنچا دیا۔

۱۷۹۶ء میں گل کرسٹ نے ہندوستانی فلالوجی کے منصوبے کے تحت تیسری کتاب A Grammar of Hindoostanee Language شائع کی۔ یہ کتاب کرانیکل پریس کلکتہ سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کی اشاعت کے ساتھ ہی لغت وقواعد کے سلسلے کا یہ منصوبہ اصلاً مکمل ہو گیا تھا۔ (قواعد پر باب نمبر چار میں تفصیلی بحث کی جائے گی)۔ لغت وقواعد پر ایک ضمیمہ جس کا نام Apendix تھا ۱۷۹۸ء میں شائع کر کے فلالوجی کے تین حصے مکمل کیے۔ دراصل گل کرسٹ نے ہندوستانی فلالوجی کے سلسلے میں چار کتب کی اشاعت کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس منصوبے کے تحت پہلی انگریزی ہندوستانی ڈکشنری دو حصوں میں شائع ہو گئی تھی۔ دوسری کتاب ہندوستانی انگریزی لغت لکھنے کا ارادہ تھا جو بوجوہ پورا نہ ہو سکا۔(۱۰) اس لیے اس کو چھوڑ کر انھوں نے یہ منصوبہ تین کتابوں کی اشاعت تک محدود کر دیا تھا۔ جو لغت، قواعد اور Appendix کی صورت میں چار جلدوں میں شائع ہوا تھا۔ ان کتب کا مواد انھوں نے اپنے قیام غازی پور کے دوران ہی اکٹھا کر کے اس کا مسودہ تیار کر لیا تھا۔ قیام کا یہ عرصہ ۱۷۸۷ء سے لے کر ۱۷۹۴ء تک کے عہد پر مشتمل تھا۔ ان مسودوں میں گریمر کی اشاعت تو ۱۷۹۶ء میں ہی عمل میں آ گئی تھی لیکن Appendix (ضمیمہ) کی اشاعت کے لیے دو سال صبر کرنا پڑا تب کہیں جا کر یہ حصہ شائع ہوا۔ عتیق صدیقی لکھتے ہیں:

> سولہ سال ۱۷۸۲ء سے ۱۷۹۸ء تک، راہ کی دشواریوں کا، جو بے حساب تھیں اور ہمت شکن حالات کا، جن کی گرد و پیش فراوانی تھی، وہ مردانہ وار مقابلہ کرتا رہا۔ بالآخر اس کو کام یابی و کامرانی نصیب ہوئی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ریکارڈوں اور دوسرے ذرائع سے ہم کو پہلی بار یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ قیام ہندوستان کے پہلے دور میں گل کرسٹ سات سال (۱۷۸۷ء سے ۱۷۹۴ء)

اتر پردیش کے شہر غازی میں مقیم رہا۔ اس دوران میں اس کی پہلی کتاب
انگریزی ہندوستانی لغت چھپ کر منظر عام پر آئی اور یہیں بیٹھ کر اس نے
ہندوستانی زبان کے قواعد کا اور لغت وقواعد کے ''ضمیمہ'' کا مسودہ تیار کیا۔ (۱۱)

۱۷۹۸ء میں جان گل کرسٹ نے ہندوستانی فلالوجی کے سلسلے کی دوسری کتاب "Appendix to the English and Hindoostanee Dictionary" شائع کی۔ یہ کتاب ترتیب کے لحاظ سے دوسرے نمبر پر شائع ہوئی تھی لیکن ان کی کوشش تھی کہ لغت کے بعد جلدی سے ہندوستانی گریمر کی اشاعت عمل میں آ جائے جو ان کے ذاتی و معاشی مسائل کی وجہ سے التوا کا شکار ہو کر ۱۷۹۶ء سے پہلے شائع نہ ہو سکی تھی۔ Appendix کے دیباچے میں ان کے سوانحی حالات وکوائف کے بارے میں مختصری جھلک ملتی ہے۔ اس کی مدد سے ان کی ہندوستان آمد، ملازمت، مشرقی زبانوں کی تحصیل وتدریس اور فلالوجی کے منصوبوں کی اشاعت کو واضح انداز سے سمجھا جا سکتا ہے۔ عتیق صدیقی ضمیمے کی اشاعت اور اشاعت کی ترتیب میں تبدیلی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> کلکتہ گزٹ میں گل کرسٹ کا ایک طویل اشتہار ہم کو ملتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کلکتے پہنچنے کے دو سال بعد۔ مئی ۱۷۹۶ء میں اس نے اپنی دوسری کتاب ہندوستانی زبان کے قواعد (A grammar of the Hindoostanee Language) شائع کی اس اشتہار کے مطابق یہ نئی کتاب گل کرسٹ کے ہندوستانی لسانیات کے سلسلے کی پہلی جلد کا تیسرا حصہ تھی۔ دوسرا حصہ اس وقت شائع نہیں ہوا تھا جو قواعد اور لغت کے ضمیمہ پر مشتمل تھا، اور جو ۱۷۹۸ء میں ضمیمہ (Appendix) کے نام سے شائع ہوا۔ (۱۲)

Appendix کے بارے میں مزید معلومات میں یہ بات شامل ہے کہ اس میں الفاظ کے معنی رومن رسم الخط میں پیش کیے گئے ہیں۔ پاکستان میں یہ کتاب نایاب ہے۔ تلاش بسیار کے باوجود گوگل اور انٹرنیٹ سے یہ کتاب دریافت نہیں ہو سکی۔ البتہ انڈیا کی نیشنل لائبریری کلکتہ میں اس کتاب کا نسخہ موجود ہے جہاں تک رسائل ممکن نہ ہو سکی۔ اس لیے ضمیمے کے مشمولات اور مواد کے بارے میں مزید معلومات کا فقدان ہے۔ عتیق صدیقی کی فراہم کردہ

معلومات سے اندازہ ہوتا ہے کہ کتاب کے شروع میں کتاب کی بکری کی اطلاع اور قیمت کی تبدیلی کی اطلاع خریداروں کو دی گئی ہے۔ اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ گل کرسٹ نے اپنی لغت کو دو حصوں میں کیوں تقسیم کر دیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

"ضمیے کی جلد سے اندازہ ہوتا ہے کہ گل کرسٹ نے لغت کو دو حصوں میں تقسیم کیا تھا، جس کی بہ ظاہر کوئی وجہ سمجھ نہیں آتی ہے۔ اس ضمیمہ میں مقدمہ کا حصہ جہاں ختم ہوتا ہے اور جہاں سے لغت کا حصہ شروع ہوتا ہے، وہاں ہم کو حسب ذیل عبارت نظر آتی ہے جو عنوان کی طرح جلی ٹائپ میں درج کی گئی ہے:

Appendix to Pat 1 of the Dictionary.

یہ حصہ صفحہ ۹۴ پر Knu کے حروف پر ختم ہوتا ہے اور اس صفحے کے خاتمے کی حسب ذیل عبارت Appendix to Part 1 of the Dictionary

اس کے مقابل کا دوسرا صفحہ جو L کے حرف سے شرع ہوتا ہے اس کا عنوان ہے:

Appendix to Part II of the Dictionary

یہ ضمیمہ ۹۰ صفحات پر مشتمل ہے اور اس کی آخری عبارت End of the Part II of the Volume First_"(۱۳)

۱۷۹۸ء میں گل کرسٹ کی چوتھی کتاب Oriental Linguist شائع ہوئی۔ اس کا پورا نام یوں ہے:

"Oriental Linguist an easy and Familiar Introduction to the Hindoostanee or Grand popular Language of Hindoostan. (Vulgarly but improperly called Moors) by the Author of the English and Hindoostanee Dictionary." (J.B. Gilchrist)

کتاب کا دوسرا ایڈیشن ترمیم و اضافوں کے ساتھ ۱۸۰۲ء میں شائع ہوا۔ یہ کتاب Perris-Post Press کلکتہ سے شائع ہوئی۔ کتاب کے سرورق میں اور چوتھے (یعنی پہلے مصرعے) کی جگہ خالی چھوٹ دی گئی ہے۔ گمان ہے کہ یہ مصرعہ اس وقت ان کے ذہن سے محو

ہو گیا ہوگا۔ یہ تین مصرعے رومن خط میں لکھ گئے ہیں جو یوں ہیں:

سوتوں کی نیند میں کرنے کو خلل جاؤں گا"
" - - - - - -

"نطق کہتا ہے میرا آج یہ ہر ناطق سے آن کر ہونٹھ ابھی طوطی کے کل جاؤں گا"

(سودا)

توتے کی طرح رٹے رٹائے الفاظ و مفاہیم کی جگال کرنے والوں پر سودا کا طنز تو کسی اور پس منظر کا غماز ہوگا لیکن گل کرسٹ کا یہ شعر کا انتخاب اور اس کو کتاب کے سرورق پر لکھنا اس کی شخصیت کی نفسیاتی برتری کے ساتھ ساتھ اپنی کتاب میں دیے گئے کام کی اہمیت کو بھی واضح کرنے کا کام بہ خوبی سرانجام دے رہا ہے۔ یہ کتاب اپنے مشمولات کے حوالے سے کوئی بہت مختلف اور منفرد کتاب نہیں ہے۔ کتاب کے شروع میں تعارفی باب Introduction کے عنوان سے موجود ہے۔ جو خاصا طویل ہے اور اس کے صفحات کو رومن گنتی سے لکھنے سے یہ تاثر ملتا ہے کہ یہ اضافی معلومات ہیں، جو کتاب کا حصہ نہیں ہیں لیکن چوں کہ کتاب کے مشمولات سے ملتی جلتی ہیں اس لیے ان کو اس کا حصہ بنا دیا گیا ہے۔ اس حصے میں ہندوستانی زبان، ہندی زبان میں فرق کو واضح کیا گیا ہے۔ اس میں گل کرسٹ نے انگریزی زبان میں فرنچ اور لاطینی الفاظ کی موجودگی کی مثال کو عربی فارسی سے تطبیق دے کر ہندوستانی زبان اور اس کی ساخت میں شامل مختلف زبانوں کا کردار واضح کیا ہے۔ یعنی جس طرح لاطینی، اور فرنچ زبانوں کے سیکسن زبان میں مشمولیت سے نئی زبان انگریزی کے نام سے سامنے آئی اس طرح ہندوی زبان میں عربی اور فارسی شامل ہو کر ہندوستانی زبان میں تبدیلی ہو گئیں تھی۔ گل کرسٹ کی اس مثال سے ایک اہم بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ ہندوی اور ہندوستانی دو الگ مزاج کی بولیاں تھیں اور یہ کہ جو نشانی وہ بتاتے ہیں اس سے ہندوستانی زبان بلا شبہ اردو زبان ہی ہے۔

کتاب کا پہلا حصہ قواعد کے مباحث پر مشتمل ہے۔ ان میں حروف علم ہجا، زبان کی بنیادی آوازیں، اسم، آرٹیکل، ضمیریں، فعل اور متعلقات فعل کے مباحث شامل ہیں۔ یہ تمام اجزا اسی طرح دوسرے حصے میں مشرقی لسانیات میں استعمال ہونے والی تکنیکی اصطلاحات،

اردو زبان میں گنتی کے طریقے، ہفتے مہینے سال انگریزی، اردو، مقامی بول چال کے مطابق درج کیے گئے ہیں۔ آخر میں انگریزی ہندوستانی اور ہندوستانی انگریزی الفاظ کی ایک مختصر سی لغت دی گئی ہے۔ اس کتاب کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ غیر ملکی افراد کو مختصراً ایک ہی کتاب میں ضروری معلومات اور بول چال کے استعمالات پر مشتمل کتاب مہیا کی جائے۔ جو مختصر وقت میں ان کو مقامی زبان کے ضروری استعمالات کے قابل بنا دے۔ یہ احساس ان کو غالباً یوں ہوا ہوگا کہ لغات کی دونوں جلدیں اور اس طرح کی ضخیم ہندوستانی گریمر ایک وقت میں ساتھ رکھنا مشکل ہوسکتا ہے۔ اس لیے یہ مختصر مگر جامع انتخاب غیر ملکیوں کی مدد اور تسہیل کے لیے شائع کی گئی تھی۔ اوری اینٹل لنگوئسٹ کے بارے میں عتیق صدیقی لکھتے ہیں:

> مشرقی زبان دان [Oriental Linguist] میں ہندوستانی رسم خط سرے سے استعمال نہیں کیا گیا تھا۔ اس کے پہلے دو باب۔ قواعد ۱۶ صفحات اور انگریزی ہندوستانی لغت (۵۴ صفحات) میں اس کی پہلی تین کتابوں کا خلاصہ تھا۔ لیکن اس تیسرا باب جو ہندوستانی۔ انگریزی لغت پر مشتمل ہے، یقیناً نیا اور قابل قدر اضافہ تھا۔ اس نئے اضافے شدہ حصے کو بھی گل کرسٹ کتاب شکل میں شایع کرنا چاہتا تھا۔ لیکن بعض دشواریوں کی وجہ سے یہ کام وہ پورا نہ کر سکا۔ (۱۴)

اس کتاب کے چوتھے باب میں انھوں نے ہندوستانی زبان کی چند کہانیوں کو شامل کیا۔ یہ کہانیاں نہ صرف ہندوستانی افراد اور ادب کو سمجھنے کی ایک کاوش تھی دوسرا یہ ان کے ہندوستانی نثر میں دل چسپی کی غمازی بھی کر رہی تھیں۔ اہم بات یہ ہوئی کہ ایک انگریزی کہانی اور دو ہندوستانی کہانیوں میں عورتوں کے مختلف کردار اور ان کے نفسیاتی و کرداری پہلوؤں کو واضح کر کے دراصل انگریز عورت کو ہندوستانی عورت سے برتر دکھانے کی کاوش کی گئی ہے۔ اس کتاب میں Articles of war کے نام سے موجود باب فوجی ضروریات کے لیے مقامی زبان کے مترادفات، بول چال کے جملے دیے گئے ہیں جو اس کے انگریز ساتھیوں کی عسکری ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے شامل کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کی آخری اہم خصوصیت عتیق

صدیقی کے لفظوں میں یہ ہے:

> گل کرسٹ کے مشرقی زبان دان کی آخری قابل ذکر خصوصیت یہ ہے کہ اس کتاب میں اردو اور فارسی کی کئی غزلوں کی دھنیں انگریزی موسیقی کی دھنوں کے سانچوں میں ڈھالی گئی ہیں اوران کے نقشے بھی شامل کیے گئے ہیں۔ جن کو سامنے رکھ کر وہ دھنیں پیانوں پر بجائی جاسکتی ہیں۔ (۱۵)

۱۷۹۸ء میں جان گل کرسٹ کا ایک طویل، حالات کے سرد وگرم کا شاید ہنگامہ خیز اور قیمتی دور ختم ہوا۔ اس طویل قیام کے بعد انھوں نے اپنے وطن واپسی کا باقاعدہ ارادہ کرلیا۔ عتیق صدیقی نے اپنی کتاب ''گل کرسٹ اوراس کا عہد'' میں ان کی سوانحی تاریخ کو مختلف ادوار میں تقسیم کیا ہے اور ۱۷۸۲ء سے ۱۷۹۸ء تک کے عہد کو انھوں نے ان کا پہلا دور قرار دیا ہے۔ انھوں نے انگلستان روانگی کو کلکتہ گزٹ میں باقاعدہ مشتہر بھی کردیا تھا۔ لیکن غازی پور میں ان کی جائیداد کی خرید وفروخت اور اورینٹل گزٹ کی وجہ سے جنوری ۱۷۹۷ء کی دی گئی تاریخ کو واپس جانا ممکن نہ ہوا۔ اس تاخیر کی وجہ سے ہی ان کو ہندوستان کی تاریخ کے ایک اور غیر معمولی فیز سے ہمکنار ہونا پڑا جس نے انھیں ہندوستانیات، اردو ادب، ہندی زبان و ادب اور ہندوستانی زبان و ادب کی مختلف جہات اور ان میں سرانجام دی گئی خدمات سے ناقابلِ تسخیر گل کرسٹ بنا کر امر کر دیا۔

۱۷۹۸ء کے بعد گل کرسٹ کا ہندوستان میں زندگی کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ جو ان کے استعفیٰ دے کر لندن واپس جانے کے سال ۱۸۰۴ء تک امور پر مشتمل ہے۔ اس دور میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو لارڈ ولزلی جیسے مدبر اور علم دوست گورنر جنرل کی خدمات ملیں۔ جس نے جان گل کرسٹ کی لسانی و تدریسی خدمات حاصل کرنے کے لیے فورٹ ولیم قلعے کے ایک کمرے میں Oriental Seminary کے نام سے ایک چھوٹا سا پلیٹ فارم بنانے کا حکم جاری کیا اور ان کو ہندوستانی اور فارسی زبان سکھانے کا مشن سونپا۔ نو وارد انگریزوں کو دونوں زبانوں کی اہمیت کے پیش نظر پابند کیا گیا کہ وہ لوگ گل کرسٹ کی رہنمائی میں دونوں زبانیں سکھیں۔ اس کا دوسرا مقصد گل کرسٹ کی خدمات کا امتحان بھی تھا جس میں وہ عمدہ انداز سے

کام یاب رہے۔ یہ سمینری بعد میں گل کرسٹ سمینری یا گل کرسٹ کا مدرسہ بھی کہلائی:

> Under a resolution of the board dated 21 December 1798, the knowledge of Hindoostane, Persian and Bengali was made essential for all the officers of judicial, revenue and commercial departments. In February, 1799, he started teaching at the oriental Seminary. Later on called Gilchrist's Seminary as the institution was founded by him. This institution was meant for elementary teaching and Gilchrist was the only teacher and suprintendent of the Seminary.(16)

اورینٹل سمینری میں مسلسل محنت نے نہ صرف گل کرسٹ کی قابلیت کا بہتر ثبوت فراہم کیا بلکہ طالب علموں کے امتحان کے لیے قائم کی گئی کمیٹی نے گورنر جنرل کو جان گل کرسٹ کی محنت، لگن اور قابلیت کی بہت تعریف کی۔ کمیٹی کی رپورٹ میں گل کرسٹ کی تعریف سے متاثر ہوکر گورنر جنرل نے اگست ۱۸۰۰ء میں طالب علموں کو اعزازات اور انعامات کے ساتھ اور ان کو شاندار خراج تحسین پیش کیا۔ (ان کا ذکر جان گل کرسٹ کے خطوط میں ملتا ہے۔ جو عتیق صدیقی نے مرتب کر کے شائع کیے)۔ اس کمیٹی کے ان الفاظ میں طالب علم انگریزوں کی کارگردی اور گل کرسٹ کی تدریسی کاوشوں کا ذکر کیا:

> "... all the gentlemen in this class, without exception, manifested a knowledge of the Hindoostanee Language, which greatly surpassed our expectation, both with respect to grammar and Prnunciation... for the last eighteen months... he has been employed with most unremitting assiduity in the prosecution of the duty which your lordship

assigned to him. The great progress in the Hindoostanee Language, made by the gentleman, who have arailed themselves of the benefit of his instructions in the short period during which he has held his present change, affords the strongest testimony of Mr. Gilchrist's knowledge of that language and of his zeal for the diffuion of that knowledge.(17)

گل کرسٹ سمینری کے تجربے کی کام یابی نے لارڈ ولزلی کو ایک ایسا بڑا ادارہ بنانے کی تحریک دی جس میں بڑے پیانے پر زبان کی تحصیل و تدریس کے علاوہ متنوع موضوعات پر تعلیمی کام شروع کیا جائے۔ اس عہد میں کلاسیکی زبانوں یعنی عربی، فارسی، سنسکرت کے ساتھ ساتھ ورنیکلر زبانوں جن میں ہندوستانی (اردو) ہندی، بنگالی اور دوسری اہم مقامی کی اہمیت کو سمجھ کر فورٹ ولیم قلعے میں کالج کا قیام عمل میں لایا جس کو فورٹ ولیم کالج کا نام دیا گیا۔ اس کالج کے بننے سے جان گل کرسٹ کی زندگی میں ایک اہم موڑ آیا۔ ان تمام اشاعتی لسانی منصوبوں جن کے لیے وہ بحیثیت ایک فرد کے ایک عرصے سے کام کر رہے تھے، سرکاری پلیٹ فارم میسر آیا جس سے گل کرسٹ جیسے علم دوست شخص نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اس کالج کا پرنسپل ایک انگریزی پادری ڈیوڈ براؤن کو تعینات کیا گیا۔ گل کرسٹ کو ہندوستانی زبانوں کے شعبے کا صدر نشین، پروفیسر آف ہندوستانی تعینات کیا گیا۔ بعض تواریخ ادب میں یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ جان گل کرسٹ فورٹ ولیم کالج کے پرنسپل تھے لیکن یہ بات درست نہیں۔ گل کرسٹ کالج کے پہلے پرنسپل تھے اور نہ ہی پرنسپل بنے۔ وہ پروفیسر آف ہندوستانی (زبان) تھے اور استعفیٰ تک انھوں نے کالج میں اسی حیثیت سے کام کیا۔

لارڈ ولزلی کے فورٹ ولیم کالج کے منصوبے سے انگریزوں کے اس لسانی تصور کی طرف بڑھنے کا عملی ثبوت ملتا ہے کہ اب اردو زبان سیکھنا محض نوکروں سے بات چیت یا عام لوگوں کو سمجھنا ہی نہیں رہا تھا بلکہ اب اس زبان کو اور بنگالی ہندوستانی اور دیگر بااثر مقامی

زبانوں کو نو آبادیاتی و حکمرانی کے مقاصد کے تحت بروئے کار لانا ضروری تھا۔ اس لیے جان گل کرسٹ کو محض لغت و قواعد سے کام لینا نا کافی لگا چناں چہ فورٹ ولیم کالج میں اس دوسرے اشاعتی منصوبے کا آغاز ہوا جس کے تحت مقامی کلاسیکی اور عوامی ادب کو پڑھ کر لوگوں کی زبان، معاشرت، رسم و رواج تک رسائی حاصل کرنا اہم خیال کیا گیا۔ چناں چہ اس مقصد کے لیے اردو زبان میں موجود کلاسیکی کتب کی تلاش و تحقیق ہوئی تو پتا چلا کہ شاعری کے میدان میں تو بڑے استاد شعرا کا کلام موجود ہے لیکن ابھی اردو زبان کی نثری کتب کی روایت کی طرف سنجیدگی سے توجہ نہیں دی گئی۔ چند ایک نثری کتب جن میں سب رس، فسانہ عجائب، عجائب القصص، نوطرز مرصع جیسی کتب کا گل کرسٹ نے مطالعہ کیا۔ ان کے مطالعے سے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ کوئی عالم تو ان کتب سے استفادہ کر سکتا ہے لیکن نووارد غیر ملکی انگریزوں کے لیے یہ کتب سود مند نہیں ہے۔ چناں چہ انھوں نے کالج میں ایسے مقامی منشیوں، عربی، فارسی اور مختلف مقامی بولیوں زبانوں کے ماہر اساتذہ کا تقرر کیا اور ان کو کلاسیکی نوعیت کے حامل عربی، فارسی، سنسکرتی اور دیگر کاموں کو اردو زبان میں ترجمہ کرانے کے کام پر لگا دیا۔ فورٹ ولیم کالج میں ترجمے کے اس مشن نے نہ صرف نئی اردو نثر کی روایت کو وسعت سے ہمکنار کرنا شروع کیا بلکہ یہ زبان ایک نئے جدید اسلوب سے آشنا ہوئی جو اس سے قبل اس کو نصیب نہ ہوا تھا۔ اگر دیکھا جائے تو گل کرسٹ کا یہ اقدام ہمیں رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے کرتا دھرتا سر ولیم جونز کے اس مشرقی تصورِ لسان و ادب کی طرف لے جاتا ہے جس کے تحت انھوں نے مستشرقین و انگریزوں کی اس جانب توجہ مبذول کرائی تھی کہ اگر روحِ مشرق کو سمجھنا ہے تو اس کے کلاسیکی ادب (شعر و نثر) کو دریافت کر کے اس کو پڑھا جائے۔ یعنی متن کلاسیکی سے مشرق بہ طور خاص ہندوستان کو سمجھا جانا ضروری ہے۔ جان گل کرسٹ نے عوامی بول چال اور کلاسیکی ادب کے مطالعے سے .ندرستانیات کو از سرِ نو زندہ کیا اور اپنی کتب میں پیش کیا تھا۔ گل کرسٹ نے کالج میں صرف اپنی کتب ہی شائع نہیں کیں بلکہ مختلف موضوعات پر درجنوں کتب ترجمہ کرائیں اور انھیں کلکتہ سے شائع کرایا۔

فورٹ ولیم کالج کے قیام سے قبل گل کرسٹ اپنی پانچ کتب شائع کر چکے تھے۔

تصنیف و تالیف کا یہ کام ۱۸۰۰ء کے بعد فورٹ ولیم کالج کے پلیٹ فارم سے زیادہ تیزی سے کرنا شروع کیا۔ اورینٹل سمیزی کے دو سال میں ان کو معاشی یا کسی اور قسم کی پریشانی لاحق نہیں تھی اس لیے یہ دور ان کے لیے فارغ البالی کا دور رہا جس میں انھوں نے تازہ دم ہو کر اپنے اگلے منصوبوں کا منصوبہ بنایا۔ ۱۸۰۰ء سے قبل وہ انگریزی ہندوستانی ڈکشنری، ہندوستانی گریمر، اپینڈکس اور اورینٹل لنگوئسٹ کے ناموں سے چار کتب سامنے لا چکے تھے (لغت کے دو حصے تھے۔ چناں چہ ۱۸۰۰ء میں کتب کی تصنیف و اشاعت کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا۔ ۱۸۰۰ء میں "...The Anti-Jargonist" کے نام سے پانچویں کتاب منظر عام پر آئی۔

اس کا پورا نام:

> The Anti-Jargonist or a Short Introduction to the Hindoostanee Language (Vulgarly but erroneously called the Moors) Comprising the rudiments of the tongue, with an extensive Vocabulary, English and Hindoostanee and Hhindoostanee and English, Accompanied with some plain and useful dialogues, Translations, poems, tales, with the view of illustrating the whole on practical principales, being party an abridgment of the Oriental Linguist, but greatly altered and improved, Emballished with the Hindoostanee Horal Diagram.

کتاب کا طویل عنوان اس دور کا خاصا تھا۔ گل کرسٹ کے علاوہ بھی روایت میں مستشرقین نے اس طرح کتب کے طویل عنوانات دیے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کتاب کا سرورق قاری کو اس کے اندر موجود عنوانات اور مشمولات کا اندازہ ہو سکے۔ یہ کتاب فیرس اینڈ کو کلکتہ (Ferris & Co.) سے ۱۸۰۰ء میں شائع ہوئی۔ کتاب کا انتساب Colonel W. Kirkpatirc، J.H.Harrigton Esq. G.H.Balow Esq، N.B. Endonstone Esq اور W.C. Blaquiere Esq کے نام ہے۔ یہ وہ لوگ

تھے جن کی کمیٹی نے اورینٹل سمینری میں جان گل کرسٹ کے طلبا کا امتحان لے کر نہ صرف ان کی اچھی کارکردگی کی رپورٹ پیش کی تھی بلکہ گورنر جنرل کو گل کرسٹ کی قابلیت کی بھی بے حد تعریف وتوصیف کی تھی جس کی وجہ سے بعد میں ان کو پروفیسر آف ہندوستانی کا عہدہ دیا گیا تھا۔ کتاب کا یہ انتساب کمیٹی کے ان اراکین کے حضور شکرانے کے طور پر کیا گیا ہے۔ ان میں ایک نام کرنل کرک پیٹرک کا بھی ہے جن سے ۱۹۸۵ء میں گل کرسٹ ملا تھا اور اس کی لغت ابھی تک نہ چھپی تھی اور اس نے گل کرسٹ کی ۱۷۸۶ء میں چھپنے والی لغت کے لیے اپنی کتاب کی اشاعت روک کر تعاون کیا تھا۔ شکرانے کے اس نوٹ پر ۲۱ نومبر ۱۸۰۰ء کی تاریخ درج ہے۔

کتاب کے مشمولات پر نظر دوڑائیں تو پہلا حصہ ابتدائی مشاہدہ (Preliminary Oservations) کا ہے۔ اس میں مصنف نے کتاب میں استعمال ہونے والے مختلف الفاظ واصطلاحات کے مخفف حروف اور قواعدی اشاروں سے رہنمائی کی ہے تاکہ کتاب میں مختلف جگہ اصطلاحات کی جگہ صرف ان مشتق اشاروں کا استعمال کیا جائے اور وقت اور صفحے ضائع نہ ہوں۔ مثال کے طور پر ہائی فن (-)Hypen کہاں استعمال کیا جاتا ہے۔ ہائی فن کے استعمال کے لیے مثال یوں دی ہے مثلاً رکھنا r. ruk,hna، b. band,hana باندھنا وغیرہ۔ انگریزی حروف کے اور ایچ اور ڈی اور ایچ کے درمیان ہائفن کے استعمال سے گل کرسٹ نے ہائیہ آوازوں کی رومن خط میں نشان دہی کی ہے جس کے استعمال کو اس کے رومن سکرپٹ میں مختلف جگہ پر دیکھا جاسکتا ہے۔

کتاب کا تعارفی باب دراصل کلکتہ گزٹ کی ۲۱ اگست ۱۸۰۰ء کی اشاعت میں شامل ایک مضمون کا ٹکڑا ہے جس کو کتاب کے شروع میں لگایا گیا ہے۔ اس سے کتاب کی اہمیت، تعارف، وجہ تسمیہ، افادیت اور دوسرے جارگن الفاظ (Jargon words) سے ان کی کتاب کا تقابلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مذکورہ بالا کمیٹی کی ان رپورٹوں کو بھی کتاب کے تعارفی باب کا حصہ بنایا گیا ہے۔ جو اورینٹل سمینری کے جونیئر کمیشنڈ آفیسرز کے امتحان کے بعد گورنر جنرل کے حضور پیش کی گئی تھی۔ یہ حصہ بتاتا ہے کہ اس کی اشاعت کا ایک

مقصد تو کمیٹی کے لیے اظہار ممنونیت پیش کرنا تھا۔ دوسرا گل کرسٹ کے کام کی تعریف و توصیف کو عام قاری کے سامنے لانا تھا جو مصنف کی فطری سی خواہش معلوم ہوتی ہے۔

کتاب کا پہلا سیکشن دو اجزا پر مشتمل ہے۔ یہ دونوں اجزا اردو قواعد کے مباحث پر مشتمل ہیں۔ گل کرسٹ نے قواعد کا ضروری حصہ اس سے قبل اورینٹل لنگوئسٹ میں بھی شامل کیا تھا۔ اسی طرح اس کتاب میں بھی ضروری قواعدی مباحث اور تصورات شامل ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ۱۷۹۶ء والی ضخیم گریمر کی کتاب کو ایک ہی وقت میں اٹھا کر حوالے کے لیے استعمال کرنا قاری کے لیے ایک مشکل امر ہو سکتا ہے، دوسرا ضروری نہیں کہ اسے ان کتب کے لیے قواعد وضاحت کی ضرورت پڑے اور گریمر ان کے پاس موجود ہو چناں چہ قواعد کے بنیادی تصورات اس وجہ سے اس کتاب کا حصہ بنائے گئے ہیں۔ ان میں پہلا جز وحروف تہجی، املا، لفظوں کی مختلف اشکال، بنانے کے طریقے اور علم ہجا پر مشتمل ہے۔ دوسرے حصے میں اسم (Noun) آرٹیکل، Postposition، ضمیر (Pronoun) اسم صفت (Adjective) اور اسی حصے کا تیسرا جز فعل (Verb) اور متعلقاتِ فعل کے عنوان کے تحت ہے۔ قواعد کے اس حصے میں تذکیر و تانیث کے اصولوں کے ساتھ مقامی مثالوں کو پیش کر کے اس مختصر حصے کو جامع بنایا گیا ہے۔ قواعدی مباحث کے بعد، ایک واضح حصہ انگریزی ہندوستانی اور ہندوستانی انگریزی کے ذخیرہ الفاظ پر مشتمل ہے۔ یہ حصہ رومن رسم الخط میں ہے جس میں ہندوستانی، ناگری، عربی رسم الخط میں الفاظ ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر انگریزی لفظ circle کے معنی کو دیکھا جا سکتا ہے، Circle, Ghera, Chukker, Koondulee, Hulku, Da,ru, Mundul سرکل کے مترادف الفاظ کے انتخاب میں اردو، سنسکرت، ہندوی، پنجابی غرض ہر ممکن لفظ کو استعمال کیا گیا ہے جو ان کی تلاش و انتخاب الفاظ میں محنت کی بہتر مثال پیش کرتا ہے۔

دیگر مشمولات میں ہندوستانی گنتی، گنتی کے مختلف تلفظ، استعمالات، ہفتے کے دن (مسلم اور ہندو) اسلامی مہینوں کے ساتھ ساتھ ہندو نام، افواج کی اصطلاحات، ان کے مقامی مترادفات اور کارآمد بول چال کے جملے (Dialogues) شامل کر کے کسی سیاح کے لیے

ایک بہترین پاکٹ بک بنا دی گئی ہے۔ ہندوستانی زبان میں عام استعمال ہونے والی اصطلاحات کو لغت کے دونوں حصوں سے الگ کر کے ان کے اردو مترادفات درج کیے گئے ہیں، مثلاً Doubtful, Moobhum (مبہم) Connection, Ittesal (اتصال) وغیرہ۔ کتاب میں لیفٹیننٹ (Webster) کا ایک مضمون Military Terms کے عنوان سے شامل کیا گیا ہے۔ ان میں جنگ، فوج اور ان کے متعلق الفاظ و اصطلاحات کا ذخیرہ شامل ہے مثال کے طور پر Attack کے مترادف ومفہوم کے لیے Dhawaa (دھاوا) Churhaee (چڑھائی) Humla (حملہ) جیسے الفاظ دیکھے جا سکتے ہیں۔ عسکری اصطلاحات کے بعد Dialogues (مکالمات) کے عنوان عنوان سے بول چال کرے ضروری جملے درج ہیں۔

اس کتاب کی اشاعت کے بعد جان گل کرسٹ کی زندگی کا دوسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ جب انھوں نے فورٹ ولیم کالج میں ہندوستانی زبان کے پروفیسر کی حیثیت سے تعیناتی قبول کی اور تصنیف وتحقیق وتالیف کے ایک نئے دور میں داخل ہوئے۔ اس دور نے ان کی زندگی کو جدید اردو ادب کا ایک سنگ میل بنا کر پیش کیا۔

حوالہ جات اور حواشی :

1. Hamayun Kabir, Professor, Foreword, Origins of modern Hindustani Literature, by, M Atique Siddiqi, Naya Kitab Ghar, Ali Garh, P-7

۲۔ ابواللیث صدیقی، جامع القواعد (حصہ صرف)' (لاہور' اردو سائنس بورڈ' طبع دوم' ۲۰۰۴) ص (۴۵۔۱۴۴)

3. Richard Steadman Jones, P-1

۴۔ ایضاً۔ ص ۱

۵۔ گل کرسٹ، جان، Appendix، مشمولہ: گل کرسٹ اور اس کا عہد (' علی گڑھ' انجمن ترقی اردو' ہند ۱۹۶۰ء) ص ۲۶

۶۔ ایضاً

7. Sadiq-ur-Rehman Kidwai, Gilchrist and the 'Language of Hindoostan' Rachna Parkashan New Delhi, 1972, P. 39

۸۔ حقوق گروی رکھنے کا ذکر، گل کرسٹ کے ضمیمے اور کتاب کے دیباچے میں بھی موجود ہے، مزید تفصیل گل کرسٹ اور اس کا عہد کے صفحہ نمبر ۳۷ پر موجود ہے۔

۹۔ صدیق الرحمن قدوائی، ص ۴۳

۱۰۔ انھوں نے ہندوستانی انگریزی لغت کو ہندوستانی فلالوجی سے نکال کر یہ منصوبہ صرف تین کتب تک

محدود کر دیا تھا۔ تفصیل کے لیے گل کرسٹ اور اس کا عہد صفحہ ۸۵ پر یہ معلومات موجود ہیں۔

۱۱۔ گل کرسٹ اور اس کا عہد۔ ص ۴۰

۱۲۔ ایضاً، ص ۸۹

۱۳۔ ایضاً، ص ۱۰۱۔۱۰۰

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۰۲

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۰۳

۱۶۔ صدیق الرحمان قدوائی، ص ۴۶

۱۷۔ Origins of modern Hindustani Literature، ص ۷۴

2.8

ماقبل نوآبادیاتی عہد میں زبانِ حکمرانی کی تشکیل، جان گل کرسٹ کا اہم لسانی منصوبہ

جان گل کرسٹ (۱۸۴۱۔ ۱۷۵۹) کو اردو زبان اور ادب کی ترویج اور اشاعتی منصوبوں کی وجہ سے اردو تاریخ میں اہم مقام حاصل ہے جس کی اہمیت تا دیر رہے گی۔ اردو لسانیات، تقابلی لسانیات اور ہندوستانیات (Indology) کے شعبوں میں ان کی گراں قدر خدمات پر اردو طبقے نے محض معمولی اور تعارفی نوعیت کے کام سے ان کی لسانی و ادبی جہات سامنے لانے کی کوششیں کی ہیں جو اپنی جگہ اہم ہیں۔ اٹھارھویں صدی میں گو فارسی زبان سرکار اور اشرافیہ کی وجہ سے کلاسیکی حیثیت برقرار رکھے ہوئے تھی لیکن اردو (ہندوستانی) زبان ورنیکلر (vernaccular) ہوتے ہوئے بھی تیزی سے فارسی کی جگہ معتبر زبان بنتے جا رہی تھی۔ اردو طبقہ اپنے طور اس زبان کو اصلاحِ زبان کا نام دے کر عوامی لب و لہجے سے دور کرنے کی اپنی سی کوشش میں مگن تھا لیکن علاقائی لب و لہجے اور محاورے نے اس زبان کی ترقی کی رفتار کو تیز کر دیا تھا۔ اس منظرنامے میں گل کرسٹ ہندوستان آئے (۱۷۸۲ء)۔ اردو زبان کی افادیت، اس میں چھپے امکانات کو دریافت کرنے کے بعد اس کو کلاسیکی زبانوں کے

ہم پلہ بنانے کے لیے اپنے لسانی منصوبے کا آغاز کیا جس پر چل کر اردو اس مستند مقام تک پہنچی جہاں اس کو انگریزوں نے سرکاری زبان کا درجہ دیا۔

جان گل کرسٹ کے ہندوستان آنے کے (۱۷۸۲ء) فوراً بعد طب کے شعبے کو چھوڑ کر مقامی زبانوں، بالخصوص اردو زبان کی تحصیل کی طرف ان کی عملی کاوش ان کے ابتدائی دور کا ایک بڑا کارنامہ سمجھی جاسکتی ہے۔ ایک نووارد غیر ملکی نوجوان کے لیے کیریئر کے ابتدائی برسوں میں طب جیسے اہم شعبے کو نظر انداز کر کے غیر ملکی زبانوں کی تعلیم حاصل کرنے کی طرف یوں متوجہ ہونا ان کی لسانی خدمات کے سلسلے کا پہلا سنگ میل ہے۔ جس کے بعد انھوں نے اردو زبان کی مختلف جہات میں قابلِ قدر اور غیر معمولی لسانی اہمیت کا حامل اقدامات کیے۔ جان گل کرسٹ کی نگاہ دوررس نے اس عہد میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے بڑھتے ہوئے جارحانہ اقدامات کو بھانپ لیا تھا کہ کمپنی کا مطمح نظر بہت جلد تجارت سے ہٹ کر ہندوستان کی حکمرانی میں تبدیل ہوگا۔ اس مقصد کے لیے کمپنی اور اس کے مقامی مقتدر افسروں کو مقامی آبادی پر حکمرانی کرنے اور ان کو سمجھنے اور اپنا نقطۂ نظر واضح کرنے کے لیے بہت جلد کسی ایسی زبان کی ضرورت پیش آنے والی ہے جو پورے ملک میں بولی اور سمجھی جاسکتی ہو۔ چناں چہ اس دور میں ہندوستانی زبان (موجودہ اردو) ملک میں رابطے کی عام زبان ہونے کے باعث ان کی نظر انتخاب میں آئی۔ ہندوستانی زبان کی تحصیل کا مقصد گل کرسٹ نے اپنی کتاب 'Appendix' میں افشا کیا۔ گل کرسٹ لکھتے ہیں:

> I instantly foresaw that my residence, in any capacity, would prove as unpleasant to myself, as unprofitable to my employers, until I acquired an adequate knowledge of the current language of the country, in which I was now to sojourn. I therefore sat resolutely down to acquire what was then termed as the Moors. During the march with the bengal Troops under the command of Col. Charles Morgan

from Surat to Fatehgarh, I had innumerable instances in every town and village, we visited of the universal currency of Language, I had been learning"(1)

گل کرسٹ کے ان جملوں پر غور کیا جائے تو دو زاویے واضح ہو کر سامنے آتے ہیں۔ ایک یہ کہ ان کا قیامِ ہندوستان یہاں کی زبان جانے بغیر ان کے لیے بے اطمینانی کا سبب رہے گا۔ دوسرا یہ کہ ان کے فوجی، افسروں، انگریزی مقتدر اشرافیہ اوران کے دوستوں کے لیے بھی مسائل بنا رہے گا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اگر بنگال پر کمپنی نے حکومت کام یاب بنانی ہے تو اس کے لیے یہاں کے مقامی باشندوں کی زبان سے دوری نہ فرحت بخش رہے گی نہ سود مند۔ یہ پیراگراف ایک فرد کی سوچ، ایک نو آبادیات کار کی سوچ کا زاویہ پیش کرنے کے لیے کافی ہے۔ دیکھا جا سکتا ہے کہ کس طرح بنیادی سطح پر فرد کے ہاں مقامی زبان سیکھنے کے پیچھے محض زبان سیکھنے کا جذبہ نہیں بلکہ ایک استعماری سوچ کے تحت مقامی زبان کی تحصیل کی طرف متوجہ ہونے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچا جا رہا تھا۔ یہ تو تھی ایک فرد کی سوچ لیکن ایک فرد کی سوچ کے متوازی کمپنی کے حکمران افسروں کی حریص سوچیں اسی طرح کے منصوبے کی طرف متوجہ ہو رہی تھیں۔

۱۷۸۵ء تک ایسٹ انڈیا کمپنی کے کرتا دھرتاؤں کا منصوبہ تجارت سے حکمرانی میں تبدیل نہیں ہوا تھا۔ کمپنی کے ڈائریکٹران ہندوستان میں موجود گورنر جنرل اور دیگر افسران کو ہدایت کر رہے تھے کہ وہ ہندوستان کے اندرونی و سیاسی معاملات میں دخل اندازی نہ کریں اور اپنا دھیان صرف اور صرف تجارتی مفادات اور ان سے حاصل کیے جانے والے زیادہ سے زیادہ منافع پر رکھیں، لیکن یہ بات اہم ہے کہ اس عہد کے سیاسی حالات کی دگرگوں کیفیت نے مغل حکمرانوں کی نااہلی کا راز انگریزوں کے سامنے کھول کر رکھ دیا تھا۔ مغل بادشاہ شاہ عالم ثانی کو غلام قادر روہیلہ گرم سلائیاں پھیر کر اندھا کر چکا تھا۔ ملک پر نابینا بادشاہ کی موجودگی نے کمپنی کے افسران کے دل میں حکمرانی اور قبضے کا بیج بو دیا جو جلد ہی درخت بن گیا۔

چناں چہ ۱۷۸۶ء میں ایک قانون پاس ہونے سے کمپنی کا نقطۂ نظر تجارت سے ہٹ کر ہندوستان کی حکمرانی کے میدان میں تبدیل ہو گیا۔ ڈاکٹر سمیع اللہ کے مطابق:

> (آخرکار) ۱۷۸۶ء میں ایک قانون پاس ہوا جس میں گورنر جنرل کو سپہ سالار اعظم تسلیم کر لیا گیا... اس قانون کی رو سے ایسٹ انڈیا کمپنی صرف ایک تجارتی کمپنی ہی نہیں رہی بلکہ ہندوستان میں ایک سیاسی قوت بن گئی۔ اب اسے ہندوستان کے سیاسی معاملات میں این وآں کرنے کا قانونی اختیار بھی حاصل ہو گیا۔ (۲)

۱۷۸۶ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹروں کو جس قانون کے پاس کرنے کا خیال آیا، اس حکمرانی کا تصور گل کرسٹ پہلے ہی کر چکے تھے۔ انھوں نے کمپنی کے استعماری مقاصد کو بھانپ کر یہ اندازہ کر لیا تھا کہ ہندوستانی مقامی حکمران نااہل ہیں۔ لوگوں میں بھی ان حکمرانوں سے بے دلی پائی جاتی ہے اور یہ کہ سماجی درجہ بندی سے لے کر جاگیردارانہ نظام کے شکنجے میں جکڑے ہوئے افراد کے دلوں سے اشرافیہ اور حکمرانوں سے بے دلی بڑھ رہی ہے۔ چناں چہ انھوں نے ہندوستان کی حکمرانی پر بہت جلد انگریزوں کا مستحکم ہوتا قبضہ جانچ لیا تھا۔ اس دور میں یورپ تیزی سے وسائل سے مالا مال ممالک کو نوآبادیاتی نظام کے شکنجے میں کس رہا تھا، بال آخر ہندوستان کو بھی ایک نوآبادی بنانے کی طرف انگریزوں کا رجحان ہوا۔ گل کرسٹ نے حکمرانی کے مقصد کی بنیادی ضرورت زبان کو خیال کیا۔ وہ اس حقیقت کو سمجھتے تھے کہ انگریز حکمران مقامی کلچر پر حملہ کر کے اس کو تباہ و برباد تو کر سکتا ہے، اس کی حفاظت نہیں کر سکتا۔ ملک بھر میں سرکاری زبان فارسی اشرافیہ کی زبان اور ادبی زبان کے طور پر موجود تھی لیکن مقامی زبان اردو تیزی سے ہر میدان میں اس زبان کی اہمیت کم کر کے اپنی جگہ مستحکم کرتی جا رہی تھی۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ اردو زبان عوامی بول چال کے ساتھ ساتھ اٹھارھویں صدی میں ادبی زبان کے ممتاز درجے کو پا چکی تھی۔ گل کرسٹ نے اس ادراک میں دیر نہیں لگائی کہ انگریز اپنی حکمرانی مستحکم کرنے کے بعد فارسی زبان کو مغل عہد کے یادگار ہونے کی وجہ سے بھی سرپرستی نہ کریں گے اور اس کی جگہ ان کو کسی اور ایسی زبان کی ضرورت

پڑے گی جو سرکار دربار کا کام بھی بہ خوبی انجام دے سکے اور عوام کا حکمرانوں سے رشتہ بھی ممکن بنا سکے۔ چناں چہ اردو زبان (ہندوستانی) گل کرسٹ کو وہ زبان لگی جو اس مقصد کے لیے بروئے کار لائی جا سکتی تھی۔ پس اس زبان کی تحصیل، اس میں لسانیاتی کام کی طرف متوجہ ہونا، اس کی قواعد و لغت مرتب کرنا گل کرسٹ کو اہم کام نظر آیا اور بلاشبہ وقت نے ان کی دوراندیشی اور اس کام کی اہمیت کو ثابت کر کے رکھ دیا کہ یہ کام طب کے کام سے کہیں زیادہ اہم تھا۔ گل کرسٹ کو اپنے منصوبے کی اہمیت اور افادیت پر اتنا بھروسہ تھا کہ وہ اپنے کام کی بدولت مقتدر طبقے کی توجہ اس زبان کی مذکورہ اہمیت کی طرف دلانے میں کام یاب رہے۔ ان کے منصوبے کی اہمیت پر عتیق صدیقی لکھتے ہیں:

> ہندوستان آتے ہی اس کے ذہن رسا نے یہ اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ ہندوستان کا بوڑھا جاگیردارانہ نظام، اس کے وطن کے نوخیز تجارتی سامراج کے مقابلے میں ٹک نہ سکے گا۔۔۔ اسے اپنے اس خیال پر بھی پورا بھروسہ تھا کہ حکمران طبقے کے تجارتی و انتظامی مصالح ان کو ہندوستانی زبان کے سیکھنے پر جلد ہی مجبور کر دیں گے، جس کے موثر ذرائع اس وقت کلیتاً ناپید تھے۔ (۳)

گل کرسٹ نے اس مقصد کی لیے "ہندوستانی فلالوجی" (Hindoostanee Philology) کا منصوبہ اختراع کیا۔ یہ منصوبہ اردو زبان کی قواعد، لغات (انگریزی ہندوستانی، ہندوستانی انگریزی) اور ضمیے پر مشتمل تھا جس کے تحت ۱۷۸۶ء سے ۱۷۹۸ء تک چار کتابیں انگریزی زبان میں تالیف کیں۔ منصوبے کی غرض و غایت یہی تھی کہ کمپنی کی لسانی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے جتنی جلدی ممکن ہو سکے یہ مواد اکٹھا کر کے کتابی شکل میں مرتب کر دیا جائے۔ اس منصوبے میں گل کرسٹ کو کٹھن راہوں کے سفر کرنا پڑے۔ ہندوستانی انگریزی لغت مرتب نہ ہو سکی لیکن اس سلسلے کی تین کتب، انگریزی ہندوستانی لغت، ہندوستانی گریمر اور اپینڈکس (Appendix) کی اشاعت نے ان کے اشاعتی منصوبے کی صورت میں کمپنی کے حل وعقد کو یہ مضبوط بنیاد فراہم کر دی تھی کہ وہ اس نوزائیدہ زبان پر مکمل اعتماد کرتے ہوئے حکمرانی کی زبان کے طور پر منتخب کریں اور انگریز افسروں اور دیگر انتظامی امور

سے جڑے افراد کو اردو زبان کی تحصیل کی طرف راغب کریں اور یہ کام عملی صورت میں ممکن بھی ہوا۔ اس زبان کی اہمیت اور گل کرسٹ کا اس زبان میں انہاک دیکھ کر لارڈ ولزلی (Wellesley) نے اسم منصوبے کا عملی تجربہ کرنے کے لیے گل کرسٹ کو ۱۷۹۸ء میں محدود پیانے پر ایک ''سیمینری'' شروع کرنے کی اجازت دی۔ ان کی حوصلہ افزائی سے اوری اینٹل سیمینری (Oriental Seminary) کا قیام (۱۷۹۹ء) گل کرسٹ کی کوششوں کی ایک بہت بڑی فتح تھی جو عملی شکل میں سامنے آئی۔ اس سیمینری کو ''گل کرسٹ کا مدرسہ'' بھی کہا جاتا تھا۔ اس پلیٹ فارم کی کام یابی سے ہی دراصل فورٹ ولیم کالج کے منصوبے کا خیال عملی طور پر ممکن ہو سکا۔

کمپنی کے ملازمین کو فارسی زبان سیکھنا ضروری تھا، لیکن یہ زبان سیکھنے میں کچھ دشواریاں موجود تھیں جن کی وجہ سے ملازمین فارسی زبان کی تحصیل میں کامل کام یابی سے ہم کنار نہ ہوتے۔ گل کرسٹ نے ان مسائل کے حل کے لیے یہ تجویز پیش کی تھی کہ مقامی منشیوں سے کمپنی ملازمین کے فارسی سیکھنے کے مرحلے کو سہل بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ان کو پہلے مقامی زبان (اردو) سکھائی جائے۔ اس زبان کو سیکھنے کے بعد ملازمین کے لیے فارسی زبان میں کام یابی حاصل کرنا زیادہ سہل ہو جائے گا۔ ان کی یہ تجویز ۱۷۹۸ء سے قبل کی ہے جس کو لارڈ ولزلی نے قبول کرتے ہوئے ''مدرسۂ شرقیہ'' بنانے کی منظوری دی تھی۔ عتیق صدیقی کے مطابق:

> [ولزلی لکھتے ہیں] مسٹر گل کرسٹ کی پیش کش کو قبول کر لینا ہی مناسب ہوگا۔ کیوں کہ دیسی زبان کی تعلیم کو فروغ دینے میں یہ تجویز مد ثابت ہوگی۔ میری رائے ہے کہ اس کو منظور کر لیا جائے اور آئندہ جنوری سے اس پر عملدرآمد شروع ہو جائے۔ کلکتے میں جو نو وارد رائٹر اس وقت موجود ہیں ان کو ایک سال تک گل کرسٹ سے درس لینے کی ہدایت کی جائے۔ (۴)

لارڈ ولزلی کی یہ منظوری گل کرسٹ کے اردو زبان کے نفاذ کے عملی پہلو کی طرف ایک بڑا قدم تھا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس مدرسے کا قیام دراصل فورٹ ولیم کالج کے منصوبے کا آغاز

تھا۔ لارڈ ولزلی انھی اقدامات کے باعث مشرقی علوم وفنون کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ ولزلی نے ایک مشرقی کالج (فورٹ ولیم کالج) کے قیام کا منصوبہ گل کرسٹ سے متاثر ہو کر مستحکم کرلیا تھا۔ ان کا یہ منصوبہ کسی طور پر بھی مشرقی علوم کی بڑی یونی ورسٹی سے کم نہ تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ کالج کا برقرار رہنا ہی آگے چل کر کمپنی کے تاجر ذہنیت کے ڈائریکٹران نے مشکل بنا دیا تھا۔ اس سلسلے میں اردو زبان کے موجودہ روپ سروپ، اہمیت، اس کے بارے میں ملکی و غیر ملکی افراد کی آرا پر گل کرسٹ نے اپنا زاویہء نظر واضح کیا۔ اردو زبان کی اہمیت راسخ کرنے کے لیے ضروری تھا کہ اس کے بارے میں غیر ملکی افراد کی غلط فہمیاں دور کی جائیں۔ عام طور پر اس عہد میں اس زبان کو "Moors" زبان کے نام سے پہلے کے مستشرقین نے موسوم کیا تھا۔ اس نام سے ایک مفہوم تو یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ یہ صرف مسلمانوں کی بولی جانے والی زبان ہے،۔ دوسرا یہ کہ یہ ایک غیر ترقی یافتہ، غیر مہذب، گلیوں بازاروں کی دیہاتی زبان ہے جس کو اشرافیہ کے ہاں کوئی علاقہ نہیں۔ Moors نام کی اس غلط تشریح سے پیدا ہونے والے مفہوم کی وجہ سے گل کرسٹ سے قبل جارج ہیڈلے (George Hadley) اپنی اردو قواعد میں ناپسندیدگی کا اظہار کر چکے تھے کہ یہ نام اردو زبان پر صادق نہیں آتا۔ جان گل کرسٹ نے اعلانیہ احتجاج کی صدا بلند کی اور اپنی کتب کے سرورق پر واضح انداز سے Moors نام رکھنے اور پکارے جانے پر ناپسندیدگی کا اظہار درج کیا۔ ان کی کتب کے سرِ ورق پر جہاں جہاں مورس (Moors) نام لکھا ہے وہاں پر واضح انداز سے اس پر 'Improperly Called Moors Language' درج ہے جو اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ان کو اس بات سے شدید چڑ تھی کہ اس کے پیش رو محض غلط فہمی کی بنا پر اس مہذب زبان کا غیر مہذب نام عام کر گئے تھے اور یہ نام ٹھیک نہیں تھا۔

ہندوستانی زبان کیا ہے۔ اس کو واضح کرنے کے لیے جو حد بندی اور معلومات گل کرسٹ نے دی ہیں، اس سے قبل نہ دی گئی تھیں سب سے پہلے تو یہ بات سمجھنے کی ہے کہ گل کرسٹ ہندوستانی زبان کسے کہتے ہیں۔ (اس سلسلے میں ان کی کتاب "Oriental Linguist" کے تعارفی باب میں دی گئی تفصیل سے بہ خوبی استفادہ کیا جا سکتا ہے)۔ اس

تفصیل کی رو سے یہ پتا چلتا ہے کہ گل کرسٹ کے نزدیک ہندوستانی زبان ہندوستان بھر کے ہندوؤں مسلمانوں اور پورے ملک کی مشہور زبان ہے۔ مسلم حملہ آوروں اور حکمرانوں کی ہندوستان آمد سے قبل یہ زبان ہندوی/ ہندی کہلاتی تھی۔ جب مسلم دور حکومت ہندوستان میں شروع ہوا تو ان کی عرب و ایران و افغانستان سے آمد اور ان کی اپنی زبانوں عربی، فارسی اور ترکی کے الفاظ کی مقامی ہندوی زبان میں آمیزش سے اس ہندوی کا روپ بدلتا چلا گیا جو بعد میں وہ نہ رہا جو ہندوی کی شکل میں ہندوستان میں پہلے سے موجود تھا۔ مزید یہ کہ امیر تیمور کے حملوں کے دور میں یہ زبان ہندوستانی کی شکل اختیار کرتی ہے۔ یوں فارسی عربی الفاظ، تلفظ اور محاورے کی آمیزش سے یہ زبان ہندوستانی زبان بن گئی۔ انھوں نے ہندوستانی زبان کی تشکیل اور مسلم حکمرانوں کی زبانوں کے اشتراک ونفوذ کو ایک دل چسپ مثال سے واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ گل کرسٹ لکھتے ہیں:

> Hinduwee, I have treated as the exclusive property of Hindoos alone; and have therefore constantly applied it to the old language of India, which prevailed before the Moosulman invasion; [now Hindoostanee is] composed of Persian and Arabic in which the two last may be considered in the same relation, that Latin and French bear to English: while we may justly treat the Hinduwee of the modern speech of Hindoostanee, as the Saxon of the former thus:-
>
> Saxon LATIN French = English,
>
> Hinduwee Arabic Persian = Hindoostanee.(5)

اس پیراگراف کی مدد سے ایک نتیجہ یہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اردو زبان کو یورپی کلیے اور فارمولے کی مدد سے سمجھا جا رہا تھا۔ گل کرسٹ نے گو اردو زبان کی قواعد مرتب کرتے ہوئے یہ نقطہ نظر اختیار کیا تھا کہ ان سے قبل کے قواعد نویس اردو زبان کے قواعدی ماڈل کو

لاطینی طرز کے ماڈل کے تابع رکھ کر زبان کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہے جس کی وجہ سے قواعدی کتب میں خامیاں در آئیں اور یہ کہ اس زبان کو اس کے اپنے نظام سے سمجھا جانا چاہیے تھا لیکن مذکورہ اقتباس کی روشنی میں ہم دیکھتے ہیں کہ گل کرسٹ نے بھی اردو زبان کی تشکیل میں عربی فارسی کے کردار کی مثال دینے کے لیے انگریزی زبان کی تشکیل میں شامل فرنچ لاطینی وغیرہ کی مثال سے سمجھانے کی کوشش کی ہے یعنی گل کرسٹ بھی اردو زبان کو یورپی ماڈل کے تقابل سے ہی سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک اہم کام اس ضمن میں انھوں نے یہ کیا کہ اس زبان کا ایک نام متعین کیا جسے آئندہ چل کر ہندوستانی زبان کہا جانے لگا۔ گل کرسٹ نے ہندوستان کی وہ مختلف بولیاں جنھیں گریرسن (Grierson) نے اپنے لسانیاتی جائزہ، ہند میں ہندوی آریائی کی مرکزی بولیوں کا نام دیا تھا اور جو ہمالہ کی رائی سے لے کر کماری کے ساحل تک اور بمبئی سے لے کر کلکتے تک مختلف شکلوں میں بولی اور سمجھی جاتی تھیں، ان کو ترقی دے کر گل کرسٹ نے زبان کا درجہ دے دیا اور ہندوستانی اس کا نام رکھا۔ اور پھر اس جدید ہندوستانی زبان کا نیا نثری ادب پیدا کیا۔ گل کرسٹ کا یہ ایسا کارنامہ ہے جس کے سامنے مستشرقین کے کام بے حقیقت ہیں۔ (۶)

گل کرسٹ کی مساعی کی بدولت اردو زبان گلی کوچوں کی عوامی بول چال کی سطح سے ترقی کر کے دفتری، رسمی، ادبی، سفارتی زبان بن گئی اور مقامی ہندوستانی بولیوں کو زبان کے درجے پر پہنچانا گل کرسٹ کا ایسا اعزاز ہے جو ان کو تواریخ زبان و ادب میں ہمیشہ سرخرو رکھے گا۔ جان گل کرسٹ کی پیہم کوششوں سے ہی بالآخر ایسٹ انڈیا کمپنی کو گل کرسٹ کی اس رائے پر قائل ہونا پڑا کہ فارسی زبان کی بجائے اردو زبان کو سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے۔ مولوی سید محمد لکھتے ہیں:

> ڈاکٹر گل کرسٹ نے ہندوستان کی مختلف زبانوں پر ناقدانہ نظر ڈال کر ارباب مقتدر کو مطلع کیا کہ اب فارسی ہندوستان کے باشندوں کی زبان نہیں رہی... جو علاقے کمپنی کے تصرف میں ہیں ان میں فارسی کو دفتر زبان کی حیثیت سے برقرار رکھنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ دیگر ملکی السنہ میں صرف اردو یا ہندوستانی

> کا دائرہ عمل نہایت وسیع ہے اور ضرورت ہے کہ اس عام بول چال کی زبان کی تحصیل کی جائے ابتداً ان کی اس معقول تحریک پر جیسی چاہیے توجہ نہیں کی گئی مگر بعد ازاں یورپی ماہر السنہ نے متفقہ طور پر ان کی رائے قبول کر لی۔ ۱۸۳۲ء میں اردو سرکاری زبان قرار پائی۔ (۷)

گل کرسٹ نے اردو کے روز مرہ کے استعمال کو بہ طور خاص اہم سمجھا۔ روز مرہ، محاورہ، عوامی بول چال اور مشاہیر و کلاسیکی شعراء کا کلام ان کو اردو زبان کے متنوع استعمالات سمجھانے میں سود مند ثابت ہوا۔ سر ولیم جونز (Sir William Jones) نے ہندوستان آ کر یہ نقطۂ نظر مستشرقین کے لیے پیش کیا تھا کہ اگر ہندوستان کو سمجھنا ہے تو اس کے کلاسیکی متن کو سمجھو۔ ولیم جونز نے سنسکرت اور فارسی کے متون کے مطالعہ۔ ہندوستان اور ہندوستانی فرد کا خاکہ بنا کر اس کو سمجھا۔ گل کرسٹ نے ولیم جونز کے اس نقطۂ نظر میں اپنا نقطۂ نظر شامل کیا کہ اگر صرف کلاسیکی متون سے مقامی فرد کا خاکہ بنایا گیا تو وہ اس قدر جامع اس لیے بھی نہ ہوگا کہ عموماً ادب اشرافیہ کے ذوق و معاشرت کا ایک تصور واضح کر دے گا لیکن زبان کا وہ بنتا بگڑتا روپ اور مزاج جس کا براہ راست تعلق عوام سے ہے اس کا تصور واضح نہ ہو سکے گا۔ چناں چہ گل کرسٹ نے کلاسیکی متون کے ساتھ ہندوستانی عوامی معاشرت، زبان، جارگن، مورز، بگڑا الٹ لہجہ، Vulgar روپ، نیز مختلف رائج روپ مطالعہ کرنے کے بعد ہندوستان اور ہندوستانی فرد کا وہ روپ بنا کر پیش کیا جو اپنی حقیقت کا واقعی ہندوستان کا نمائندہ فرد تھا۔ یہاں جان گل کرسٹ ولیم جونز سے یوں بھی زیادہ واضح اور کام یاب رہے کہ ولیم جونز کا مخاطب اشرافیہ کا پڑھا لکھا طبقہ تھا جس کی زبان اور لب و لہجہ آراستہ و پیراستہ تھا جب کہ جان گل کرسٹ نے ان پڑھ، غیر ترقی یافتہ ہندوستانی فرد کو مطالعہ میں شامل کر کے اس عہد کی مستشرقین کی روایت میں اضافے کیے۔

گل کرسٹ نے اس دور میں اپنے قلیل عرصے کے مشاہدے سے یہ ادراک کرنے میں دیر نہ لگائی کہ ہندوستان کو سمجھنا ورنیکلر زبانوں کی مدد سے آسان ہوگا جو تمام افراد کے مابین رابطے کا ذریعہ ہو۔ ہندوستانی زبان اس دور میں صرف عوامی بول چال اور ملک بھر میں

لنگوا فرینکا کے طور پر ہی مستعمل نہ تھی بلکہ اشرافیہ اور سرکار دربار تک بھی عوامی رابطے کا بہتر ذریعہ بن چکی تھی چناں چہ جونز کے کلاسیکی زبانوں والے خیال کی نسبت گل کرسٹ کا ورنیکلر زبان کی مدد سے عوام تک رسائی کا تصور کام یابی سے زیادہ ہمکنار ہوا۔ مستشرقین اور کمپنی کے حکمران مقتدرہ کو اس بات کی سمجھ آ چکی تھی کہ ہندوستانیات (Indology) کسی اور عامل کا نہیں بلکہ صرف زبان کا نام ہے اور اگر اس عوامی زبان پر قدرت حاصل کر لی جائے تو اس کا مطلب ہو گا کہ ہندوستان ہاتھ میں آ گیا ہے۔ ولیم جونز کے نقطۂ نظر کی عملی صورت تحریری کلاسیکی متن کی صورت میں موجود تھی جب کہ گل کرسٹ کا ہندوستانی فرد کتابی متن سے جدا ایک الگ عملی سچائی تھا جس کا مطالعہ زیادہ ضروری تھا۔ اس نے ہندوستانی زبان کو جارگن، اور درباری زبان کے روپ کے طور پر پیش کیا۔ جارگن اس زبان کا روپ تھا جو عوامی بول چال کی زبان تھی اور جسے 'مورس' کے (Improper) نام سے مشہور کر دیا تھا جب کہ درباری زبان اردو زبان کا وہ روپ تھا جو سلجھی وشستہ زبان کے طور پر فارسی کی جگہ اشرافیہ اور درباری طبقے کے لیے بول چال کے طور پر رائج ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیّر ولیم جونز اور جان گل کرسٹ کے لسانی تصور کا تقابل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ولیم جونز اور گل کرسٹ ہندوستان کا لسانی تصور کرنے میں متفق تھے۔ دونوں نو آبادیاتی صورت حال میں زبان کے نہایت اہم کردار کا پختہ یقین رکھتے تھے اور اس کردار کے خط و خال اور اہمیت واضح کرنے میں بنیاد گزار بننے کے لیے سرگرم اور کام یاب رہے۔۔۔ ولیم جونز کے لیے ہندوستانی ''کلاسیکی زبان'' اور گل کرسٹ کے لیے یہ ''ورنیکلر زبان'' تھا۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ ہندوستان کے یہ دونوں لسانی تصورات ۱۷۸۰ء کی دہائی میں وضع ہو رہے تھے۔۔۔ (مگر) حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کا وہ لسانی تصور اس کی کلاسیکی اور ورنیکلر زبانوں سے ہی مکمل ہوتا تھا جسے برطانوی ذہن نے نو آبادیاتی ثقافتی منصوبے کے نہایت اہم حصے کے طور پر قائم کیا تھا۔ اس اعتبار سے ولیم جونز اور گل کرسٹ ایک ہی ثقافتی پراجیکٹ کی تکمیل کے لیے دو یکساں اہمیت کے

حامل محاذوں پر سرگرم تھے۔ (۸)

گل کرسٹ نے اردو زبان کو تین درجوں میں تقسیم کیا۔ پہلا درجہ زبان کا شستہ اور پرتکلف روپ تھا جو درباری اسلوب تو ہو سکتا تھا لیکن عوامی نہیں۔ اس روپ کو اختیار کرنا انگریزوں کے لیے فائدہ مند نہ تھا۔ اس درجے کو گل کرسٹ نے عدالتی زبان کے طور پر تیار اور تجویز کیا۔ اس کے لیے مرزا رفیع سودا کی غزلیں بہ طور نمونہ اپنی کتب میں درج کیں۔ دوسرا نمونہ عوامی زبان تھی جس کی مثال کے لیے انھوں نے مسکین کے مرثیوں میں برتی گئی عام فہم زبان کے اسلوب کو سامنے رکھا۔ اس زبان کا تیسرا روپ وہ روپ تھا جس میں مقامی غیر مستند محاورہ اور لب و لہجہ غالب تھا۔ اس کو انھوں نے vulgar زبان سے ظاہر کیا تھا۔ یہ زبان ہندی زبان کہلاتی تھی۔ برنارڈ ایس کوہن نے اپنی ایک کتاب Colonialism an its forms of knowledge میں جو ۱۹۹۶ء میں پرنسٹن یونی ورسٹی سے شائع ہوئی، مستشرقین کے مختلف ہندوستانی زبانوں کے لیے کام اور ان کے مقاصد پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ اس میں اس نے سنسکرت، بنگالی، فارسی، عربی زبان کی اہمیت اور ان پر مرتب کیے گئے لغات وقواعد پر روشنی ڈالنے کے بعد اردو زبان پر بھی اپنا خاص نقطۂ نظر پیش کیا ہے جس کو Hindustani as "Language of command" کے طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ گل کرسٹ ہندوستانی زبان کے متون کی تیاری اور اس کی اہمیت کو ثابت کر کے دراصل ایک ایسی زبان کی تشکیل کا منصوبہ مکمل کر رہا تھا جسے مستقبل کے لیے حکمرانوں کی (سرکاری) زبان کی اتھارٹی بننا تھا۔ اس نظریے کو وہ مذکورہ کتاب کے باب نمبر ۲ میں بیان کرتا ہے جس کا عنوان ہے "Command of Language and Language of command"۔ کوہن کا خیال ہے کہ ہندوستانی زبان کو گل کرسٹ اپنی شبانہ روز کی کاوشوں سے "Command of Language" کی اتھارٹی بنانا چاہتے تھے جسے انگریزوں کی حکومت میں اہم مقام حاصل ہونے والا تھا۔

سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں ہندوستان کے ساحلی علاقوں میں انگریزوں کو مراٹھی، فارسی اور 'مورس'، زبانوں کی اہمیت کا ادراک ہوا تو ان کی طرف توجہ دی جانی ضروری

نیال کی گئی۔ جان گل کرسٹ کا اپنے پیش رو مستشرقین میں امتیاز یہ تھا کہ ان لوگوں نے ہندوستانی زبان کو محض جارگن، مورس، Vulgar زبان کے طور پر دیکھ کر اس توجہ سے اس کی قواعد ولغات پر اتنی توجہ نہ دی تھی، جب کہ گل کرسٹ نے اسے ان ناموں کی بجائے "ہندوستانی" کا نام دے کر اس پر کام کیا تو اس زبان کی نئی اتھارٹی بنانے میں کام یاب ہو گئے۔ کوہن کے پیش کیے گئے تھیسز سے اخذ کیا جا سکتا ہے کہ گل کرسٹ نے اردو زبان کی تین سطحیں دریافت کیں جن میں پہلی سطح وہ ہندوستانی زبان تھی جو عدالتی امور کی انجام دہی میں استعمال ہو رہی تھی جو مقامی کلاسیکی شعرا کی تخلیقات میں ملتی تھی اور اس پر فارسی کا غلبہ تھا، دوسری سطح جسے گل کرسٹ درمیانی "جینوئن" سطح سے تعبیر کرتے ہیں، جب کہ تیسری سطح عوامی بگڑے ہوئے لہجے کی حامل تھی جسے "Vulgar" ہندوی کہا جا سکتا تھا۔ یہ سطح ان سے پہلے کے مستشرقین کے پیش نظر رہی تھی جس کی وجہ سے وہ لوگ مغالطے کا شکار ہو کر ہندوستانی زبان کی اہمیت کو مکمل طور پر سمجھنے سے قاصر رہے۔ کوہن لکھتا ہے:

The court or persian style found in the elevated poems of Sauda, Vali, Mir Dard and other poets. This is the "pompours and pedantic language of literature and politics", wrote Gilchrist and it draws heavily on Arabic and Persian. The second level of Hindostanee is what Gilchrist wanted to establish as the standard language, and it can be found in the elegy of "Miskeen, the satires of Sauda, and the translation of the articles of war. The third level of the vulgar is evidenced, Gilchrist wrote", Mr. Forster's translation of the Regulations of Government, in the greatest part of Hindoostanee compositions written in the Nagree character, in the dialect of the lower order servants and Hindoos, as

well as among the peasantry of Hindoostan.(9)

مندرجہ بالا طویل اقتباس نہ صرف اردو زبان کے بارے میں دی جانے اہم سطحوں کی مدد سے اس زبان کی اہمیت کو سمجھنے میں معاونت کرتا ہے بلکہ اس کی مدد سے گل کرسٹ کی ذات پر نقادوں کے کیے جانے والے ان اعتراضات کا بھی جواب ملتا ہے جن کا ذکر اس بات میں کیا گیا ہے، کہ گل کرسٹ نے ایک سازش کے تحت ہندوستانی اردو اور ہندی کے ناموں سے ہندوستان کی اہم زبانوں کو دو شاخوں میں تقسیم کر کے نہ صرف لسانی وحدت کو نقصان پہنچایا تھا بلکہ اس کی وجہ سے ملکی وحدت بھی متاثر ہوئی تھی۔ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ گل کرسٹ کا اردو زبان کی تین سطحوں پر اسالیب میں تقسیم کرنا دراصل نو آبادیاتی حکمرانی کے مقاصد کے تحت زبان کا انتخاب کرنا تھا نہ کہ زبانوں کو گھٹیا اور عمدہ درجوں میں تقسیم کر کے ہندوستانیوں کو فرقوں میں ڈالنا تھا جسے گل کرسٹ کے نقاد سمجھنے سے قاصر رہے۔ گل کرسٹ نے اپنی پہلی کتاب ''انگریزی ہندوستانی ڈکشنری'' اور دوسری بڑی کتاب ''ہندوستانی زبان کی قواعد'' میں زبان کو مذکورہ سطحیں نہ صرف دکھائی ہیں بلکہ قواعد و لغات میں مسکین کے مرثیے اور سودا کی پر شکوہ زبان کے نمونے شعروں کی صورت میں شامل کیے گئے تھے۔ سودا و مسکین کی شاعری کو اس طور پر شامل کرنے سے گل کرسٹ کا مدعا یہی تھا کہ کلاسیکی استاد شاعر سودا کی زبان اردو زبان کا خاص علمی روپ ہے جس کو حکمران سمجھیں سیکھیں ضرور لیکن یہ روپ خاص اشرافیہ کے زیر استعمال تو ہوسکتا ہے، عوام کے زیر استعمال نہیں۔ عوامی زبان وہی ہے جو مسکین کے مرثیوں میں ملتی ہے جسے اہمیت دی جانی ضروری ہے۔ زبان کا یہ روپ کوہن کے "Language of command" کے ماڈل پر پورا اترتا ہے۔

مرزا سودا اور مسکین کی شعری مثالوں کو اپنے قواعد و لغت میں کثرت سے استعمال کرنے کی وجہ یہی تھی کہ زبان کی ان منتخب صورتوں سے اس کی کتابوں کے قاری بہ خوبی روشناس ہو جائیں۔ ذیل میں ان شعرا کی چند مثالیں درج کی جاتی ہیں۔ قواعد کے دوسرے باب میں جو Article کے مباحث سے متعلق ہے اس میں بھی مثالوں کے لیے سودا کے یہ اشعار کتاب کا حصہ ہیں:

جیون غنچہ تو چمن میں بند قبا جو کھولے
پھر گل سے اے پیارے بلبل کبھو نہ بولے

آوے گا وہ چمن میں تڑکے ہی سے کشی کو
شبنم سے کہہ دے بلبل پیالے گلوں کے دھولے
باغ جہان میں آ کر کچھ ہم نے پھل نہ پایا
اک دل ملا کہ جس میں ہیں سیکڑوں ملولے

(ہندوستانی گریمر ص ۵)

اب کچھ اشعار قدیم املا کے مطابق، تا کہ قارئین کو اُس دور کی املا سے کچھ واقفیت ہو سکے۔

اب خدا حافظ ہي سودا کا مجھی آتا ہي رحم
ایک تو بستا ہي دیوان تس پہ آتی ہے بہار
سالہا ہم نی نالۂ شب گیر کیا
آہ ایک روز تیری دل میں نہ تاثیر کیا

گل کرسٹ نے اپنی کتاب کے سرورق پہ سودا کے درج ذیل اشعار درج کر کے انھیں یوں خراج تحسین پیش کیا:

اب سامنے میرے جو کوئی پیرو جواں ہے
دعویٰ نکرے یہ کہ مرے منہ میں زباں ہے
میں حضرتِ سودا کو سنا بولتے یارو
اللہ ہی اللہ کہ کیا نظم و بیاں ہے

ہندوستانی گریمر میں پیش کیے گئے مسکین کے مرثیے کے چند اجزا برائے مطالعہ تحریر کیے جاتے ہیں (مسکین کے مرثیے کی املا کو جدید املائی روپ میں تحریر کیا جا رہا ہے)

باندھے ہوئے بچوں سے یہ سن کر آہ و زاری
حارث لعین کی عورت بہتیرا اروپکاری

عورت کے سر میں پہلے شمشیر وِس نے ماری
پھر اپنا مار ڈالا بیٹا کنوارا بالا

(ہندوستانی گریمر ص ۴۵)

جس دم فرات اوپر پہونچا بڑا وہ خونخوار
اپنے غلام کے ہاتھ دی اپنی ننگی تلوار
کہنے لگا کہ میں کیا چھوٹوں اوپر کروں وار
تو ان بچوں کا سرکاٹ اے نوجواں لالا

(ہندوستانی گریمر ص ۴۶)

حارث لعین جو چونکا یعنی یہ شور کیا ہے
ہمسایوں کے گھر میں کوئی چور کیا پڑا ہے
دیا جلا کے ڈھونڈا، کوئی اپنے گھر گھسا ہے
آخر بچوں کو پکڑا حجرے ستی نکالا

(ہندوستانی گریمر ص ۶۰)

وہ پانی بھرنے والی سن کر کے دکھ اونہوں کا
کہنے لگی تمہارے بابا کا نام کیا تھا
رو کر کہا بچوں نے مسلم تھا نام وِس کا
کس کس محبتوں سے تھا ہم کو اوس نے پالا[۱۰]

یہ اعتراض کہ گل کرسٹ نے فورٹ ولیم کالج میں ''پریم ساگر'' نامی کتاب سے دیوناگری رسم الخط کی حوصلہ افزائی کی، اس مفروضے کو اس طور پر سمجھا جانا ضروری ہے کہ انھوں نے اردو زبان کا تیسرا روپ Vulgar /مورس/ جارگن کی صورت میں محفوظ کر کے انگریزوں کو یہ بتانا ضروری سمجھا تھا کہ اس روپ کو اختیار کرنے میں خاص احتیاط کا مظاہرہ کریں۔ گل کرسٹ زبان کا عمدہ روپ منتخب کر کے اسے حکمران اشرافیہ کے شایان شان بنانے میں کوشاں تھے جس سے بلاواسطہ اردو زبان کی خدمت ہو رہی تھی اور اس کا ایک خوب صورت روپ تیار

اس ضمن کی گل کرسٹ کی بہترین لسانی خدمت تاریخ کا حصہ ہو رہا تھا جو آج تک موجود ہے۔ ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے جو گل کرسٹ کے بنتی ہے جس کی اہمیت اپنی جگہ مسلمہ ہے۔ عام طور پر اردو زبان وادب کے علما میں ایک طبقہ ایسا موجود سر الزام کی صورت موجود ہے۔ ہے جو جان گل کرسٹ کی فورٹ ولیم کالج کے دور میں تصنیف و تالیف میں ایک بات سے ان سے خوش نہیں ہے۔ یہ بات یوں ہے کہ کہ گل کرسٹ نے کسی شرارت یا سازش کے تحت کالج میں ادیبوں کے دو طبقے بنائے تھے جن سے اردو کے ساتھ ساتھ ہندی رسم الخط (ناگری) میں بھی کتب لکھوائیں۔ عام طور پر للولال کوی کی کتاب ''پریم ساگر'' کے بارے میں خیال ہے کہ اس کتاب کی اشاعت سے فورٹ ولیم کالج میں ہندوستانی زبان دو دھاروں میں بٹ گئی تھی۔ ایک دھارا اردو بن گیا جب کہ دوسرا ہندی کی صورت میں الگ ہو گیا تھا۔ گل کرسٹ کا اس ضمن میں کردار یہ تھا کہ انھوں نے للولال کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے زبان کے دو ٹکڑے کرائے جن سے قومی وحدت دو ٹکڑے بن گئی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ للولال کوی نے پریم ساگر نامی کتاب میں بھگوت گیتا کے ایک حصے کا دیوناگری رسم الخط میں ترجمہ کیا تھا اور یہ کتاب کالج کے اشاعتی منصوبوں کا حصہ تھی لیکن یہ الزام گل کرسٹ کے سر لگانا یوں ٹھیک نہیں ہے کہ دیوناگری رسم الخط نیا نہیں تھا۔ گل کرسٹ کی آمد سے کئی سو سال قبل اس خط میں ہندوی تحریریں ملتی ہیں جن کی موجودگی بتاتی ہے کہ یہ ہندی دیوناگری خط سے زبان کو دو فرقوں میں تقسیم کرنے میں ان کا کوئی منفی و سازشی منصوبہ نہ تھا۔ گل کرسٹ کے نقطۂ نظر ملاحظہ ہو جو انھوں نے اپنی انگریزی ہندوستانی ڈکشنری کے دیباچے میں لکھا ہے۔ گیان چند جین گل کرسٹ کے جملوں کا ترجمہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''گل کرسٹ نے کہا ہے کہ ہندوستانی کے تین اسلوب میں پہلا جسے فارسی اسلوب کا اہم نمونہ کہہ سکتے ہیں اور جو سودا، میر، درد وغیرہ کے کلام میں یا پر تکلف ادبی یا سیاسی تحریروں میں ملتا ہے۔ دوسرا درمیانی اسلوب جو مسکین کے مرثیے، سودا کی ہجویات اور اچھے پڑھے لکھے منشیوں کی گفتگو میں ملتا ہے۔ تیسرا ہندوی اسلوب جو ناگری میں لکھے مضامین میں اور نچلی سطح کے ملازموں،

ہندوؤں اور کسانوں وغیرہ کی گفتگو میں دکھائی دیتا ہے۔ یعنی گل کرسٹ نے مسلمانوں کی تحریروں اور تکلمی اردو کو دو اسالیب قرار دیا اور ہندی میں لکھی تحریروں کو Vulgar اسلوب کہا ہے۔''(۱۱)

گل کرسٹ نے اپنے عہد سے لے کر بیسویں صدی تک کے قواعد و لغت نویسوں کو نہ صرف متاثر کیا ہے بلکہ اس میدان میں ان کو ایک سائنسی منہاج بھی عطا کی ہے جس کی مدد سے اردو قواعد اور لغت کی روایت مستحکم بنیادوں پر ارتقائی منازل طے کر رہی ہے۔ گل کرسٹ کی تمام لسانی کاوشوں کا مرکز و محور ''اردو زبان تھی'' جس میں کارہائے نمایاں انجام دیتے ہوئے انھوں نے متنوع اقسام کی کتب تحریر کیں۔ جان گل کرسٹ کی لسانی میدان میں بڑی کاوش یہ ہے کہ ان سے قبل اردو لسانیات کے میدان میں چند ایک کتب ہی موجود تھیں لیکن اس اکیلے اسکالر نے اردو لسانیات کو بیس سے زائد کتب کا سرمایہ دیا ہے جو ان کی عظمت کی دلیل ہے۔

گل کرسٹ کی اردو زبان و ادب کے میدان میں خدمات میں جائزہ لیتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ وہ واحد اسکالر تھا جس نے آ کر اردو کو بہ طور ایک بڑی زبان کے پہچانا اور اس کے اندر موجود امکانات کا ادراک کیا۔ انھوں نے اس زبان کو مورس کہنا ناپسند کیا، جارگن کے طور پر اس کو ماننے میں تامل کیا، اس کو علاقائی یا قصباتی زبان بھی نہ سمجھا بلکہ اس کو رابطے کی زبان کے طور پر دیکھ کر ''ہندوستانی'' نام دینے کی سفارش کی اور یہ نام آئندہ اس زبان کے ساتھ جڑ گیا۔ ان کے بعد کے مستشرقین نے اردو زبان کے اس ''ہندوستانی'' نام کے تحت ہی اپنی کتب تحریر و تالیف کیں۔ اردو زبان کو یہ مقام و مرتبہ اس زبان کے ان باشندوں کو بھی دینے کا خیال نہ آیا تھا جن کی یہ زبان ماں بولی کہلاتی تھی۔ اس نے اس زبان کو سیکھنے کے لیے انوکھا طریقہ اختیار کیا جس سے ان سے پہلے کے مستشرقین محروم رہے۔ عوام میں گھل مل کر، ان جیسا حلیہ بنا کر ان میں رہ کر زبان کے استعمال کی ہر سطح کا مشاہدہ کرنا ایک بڑی لسانی خدمت ہے۔ جتنا کام اکیلے گل کرسٹ نے مشکل حالات میں کیا، یہ کام اگر اردو زبان کا حامل کوئی مقامی فرد یا دیسی ادیب انجام دیتا تو بھی بڑی بات ہوتی لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ایسا

فرد جو ہندوستان کا مقامی باشندہ بھی نہ تھا، پیشے کے اعتبار سے بھی زبان و ادب کا بندہ نہ تھا۔ یہ بات بڑی حیرانی میں مبتلا کر دیتی ہے کہ انھوں نے اکیلے یہ کام کیوں کر انجام دیا۔ ذیل میں ایک اقتباس میں گل کرسٹ کے ان جذبات کا نمونہ پیش کیا ہے جو وہ اردو زبان کے بارے میں رکھتے تھے اور مقامی افراد کی اس زبان کو مناسب عزت نہ دیے جانے پر ناخوش تھے جس سے ان کے خلوص کا اندازہ ہوگا۔ یہ جملے انھوں نے ''نقلیات'' کے اختتامیہ کے لیے لکھے گئے اپنے تاثرات میں درج کیے تھے۔ گل کرسٹ لکھتے ہیں:

''جہاں تک ہندوستانی زبان کا تعلق ہے، میرے دعوے کے صحیح ہونے کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جن لوگوں کو اپنے سرکاری منصب کے لحاظ سے اس عام زبان میں ماہر ہونا چاہیے تھا وہ سب الا ماشاء اللہ اس سے قطعاً ناواقف ہیں۔۔۔ میں پورے اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر ایک منشی ایسا ہے جو قواعد کے اصولوں کے مطابق ہندوستانی زبان سکھانے کا اہل اور خواہش مند ہے تو ننانوے منشی ایسے ہیں جو ہمیں فارسی اور عربی پڑھانا چاہتے ہیں۔ جس زبان کو ہندوستان کی عام زبان کہنا چاہیے اس کے پھیلانے کے سلسلے میں بہت سی رکاوٹیں ہیں جو برابر بڑھتی جا رہی ہیں۔ ان رکاوٹوں کو دور کرنے اور ان کا مقابلہ کرنے کے لیے میں نے یہ مجموعہ مرتب کیا ہے اور مجھے توقع ہے کہ میری یہ کوشش [نقلیات] بارآور ثابت ہوگی۔''(۱۲)

مختصر یہ کہ اردو زبان اور اردو نثر کی تعمیر و ترقی کے ضمن میں گل کرسٹ کی عملی مساعی کی نہ صرف تاریخی حیثیت ہے بلکہ اردو زبان و ادب کی تاریخ کا نمایاں باب ہے۔ اردو زبان کی ترقی کی رفتار تیز کرنے میں جان گل کرسٹ کی کاوشوں کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

حوالہ جات وحواشی:

1. Gilichrist, John, (qouted in) Colonialism and its forms of Knowledg
by Bernard S. Cohn, Princeton University Press, new jersy, 1996
P.34

سمیع اللہ، ڈاکٹر، فورٹ ولیم کالج... ایک مطالعہ فیض آباد، نشاط آفسٹ پریس، ٹانڈہ، ۱۹۸۹ء)ص ۳

عتیق صدیقی، گل کرسٹ اور اس کا عہد (علی گڑھ، انجمن ترقی اردو، (ہند) ۱۹۶۰ء) ص ۳۹

ایضاً۔ص ۱۱۱۔۱۱۰

5. Gilchrist, John, The Oriental Linguist— Ferris Post Press
Calcutta, 1802, 2nd Edition , P.1

گل کرسٹ اور اس کا عہد، ص ۳۰۔۲۹

سید محمد، مولوی، ارباب نثر اردو (حیدر آباد دکن، مکتبہ ابراہیمیہ، طبع دوم، ۱۹۳۷ء) ص ۱۹

ناصر عباس نیر، مابعد نو آبادیات، اردو کے تناظر میں (کراچی، آکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۱۳ء) ص ۲۳۔۱۲۲

9. Cohn,Bernard S.,Colonialism and its forms of knowledge.P.36

10. Gilchrist,John, A Grammar of the Hindoostanee Language (
System of Hindoostanee PhilologyChronicle Press Calcutta,1796

گیان چند جین، ایک بھاشا، دو لکھاوٹ، دو ادب، (دہلی نمبر ۶، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،

(انڈیا) (۲۰۰۵ء) ص ۱۲۶-۶۷

۱۲۔ گل کرسٹ، جان، مشمولہ نقلیات، از میر علی حسینی، ترتیب و حواشی پروفیسر وقار عظیم (لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۶ء، طبع دوم) ص ۳۶-۳۷

2.9

جان گل کرسٹ اور مولوی عبدالحق کے ہاں قواعدی مماثلتیں

اُردو قواعد نویسی کے ضمن میں یہ امر اہمیت اور دل چسپی کا حامل ہے کہ اس کے بنیاد گزاروں میں کسی مشرقی ماہر زبان یا لسانیات کی بجائے غیر ملکی افراد اور مستشرقین کے نام زیادہ نمایاں ہیں۔ مختلف علاقوں میں مختلف ناموں یا شناختوں سے پہچانی والی موجودہ اردو زبان سترھویں صدی تک محض عوامی بول چال کی زبان سے زیادہ اہمیت اختیار نہ کر پائی تھی۔ طبقۂ خواص، علم و ادب اور سرکاری دربار کی زبان فارسی ہونے کی وجہ سے لسانی منظر نامے پر اردو کو کسی خاص مرتبے کی حامل زبان نہیں گردانا جاتا تھا۔ اٹھارھویں صدی کے طلوع سے البتہ یہ ملک بھر کی رابطے کی زبان (Lingua Franka) کے درجے سے ترقی کرتے کرتے شمالی ہند میں ریختہ گوئی کی زبان بنی۔ (علم و ادب (محض شاعری) سے راستہ پاتے ہوئے یہ زبان اشرافیہ تک پہنچی اور معتبر حیثیت اختیار کر گئی۔ عوامی بول چال کی زبان ہونے اور ثانیاً عوامی زبان (vernacular) ہونے کے باعث ہندوستانی ماہرین زبان کو اس زبان کی قواعد مرتب

کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی جو ایسٹ انڈیا کمپنیوں کی صورت میں یہاں موجود تھے۔ چناں چہ اردو کی پہلی قواعد ۱۹۶۸ء میں جون جوشوا کیٹلر (۱۷۱۸ء-۱۹۵۹) نے مرتب کی جو کہ جرمن سپیکنگ پولینڈ کا باشندہ تھا۔ کیٹلر نے تجارتی مقاصد کے لیے ضروری مواد کو ترتیب کر کے یہ پہلی قواعد Gramnatica Indostanica کے عنوان سے معروف ہوئی۔ یہ لغت جرمن زبان میں مرتب ہوئی تھی جو بعد میں لاطینی اور پھر انگریزی میں ترجمہ ہوئی۔ اس قواعد کا اصل عنوان یہ ہے:

> Instructie ofte Onderwijsinghe Der Hindoustaanse en Persianse talen naven hare declinate enconjugatie, als mede hollandse maat en gewigten mitsgaders beduigdingh vergeleykinge, der Hindoustanse med de eeniger moorse namen etc. DOOR Joan Josua Ketelaar 1668.(1)

دوسری اردو قواعد بنجمن شلز (Benjamin Schultze) نے ہندوستان کے شہر سورت میں مرتب کی جو ۱۷۴۵ء میں جرمنی کے شہر ''ہالے'' سے Gramatica Indostanica کے عنوان سے شائع ہوئی۔(۲) اس کے بعد جارج ہیڈلے کی گریمر خاص اہمیت اختیار کر گئی۔ ہیڈلے پہلا انگریز ماہر زبان تھا جس نے اردو زبان پر اہم قواعد بعنوان Grammatical Remarks on Indostan Language مرتب کی۔ یہ قواعد ۱۷۷۲ء میں لندن سے شائع ہوئی۔ یہ گریمر اردو قواعد نویسی کے میدان میں اس طور پر اہم ہے کہ جان گل کرسٹ کی اردو قواعد سے قبل یہ قواعد خاصی مشہور تھی اور اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے تھے۔(۳) اس کے بعد اہم قواعد نویس جان گل کرسٹ کا ذکر آتا ہے جس کی قواعد نویسی پر تحقیق اس مقالے کی بنیادی موضوع ہے۔

مولوی عبدالحق نے اردو کے کلاسیکی سرمائے کی ترتیب و تدوین اور قواعد کے میدان میں کارہائے نمایاں سرانجام دیے جس کی بدولت اردو زبان و قواعد کی ذیل میں ان کے تحقیقی و تنقیدی کام کو بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ان کی کتاب ''قواعدِ اردو'' ۱۹۱۴ء میں

منظر عام پر آئی اور نہایت اہم قواعدی کتاب کے طور پر لسانی منظر نامے میں محفوظ ہوگئی۔ یہ کتاب ۱۹۴۱ء میں الناظر پریس لکھنؤ (انڈیا) سے شائع ہوئی جس کے متعدد ایڈیشن ۱۹۵۸ء تک مختلف ترمیم و اضافے کے ساتھ شائع ہوئے۔ آخری ایڈیشن (۱۹۵۸ء) کے بعد کتاب کی جو شکل تیار ہوئی وہ تاحال اشاعتی عمل سے گزر رہی ہے۔ مذکورہ قواعد سے قبل مولوی اسماعیل میرٹھی کی مختصر مگر جامع قواعدِ اردو نہ صرف چھپ چکی تھی بلکہ اس کے متعدد ایڈیشن زیور طبع سے آراستہ ہوئے جس سے اس کی اہمیت وضرورت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مولوی اسماعیل میرٹھی نے اپنی قواعد کو اجزائے کلام کی بنیاد پر مرتب کرنے کی راہ اپنائی جو اردو قواعد کی منہاج میں اضافہ ثابت ہوئی۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ جان گل کرسٹ نے ۱۷۹۶ء میں اردو قواعد کو اجزائے کلام کی بنیاد پر مرتب کیا تھا۔ اس منہاج کو آگے چل کر بابو کاہن سنگھ (قواعدِ اڑدو) اور مولوی اسماعیل میرٹھی (قواعد اردو) میں اپنی قواعد کی بنیاد بنایا۔ دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ جان گل کرسٹ اجزائے کلام کی بنیاد پر قواعد لکھنے کے محرک ثابت ہوئے جس کو مذکورہ بالا ہندوستانی ماہرین زبان نے اپنایا۔ اسی روایت کی پاسداری میں ہم دیکھتے ہیں کہ مولوی عبدالحق نے ۱۹۱۴ء میں ''قواعدِ اردو'' کی منہاج کو اجزائے کلام کی بنیاد پر مرتب کیا۔ اس کتاب کی اہمیت اور افادیت اس طور پر بھی مسلمہ ہے کہ مولوی عبدالحق نے اردو قواعد لکھے جانے کے مروجہ ہندوستانی طریقے سے ہٹ کر اس کو اجزائے کلام کی بنیاد پر مرتب کیا۔ موجودہ بحث میں یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی ہے کہ تاریخ کے اوراق میں یہ بات محفوظ کی جائے کہ جس قواعدی منہاج کو مولوی عبدالحق کی اوّلیت سمجھا جاتا ہے، وہ قواعدی ماڈل ان سے قبل مولوی اسماعیل میرٹھی اور بابو کاہن سنگھ اپنی قواعدوں میں بروئے کار لا چکے تھے۔ اس قواعدی ماڈل کو سب سے پہلے جان گل کرسٹ نے اپنی اردو قواعد ''ہندوستانی گریمر'' میں اپنایا جو اپنی نوعیت کا منفرد تجربہ تھا۔ اجزائے کلام کی بنیاد پر تیار کیا گیا ماڈل ایک عرصے تک اردو دان طبقے سے اس لیے بھی اوجھل رہا کہ یہ قواعد انگریزی زبان میں تھی۔ انگریزی میڈیم ہونے کی وجہ سے اس طرف زیادہ توجہ نہ دی جا سکی، دوسرا کتاب کی عدم دستیابی بھی ایک وجہ بنی، جس کی وجہ سے یہ بات محسوس نہ کی جا سکی کہ کلمے کی تین درجی تقسیم

(اسم، فعل، حرف) کی بجائے اجزائے کلام کی بنیاد پر اردو قواعدی منہاج کا استعمال سب سے
پہلے گل کرسٹ نے کیا تھا۔ مولوی عبدالحق کی قواعد میں اس طرف توجہ نہ دی جا سکی کہ قواعد
ماڈل کو اجزائے کلام کی بنیاد پر مرتب کرنے کی روایت پیش کر دی جاتی، چناں چہ یہ امر اس
مقالے کی بدولت پیش کیا جاتا ہے کہ اجزائے کلام کی بنیاد پر سب سے پہلی قواعد گل کرسٹ
نے مرتب کی تھی، جس کے بعد بابو کاہن سنگھ، اسماعیل میرٹھی اور مولوی عبدالحق نے اس کو بنیاد
بنا کر لکھا۔ ذیل میں مولوی عبدالحق کی قواعد اور جان گل کرسٹ کی قواعد کا تقابلی/موازنہ کر کے
اس موضوع کے لیے مثالوں کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

قواعدِ اردو کا مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس کتاب کے پہلے ایڈیشن میں
اور آخری ۱۹۵۸ء والے ایڈیشن کی فہرستِ مشمولات میں فرق موجود ہے۔ پہلے ایڈیشن
میں جو کہ الناظر پریس لکھنؤ سے ۱۹۱۴ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کی فہرست مشمولات یوں
ہے۔ کتاب میں پہلے بائیس صفحات مقدمہ پر مشتمل ہیں، جس میں اردو زبان کے آغاز،
تشکیل، ابتدا، وجہ تسمیہ، اور اس پر مسلم قوم کے مختلف عہد میں پیدا ہونے والے اثرات
پر مبسوط بحث شامل ہے۔ آگے چل کر انگریز اور دوسری مغربی اقوام کے ہندوستان آمد، اردو
کی قواعد و لغت نویسی کے میدان میں ان کی کاوشوں پر تفصیلی بحث شامل ہے جو اپنی جگہ
خاص اہمیت کی حامل ہے۔

اس مقدمے میں الفاظ کی تقسیم کو تین بڑے اجزا میں تقسیم کر کے نشان دہی فہرست میں
ہی کر دی گئی تھی کہ قواعد کو تین بڑے درجوں ہجا، صرف اور نحو میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ پہلے
ایڈیشن کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ قواعد محض ''صرف و نحو'' کے مشمولات اور مباحث
کے گرد گھومتی تھی۔ کتاب کو چار فصلوں میں تقسیم کیا گیا تھا جس میں فصل اوّل، ہجا کے عنوان
سے تھی۔ اردو حروف تہجی اور ان سے متعلق جملہ تفصیلات کا جائزہ لے کر دراصل تمام بنیادی
آوازوں، حروف، علامتوں اور حروف کی دوسری زبانوں سے اردو میں مراجعت وغیرہ کا بیان
اس کا حصہ بنایا گیا تھا۔ فصل دوم بعنوان ''صرف'' کتاب کا حصہ تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ فصل
اوّل میں حروف اور لفظ بننے تک کے قاعدے اور مباحث کا براہِ راست تعلق صرف کے

مباحث کے ساتھ جڑتا ہے جس کو ماہرانہ انداز سی حصہ صرف سے پہلے شامل کیا گیا ہے۔ اسی انداز سے فصل سوم نحو کی بجائے مشتق اور مرکب الفاظ کے عنوان سے کتاب کا حصہ بنی۔ یہ ایک ارتقائی صورت ہے کہ فصل اوّل میں حروف تہجی، املا کی مختلف صورتوں سے قواعدی بحث شروع ہو اور صرف کے اصولوں کا جائزہ لیتے ہوئے فصل سوم میں عملی طور پر لفظ کے اشتقاق، تصریف اور ترکیب کے قاعدوں کو بہ طور مثال سامنے رکھا جائے۔ اس طرح اندازہ ہوتا ہے کہ کتاب کی پہلی تین فصلیں حرف سے لفظ تک کی تشکیلی صورتوں اور ان پر لاگو ہونے والے علم صرف کے مشمولات کی ہر ممکنہ پیش کش کے طور پر قواعدِ اردو کا حصہ ہیں۔ فصل چہارم میں علمِ نحو کے مباحث پر تفصیلی بحث شامل ہے جس میں نحو تفصیلی کے تحت جنس، تعداد، حالت، صفت اور صفت عددی وغیرہ مختلف زمانوں کا بیان، مضارع، امر، مستقبل، حال، ماضی اور اس کی مختلف صورتیں، حروف اور حروف ربط کی مختلف صورتیں، تکرار الفاظ شامل ہے۔

اس کے دوسرے حصے نحو ترکیبی میں مفرد جملے، مبتدا، خبر، مطابقت اور آگے چل کر مرکب جملوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ جملہ اسمیہ، جملہ وصفیہ، جملہ تمیزیہ وغیرہ اور آخر میں جملے میں الفاظ کی ترکیب کے عنوان سے قواعدی بحث شامل ہے۔ یہ کتاب ۲۷۱ صفحات پر مشتمل تھی۔ پہلے ایڈیشن کی فہرستِ مشمولات کا موازنہ اگر اس کے آخری ایڈیشن (۱۹۵۸ء) اے سے کریں، جو تاحال شائع ہو رہا ہے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس ایڈیشن میں تو فصلوں کے عنوانات پہلے ایڈیشن کی طرح ہی ہیں، البتہ ذیلی عنوانات جزوی سطح پر تبدیل کیے گئے ہیں۔ لیکن مجموعی طور پر اس کی فصل اوّل، ہجا، فصل دوم صرف، فصل سوم مشتق اور مرکب الفاظ اور فصل چہارم نحو کے عنوان سے کتاب کا اسی طرح حصہ ہے جیسا پہلے ایڈیشن میں تھا۔ فصل چہارم کے بعد جو تبدیلی ملتی ہے اس کے مطابق عروض، تقطیع، بحور اور رموز اوقاف کو مختلف مثالوں کے ساتھ قواعد کا حصہ بنایا گیا ہے۔ یہ مندرجات اوّلین ایڈیشن (۱۹۱۴ء) میں شامل نہیں۔ (۴)

جان گل کرسٹ کی ''ہندوستانی گریمر'' کا جائزہ لیں تو پتا چلتا ہے کہ انھوں نے اپنی قواعد کو تین بڑے حصوں، ہجا، صرف اور نحو میں تقسیم نہیں کیا۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ اس قواعد

کے آنے سے پہلے قواعد کو ''صرف ونحو'' بھی لکھا جاتا تھا۔ قواعد محض صرف ونحو تک محدود نہ ہو جائے، اس وجہ سے انھوں نے صرف ونحو کی قید سے قواعد کو الگ کیا۔ دوسرا پہلو یہ بھی کہ کہ گل کرسٹ کے پیش نظر ان اضافی معلومات اور مباحث کو بھی قواعد کا حصہ بنانا تھا، جو براہِ راست قواعدی کتاب کی ذیل میں نہیں آتے۔ اب اگر قواعد صرف ونحو تک محدود ہوتی تو علم عروض، ہندوستان کی معاشی حالت، عوام وخواص کی روزمرہ زندگی سے متعلق وہ تمام تر لوازمات جو کسی نووارد غیر ملکی کی رہنمائی کے لیے معاون ہوتے، ان کو ہندوستانی گریمر کے اوراق میں شامل کرنا شائد درست نہ ہوتا چناں چہ انھوں نے اپنی قواعد کو صرف ونحو کی قید سے الگ کیا۔

''ہندوستانی گریمر'' کا پہلا باب "The Elements" کے عنوان سے ہے جس میں اردو زبان کے حروف تہجی، مفردات، ہجوں کی مختلف شکلیں، واولز، کانسوننینٹ کی بحثیں، سابقوں لاحقوں کے بیان کو تفصیلاً کتاب کا حصہ بنایا گیا ہے۔ اردو حروف تہجی کو دیوناگری اور نستعلیق خط میں لکھ کر واضح کیا گیا ہے۔ حرف کی مختلف اشکال اور ان سے بننے والے مختلف حروف کے تلفظ کو رومن رسم الخط میں لکھ کر واضح کیا گیا ہے۔ حروف تہجی میں موجود مختلف حروف کی پہچان کے لیے یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہندوستانی/ ہندوی/ ہندی سے کون سے حروف حروف تہجی کا حصہ بنے، فارسی سے کون سی آوازیں آئیں اور عربی حروف کون سے ہیں جو ہندوستانی زبان کا حصہ بنے۔ مزید یہ کہ ہائیہ حروف "(Aspirated Sounds)" خالصتاً ہندوستان کی دیسی آوازیں ہیں جو عربی یا فارسی سے نہیں آئیں۔ مولوی عبدالحق کی ''قواعدِ اردو'' کا جائزہ لیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ ان کی گریمر کی پہلی فصل بھی علم ہجا (Elements) ہے جس میں الفاظ، مفردات، حروف تہجی، اعراب (حرکات وسکنات) حروف قمری وشمسی وغیرہ کا بیان شامل ہے۔ جس طرح گل کرسٹ نے اپنی گریمر میں اردو حروف تہجی میں شامل مختلف حروف کی اصل کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ کس کس زبان سے ہندوستانی زبان کا حصہ ہے، اسی انداز کے مطابق مولوی عبدالحق کی فصل اوّل بعنوان ''ہجا'' کا آغاز ہوتا ہے:

> چوں کہ اردو ہندی، فارسی اور عربی سے مل کر بنی ہے، لہٰذا اس میں ان سب زبانوں کے حروف موجود ہیں۔ خالص عربی حروف یہ ہیں: ث، ح، ذ، ص،

> ض، ط، ظ، ع، ق یہ حروف قدیم فارسی اور ہندی یا سنسکرت میں نہیں پائے جاتے لیکن 'ذ، قدیم فارسی میں بھی پائی جاتی ہے۔ اور اب بھی بعض فارسی الفاظ 'ذ، سے لکھے جاتے ہیں۔ ٹ، ڈ، ڑ، خالص ہندی ہیں' عربی فارسی میں نہیں آتے۔ ز، ف، خ، غ کی آوازیں ہندی میں نہیں عربی فارسی دونوں میں ہے۔ ژ خالص فارسی حرف ہے، ہندی عربی میں نہیں آتا... یوں یہ سادہ آوازیں ہیں مگر مل کر ایک ہو گئی ہیں۔ وہ حروف یہ ہے، بھ، پھ، تھ، جھ، چھ، دھ، ڈھ، ڑھ، کھ گھ،(۵)

گل کرسٹ کی قواعد کا دوسرا باب اسم کے مباحث پر ہے۔ اس کے تین حصے ہیں جن میں Gender، Article اور Declension کے ذیلی عنوانات پر بحث ملتی ہے۔ باب نمبر III ضمیر کے متعلقات سے متعلق ہے۔ اس میں Personal Pronouns، Interrogatives کے ذیلی عنوانات سے اجزائے کلام کا دوسرا بڑا عنصر زیر بحث لایا گیا ہے۔ اس کے بعد باب نمبر V میں فعل، فعل کی مختلف گردانیں، امدادی افعال، فعل کے مسائل ومباحث، باب نمبر VI تمیز یا متعلق فعل (Adverb)، حرفِ ربط، حرفِ عطف وتخصیص وغیرہ کے مباحث کے ساتھ اجزائے کلام کی بنیاد پر قواعد ترتیب دی گئی ہے۔ اس بحث کے شروع میں یہ نقطہ سامنے لانے کی کوشش کی گئی تھی کہ گل کرسٹ نے اجزائے کلام (اسم، فعل، ضمیر، تمیز، صفت وغیرہ) کی بنیاد پر مشتمل ماڈل کو اردو قواعد نویسی کے لیے سود مند خیال کیا اور یوں گل کرسٹ کے پیش کیے گئے قواعدی ماڈل پر آنے والے عہد کے قواعد نویسوں نے اپنی قواعدیں مرتب کیں۔ مولوی عبدالحق کی قواعدِ اردو بھی اسی انداز پر مرتب کی گئی ہے۔ علم ہجا کی ذیل میں مناسبت تلاش کرنے کے بعد اجزائے کلام کی بنیاد پر دوسرا ثبوت دیکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ''قواعدِ اردو'' کی فصل دوم ''صرف'' سے متعلق قواعدی مباحث پر مشتمل ہے جو اجزائے کلام کی بنیاد پر اردو زبان کے جملہ امور پر تحقیقی وتنقیدی انداز سے جامع مواد کی حامل ہے۔ اس میں ذیلی عنوان نمبر ایک میں اسم (اسم خاص، اسم کیفیت، اسم جمع، لوازم اسم) عنوان نمبر دو میں صفت (صفت ذاتی، نسبتی، عددی، مقداری ضمیری)، عنوان نمبر تین میں ضمیر

کے پہلے ایڈیشن کے مشمولات، مذکورہ بالا مباحث کے ساتھ ختم ہو جاتے ہیں، تاہم گل کرسٹ کی قواعد کے مباحث ابھی مزید آگے چلتے ہیں۔ ان کی اردو گرامر میں نحو کے مباحث کے بعد باب IX میں Orthometry اور Orhtoepy کے عنوانات کے تحت مزید قواعدی عناصر بیان کیے گئے ہیں۔ Orthometry کی ذیل میں اردو علم عروض بعنوان Prosody کا بیان ہے۔ علمِ عروض کے ساتھ ساتھ تقطیع (Versification) پر تفصیلی مواد کو قواعد کا حصہ بنانے کا مقصد یہ تھا کہ اردو زبان اور شاعری سے متعلق تمام ممکنہ لسانی اور قواعدی معلومات کو اکٹھا کر دیا جائے، بہ صورتِ دیگر علمِ عروض اور تقطیع کا بیان براہِ راست قواعد کی ذیل میں نہیں آتا۔

اب اگر مولوی عبدالحق کی قواعد اردو کا اضافہ شدہ حتمی ایڈیشن (۱۹۵۸ء) کا مطالعہ کریں، تو اس میں کچھ مزید مباحث کا اضافہ کیا گیا ہے، جو پہلے ایڈیشن (۱۹۱۴ء) میں موجود نہیں تھے۔ اضافہ شدہ ایڈیشن میں مولوی صاحب نے نحو کے مباحث کے بعد رموزِ اوقاف، عروض، بحریں، مرکب بحریں اور اوزانِ رباعی کے ذیلی عنوانات کے تحت ان علوم کی مبادیات کو اپنی کتاب کا حصہ بنایا۔ واضح رہے کہ Orthometry کے باب میں ان سب پر معلومات گل کرسٹ کی گریمر میں پہلے سے موجود تھیں۔ مزید laws of Versification (اصولِ تقطیع) میں ارکانِ بحر، زحاف، مرکب زحاف، بحروں میں ہزج، رمل، رجز، متدارک، متقارب، بحرِ کامل، مرکب بحروں میں بحرِ سریع، مضارع، بحرِ مقتضب وغیرہ پر پہلی مرتبہ معلومات گل کرسٹ کی گریمر کا حصہ بنی تھیں۔ ان کی مزید تشریح کے لیے اردو کے کلاسیکی شعرا کے کلام سے مثالیں بھی شامل کی گئی تھیں۔ اس کلیہ کے عین مطابق مولوی عبدالحق کی قواعد میں بھی عروض و تقطیع کے یہ مباحث کتاب کا حصہ بنائے گئے ہیں۔ (۷)

ان دونوں کتب کے تقابلی مطالعے سے، اور حاصل ہونے والے نتائج سے ہمارے اس مفروضے کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس ضمن میں یہ امر غور طلب ہے کہ گل کرسٹ کی گریمر میں ان مباحث کی پیش کش اس لیے ضروری خیال کی گئی تھی، کہ وہ اپنے غیر ملکی ساتھیوں کو اردو قواعد کے ساتھ ساتھ اردو شاعری کے اسرار و رموز سے بھی آگاہ کرنا چاہتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ عروض و تقطیع کو قواعد کا حصہ تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اب مولوی عبدالحق کا اپنی قواعد کے

اضافہ شدہ ایڈیشن میں انھی مباحث کو شامل کرنا اپنی جگہ تحقیق طلب ہے۔ داخلی شہادتوں کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مولوی عبدالحق نے بھی ان مباحث کو گل کرسٹ سے متاثر ہو کر اپنی قواعد کا حصہ بنایا۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ ان کی قواعد پر گل کرسٹ کی قواعدی منہاج (Methodology) کے ساتھ ساتھ فہرستِ مشمولات کے بھی اثرات موجود ہیں۔ یہ بات گل کرسٹ کی اہمیت میں اضافہ کرتی ہے کہ ان کے قواعدی ماڈل نے اپنے بعد آنے والے اردو قواعد نویسوں پر دیرپا اثرات مرتب کیے۔

مولوی عبدالحق کی اردو قواعد پر جامع ترین اور معروف کتاب ''قواعد اردو'' ۱۹۱۴ء میں الناظر پریس لکھنؤ سے شائع ہوئی اور اتنی اہمیت اختیار کر گئی کہ اب تک، اس قواعد کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ''قواعد اردو'' ۱۹۵۸ء تک کے ایڈیشنوں میں ترمیم و اضافوں سے شائع ہوئی اس کے بعد اس کی جو شکل بنی وہ تا حال شائع ہو رہی ہے۔ کتاب کے شروع میں مقدمہ ہے جس میں قواعد کی تعریف و اہمیت سے بات شروع کر کے یونانی، عربی اور فارسی قواعدی روایت کو مختصراً بیان کرنے کے بعد اردو قواعد کی روایت کو دیکھا گیا ہے۔ اس مقدمے میں اردو کے پہلے غیر ملکی قواعد نویس جان جوشوا کیٹلر کی ہندوستانی گریمر کا سن تالیف ۱۷۱۵ء لکھا تحریر کیا گیا ہے جو اس دور میں موجود جارج گریرسن کے ''لسانیاتی جائزہ ہند'' کے مطابق تو ٹھیک تھا لیکن جدید تحقیق کے مطابق یہ کتاب ۱۶۹۸ء میں تحریر ہو چکی تھی جس کا قلمی نسخہ یورپ کی ایک لائبریری میں موجود ہے۔ (۸)

مولوی عبدالحق نے اپنی قواعد نویسی کا طریقہ کار اور منہاج کلمے کی سہ درجی تقسیم کی بجائے اجزائے کلام کی بنیاد رکھی۔ کتاب کے مشمولات سے اندازہ ہوتا ہے کہ قواعد کی ترتیب اور مواد جان گل کرسٹ کی قواعد سے کافی حد تک ملتا جلتا ہے۔ ''قواعد اردو'' کا پہلا باب ''علم ہجا'' کے مباحث پر ہے۔ علم ہجا کی بحث کسی بھی زبان کے قواعد کی بنیاد ہوتی ہے۔ اس باب کی اہمیت یہ ہے کہ اس کی مدد سے زبان کے بنیادی حروف و اجزا، الفاظ اور قواعد کا تعلق بہتر انداز سے سمجھا جا سکتا ہے۔ جان گل کرسٹ کی ''ہندوستانی گریمر'' کا پہلا باب "Elements" کے نام سے تحریر کیا گیا ہے جس میں الفاظ مفردات، حروف تہجی اور اس سے

متعلق مباحث سے متعلق ہے۔ مولوی عبدالحق نے اس باب میں اعراب، حرکاتِ حروف و الفاظ کو بھی تفصیلی انداز سے دیکھا ہے۔ یہ طریقہ بالکل ویسا ہی ہے جیسا گل کرسٹ کی گریمر میں نظر آتا ہے۔

فصل دوم میں ''صرف'' کے مباحث بیان کیے گئے ہیں اس میں اسم، لوازم اسم، اسم سے متعلق تمام اصول وضوابط جن سے حروف و الفاظ متشکل ہوتے ہیں، ان کی ترکیب سازی وغیرہ کا بیان ہے۔ اس کے بعد ''صفت'' کا باب ہے جس میں صفت عددی، صفت مقداری، صفت ضمیری کا بیان ملتا ہے۔ تیسرا باب ''ضمیر'' کے عنوان کے تحت ہے جس میں ضمائر استفہامیہ، ضمیر موصولہ، ضمیر اشارہ اور اس سے متعلق مواد ملتا ہے۔ چوتھا باب ''فعل'' کے نام مختلف زبانوں، فعل کی گردانوں، حالتوں، امعال، طور مجہول، مرکب افعال کی صورت ملتا ہے۔ پانچواں باب ''تمیز'' ہے جس میں حروف کی مختلف حالتوں اور قسموں، حروف ربط، حروف عطف، تخصیص، محاسبہ کا بیان ہے۔ فصل چہارم میں الفاظ کا اشتقاق اور تراکیب کا بیان ہے۔ فصل چہارم ''نحو'' کے مباحث پر ہے۔ اس کے علاوہ رموز اوقاف اور مستعمل ضروری علامتوں کا بیان کتاب کا حصہ ہے۔ کتاب کے آخر میں عروض کا باب شامل ہے جو قواعد کا حصہ نہیں ہوتا لیکن مولوی عبدالحق نے ضرور کسی نصابی ضرورت کے پیش نظر اس کو کتاب کا حصہ بنایا ہے۔ عروض کے بارے میں وزن، بحر تقطیع اور ان کے اجزا، بحروں کی تفصیل، اوزان رباعی کو کتاب کا حصہ بنایا گیا ہے۔ مولوی عبدالحق کی قواعد کی مشمولات کا ذکر یوں ضروری ہے کہ ان مشمولات اور جان گل کرسٹ کی قواعد سے ملا کر دیکھا جا سکے۔

جان گل کرسٹ کی ''ہندوستانی گریمر'' میں علم ہجا، آرٹیکل، تذکیر و تانیث، گردانیں، ضمیر، استفہامیہ، اسم صفت، فعل، متعلق فعل، فعل کی مختلف گردانیں، اسم عدد/اسم ہندسہ، امدادی فعل (مرکب فعل) حرف ربط، یعنی صرف کے اہم مباحث کو کتاب کا حصہ بنانے کے بعد مشتق اور جملے کی ترکیب (Derivation and composition of words) کا باب موجود ہے۔ نحو (Syntax) کو علیحدہ باب میں بیان کیا گیا ہے۔ الفاظ کے تلفظ کے علم (Orthography/Orthoepy) کے بنیادی اجزا، دن مہینے سال ہندوستانی معاشرت اور

ثقافت کے مختلف مظاہر کے ساتھ ساتھ علم عروض پر تفصیلی بیان کا حامل ہے۔ عروض کے علم (Prosody) کو اس تفصیل سے گل کرسٹ نے بیان کیا ہے کہ اس کی معلومات پر رشک آتا ہے۔ راگ، راگنیوں کا ذکر مقامی موسیقی سے متعلق اس کی معلومات، پڑھنے والے کو حیرانی سے دور چار کر دیتی ہیں۔ مختصر یہ کہ گل کرسٹ کے دیے گئے قواعدی ماڈل اور اس کے مشمولات اور مولوی عبدالحق کی ''قواعد اردو'' کے مشمولات میں بہت زیادہ مماثلت واضح طور پر بتا رہی ہے کہ گل کرسٹ کی منہاج کے اثرات مشرقی ادیبوں کی قواعدی کتب میں انیسویں صدی کے آخر میں بالعموم اور بیسویں صدی میں تواتر سے نمودار ہونا شروع ہو چکے تھے۔ دیگر قواعد نویسوں پر گل کرسٹ کے اثرات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولوی سید محمد، ارباب نثر اردو میں لکھتے ہیں:

> انگریز مولفین قواعد میں ڈاکٹر گل کرسٹ کو اوّلیت حاصل ہے۔ انگریزی اردو لغت بھی سب سے پہلے انھوں نے ہی لکھی ہے۔ ان کے بعد اور بھی انگریزوں نے مثلاً ڈنکن فاربس، ڈاکٹر فیالن [فیلن] جان شیکسپیئر اور جوزف ٹیلر وغیرہ نے ان کی تقلید میں لغات لکھیں اور اس طرح اردو کی نشر و اشاعت میں حصہ لیا۔ (۹)

مولوی عبدالحق کی قواعد اردو کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے، لیکن اس کے مقابل اگر جان گل کرسٹ کی گریمر کو رکھ کر تجزیہ کیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ گل کرسٹ کی ''ہندوستانی گریمر'' نسبتاً زیادہ وقیع، جامع اور مفصل مباحث سے مملو ہے۔ یہاں مقصد دونوں مشاہیر کی قواعدی کتب کا موازنہ کر کے بڑا چھوٹا ثابت کرنا نہیں بلکہ گل کرسٹ کے قواعدی ماڈل کے ان کے مابعد قواعد نویسوں پر اثرات کا جائزہ لینا ہے۔ مولوی عبدالحق کا کسی قواعد نویس کی تعریف کرنا اس بات کا غماض ہے کہ ممدوح یقیناً اس تعریف کا مستحق ہوگا جس کی وجہ سے ان کو تعریف پر مجبور ہونا پڑا۔ اردو کے دو بڑے قواعد نویسوں کی مذکورہ قواعدی کتب کی اہمیت اور ان پر گل کرسٹ کی قواعدی کتب کے اثرات کا جائزہ ان کی قواعد نویسی کی روایت پر اثرات کی واحد مثال نہیں بلکہ مغرب و مشرق کے قواعد نویسوں پر بلاواسطہ گل کرسٹ کے اثرات موجود ہیں۔ جن پر ڈاکٹریٹ کی سطح کا تحقیقی کام کیے جانے کی ضرورت ہے۔

حوالہ جات اور حواشی:

۱۔ عبدالحق، مولوی، قواعد اردو (کراچی، انجمن ترقی اردو، ۲۰۱۳ء،) ص ۱۷۔۱۶

۲۔ شلز کی اس قواعد کو ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے ''ہندوستانی گرامر'' کے عنوان سے اردو ترجمے کے ساتھ ۱۹۷۷ء میں شائع کیا اور اس پر تفصیلی مقدمہ شامل ہے۔

۳۔ گریمر کا ایک نسخہ لندن کے کسی پبلشر کے ہاتھ لگا تو اس نے ۱۷۷۰ء میں بلا اجازت وہ نسخہ چھاپ کر فروخت کرنا شروع کیا۔ یہ نسخہ چوں کہ مصنف کی مرضی سے نہیں چھپا تھا معیاری و مستند نہیں تھا۔ چناں چہ ہیڈلے نے اپنی گریمر کا معیاری نسخہ ۱۷۷۲ء میں شائع کیا۔ اس گریمر کا عنوان یہ تھا:

Grammatical Remarks on the Pratical and Vulgar Dialect of the Indostan Language, commonly called Moors, with a vocabulary English and Persian, (London 1772)

۴۔ Case study کے لیے پہلے مولوی عبدالحق کی قواعد اردو کے پہلے ایڈیشن اور انجمن ترقی اردو پاکستان کے ۲۰۱۳ء میں شائع کردہ ایڈیشن کو بنیاد بنایا گیا ہے، جس کا حوالہ درج ذیل ہے:
مولوی عبدالحق، ڈاکٹر، قواعد اردو، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۲۰۱۳ء۔

۵۔ مولوی عبدالحق، قواعد اردو، ۲۰۱۳ء، ص ۳۴۔۳۳

۶۔ قواعد اردو میں یہ مندرجات پہلے اور آخری ایڈیشن میں مماثل ہیں۔

۷۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو قواعد اردو کا ۲۰۱۳ء کا ایڈیشن۔

۸۔ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی، جامع القواعد (حصہ صرف) (لاہور، اردو سائنس بورڈ، طبع دوم،

۲۰۰۴ء)، ص ۱۳۳

سید محمد، مولوی، ارباب نثر اردو، ص ۳۲۔

2.10

اردولسانیات کے اولین نقوش، تحقیق وتنقید

اُردولسانیات کا ابتدائی دور:

ہندوستان میں لسانیاتی شعور کی روایت کا اندازہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اُردو زبان سے متعلق لسانی کاوشیں انفرادی سطح پر سولہویں صدی سے ہی رو بہ عمل تھیں۔ اُردو کی پہلی باقاعدہ لغت غرائب اللغات اور پہلی باقاعدہ قواعد "گریمیٹکا ہندوستانیکا" از جون جوشوا کیٹلر ہندوستان میں اُردو قواعد ولغت نویسی کے باب میں اولین نقش تھیں، جو ابتدائی لسانیاتی شعور کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ کیٹلر کی قواعد آگرہ میں تحریر ہوئی (1)۔ یہ دونوں کتب سترہویں صدی کے اواخر میں تحریر ہوئیں۔ ملا عبدالواسع ہانسوی کی غرائب اللغات ہندوستانی زبان کی، جو اس عہد میں دہلوی یا ہندوی کہلاتی تھی، کی لغت تھی، جو انھوں نے اپنے مدرسے کے بچوں کے تدریسی مقصد کے تحت مرتب کی تھی (2)، دوسری طرف کیٹلر کی گریمر غیر ملکی تاجروں کو اُردو زبان سکھانے کے لیے معاون کتاب کے طور پر لکھی گئی تھی۔ ان دونوں کتابوں سے یہ لسانی نکتہ سامنے آتا ہے کہ اُردو لسانیات کے بانیوں نے اُردو زبان سیکھنے کے لیے یہ

کتب مرتب کیں۔ لسانیات کی ایک شاخ اطلاقی لسانیات (Applied Linguistics) کے نام سے معروف ہے۔ اس شاخ میں غیر ملکیوں اور طالب علموں کی تدریس کے عمل بھی شامل کیا جاتا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ 1700ء کے قریب اُردو لسانیات کی ایک شاخ، 2nd Acquisition.Language یعنی ثانوی زبان کی تحصیل کے لسانی عمل کے مباحث کا آغاز ہوتا ہے، جس کے طریقہ کار کا مطالعہ تو عصر حاضر میں نئے اصولوں پر مشتمل ہو سکتا ہے، لیکن اس دور پر کیا منہاج اختیار کی گئی تھی، اس پر تحقیق کی جائے تو لسانیات کے محقق کے لیے اہم زاویے سامنے آ سکتے ہیں۔(3)

سترہویں صدی سے قبل فرانسیسی، انگریزی اور جرمن افراد نے اپنے طور پر ہندوستانی زبان، جو آگے چل کر اردو اور ہندی کے نام سے جانی گئی، کے قواعد ولغات پر کام شروع کر دیا تھا، لیکن اس سلسلے میں تاریخ میں محفوظ رہ جانے والی کتب کیٹلر (1698ء) اور سورت کے علاقوں میں مشنری تبلیغ کے لیے ہندوستان کا دورہ کرنے والے پادری بنجامن شلز کی گریمر تھی، جو محفوظ ہے اور اس پر اُردو کی اولین لسانی تحقیقات کا آغاز ہوتا ہے۔ بنجمن شلز کی گرامر کو ابواللیث صدیقی نے اُردو ترجمہ کر کے مرتب کیا ہے۔ اس کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ شلز نے اپنی قواعد کے دیباچے میں اُردو زبان کی تاریخ کے بارے میں مختلف بحثیں کتاب کا حصہ بنائی تھیں۔(4)

اردو املا، ہجے اور رسم الخط کی ابتدائی بحثیں (Urdu Orthography)

بنجمن شلز نے گریمر کے ابتدائی صفحات میں اُردو املا، ہجوں اور رسم الخط کی پیچیدگیوں کا ادراک کرتے ہوئے رومن رسم الخط اور اس کے ساتھ، تلفظ واضح کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ یہ وہ لسانیاتی زاویہ ہے، جو جدید لسانیات کی شاخ Orthography سے تعلق رکھتا ہے، جو املا اور تحریر کے کئی پہلوؤں کی وضاحت کرتا ہے۔ اس دور میں ابھی یورپ میں لسانیات کے بطور علم کی شروعات کا دور دورہ تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ شلز نے ہندوستانی گریمر مرتب کرتے ہوئے ان لسانیاتی رویوں کا ابتدائی خاکہ وضع کیا، جو آگے چل کر مستشرقین کے لیے ایک تربیت ثابت

ہوا۔ فاضل مصنف نے اس بات میں بنگلہ زبان اور گورمکھی رسم الخط کا بھی ذکر موجود ہے، جس سے ان کے لسانی شعور کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے، اس کتاب میں لسانیات کی ایک شاخ جس کو تحصیل زبان یعنی Acquisition.Second Lang کہا جاتا ہے، اس کے بعض ابتدائی نمونے نظر آتے ہیں۔ اپنے ہم وطن تاجروں، مبلغوں کی ضروریات زندگی کے لیے معاون مخصوص الفاظ، کوڈ ورڈز اور فقرات ساتھ دیے گئے ہیں۔ شلز نے اُردو زبان کی تاریخ اور نام پر بھی رائے زنی کی ہے۔ اُردو زبان کو ماضی میں غیر ملکی افراد نے Moors کا نام دیا تھا (جس کا مطلب تھا مسلمانوں کی زبان) شلز نے اس غلط فہمی کو بھی رفع کرتے ہوئے بیان کیا کہ اردو کے لئے مورس نام درست نہیں، اس کو پرتگالیوں نے غلطی سے MoRvico بھی کہا تھا، لیکن یہ زبان ہندوستانی کہلاتی ہے، جو اس کا حقیقی نام ہے۔ یہاں پر ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے، اکثر کتب میں لکھا گیا ہے کہ امیر تیمور کے حملوں کے بعد اُردو زبان کے خدوخال بننا شروع ہو گئے تھے، یہ نظریہ جان گل کرسٹ کا ہے، راقم کی تحقیق کے مطابق یہ لفظ نظر بجمن شلز کی ہندوستانی گریمر کے دیباچے کا حصہ ہے، جسے دیکھا جا سکتا ہے۔

تدریسی لسانیات اور معاون ذرائع

ڈاکٹر طارق رحمان معروف ماہر لسانیات ہیں۔ ان کی کتاب میں تدریسی لسانیات کی اصطلاح متعارف کرائی گئی ہے۔ اس شاخ میں کسی زبان کا تعلیم میں استعمال اور اکتسابی منصوبہ بندی کے لئے زبان کا استعمال دیکھا جاتا ہے۔ اس کی ابتدائی تفہیم زبان سیکھنے سکھانے کے عمل سے آغاز پاتی ہے۔(5) اس شاخ کے مطالعے کا احوال دیکھا جائے تو لسانیات کے اول دور کی کاوشوں میں اس کی جھلک مل جاتی ہے۔ سترہویں صدی میں کیٹلر کے عہد کے متوازا، ملا عبدالواسع ہانسوی کی لغت لکھی گئی تھی، جو انھوں نے مدرسے کے بچوں کی تعلیم (Pedagogy) کے مقصد کے تحت مرتب کی تھی۔ اس لغت میں ہندوستانی (اُردو) زبان کے الفاظ کا متبادل فارسی لفظ لکھ کر زبان کو سہل بنایا گیا تھا۔ اس لغت کی تیاری نے مقامی ادیبوں کی ایک نئی لسانی روایت کی توجہ دلائی جس کے تحت زبان اور لغت کو صحت و استناد سے

کتاب کا حصہ بنانے کی سعی کی گئی۔اس سلسلے میں خان آرزو نے اس لغت میں عوامی بول چال کے الفاظ وتراکیب کو دہلی معیاری لب و لہجے کے مطابق بنانے کے لیے تبدیل کر دیا حتیٰ کہ اس لغت کا نام تک تبدیل کر کے نوادرالا لفاظ رکھ دیا، تا کہ مقامی وقصباتی لب و لہجہ یا محاورے کو ختم کر کے معیاری شہری زبان بنایا جا سکے۔ یہاں پر سماجی لسانیات (Socio Linguistics) کا کوئی ماہر دیکھ کر تجزیہ کرسکتا ہے کہ دہلی کی پڑھی لکھی اشرافیہ عوامی طبقے کی بول چال کو معیاری نہ مانتے ہوئے اول تو اس کو کوئی مرتبہ دینے پر تیار ہی نہ تھی۔ اور یہ کہ اس کی اصلاح کر کے معیاری بنانے کی کاوش اس عہد کے پڑھے لکھے افراد کا ایک خاصا تھا۔اس سماجی لسانی رویے کا دوسرا روپ یا مثال اردوغزل کے اولین معتبر شاعر، ولی دکنی کا دیوان بنا ہے۔ اس دیوان کی دہلی آمد کے بعد مقامی شعراء نے فارسی شاعری کو ترک کر کے گو اُردو شاعری (ریختہ گوئی) اختیار کر لی تھی، لیکن اُسلوب کو معیاری بنائے رکھنے کے لیے ولی دکنی کے دکنی محاورے اور لب و لہجہ کو، لوگ من وعن اپنانے اور مقامی بولی میں شامل کرنے پر رضا مند نہ تھے۔ یہاں پر اردو کی ایک دکنی بولی اور دہلی کی ریختہ بولی کے مابین سماجی افتراکات کا مطالعہ اہم سماجی لسانیاتی مباحث کی بنیاد بنا جسکو اصلاح زبان اور کہیں کہیں اصلاح اسلوب کا نام دیا گیا ہے۔(6)

اصلاح اُسلوب، ہندوستان میں سماجی لسانی رویہ:

خان آرزو کے کتاب کی اصلاح کے اس رویے سے مقامی شعراء کی ایک اور لسانی کاوش جڑی ہوئی ہے، جس کو موجودہ دور میں اُسلوبیات کی شاخ کے تحت مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔اُردو ادب کی تواریخ میں اٹھارہویں صدی میں ایک موضوع مؤرخ کے ذاتی مغالطے کی بنیاد پر راہ پا چکا ہے اور وہ ہے اصلاح زبان کا تصور۔ مؤرخین اور مدرسین زبان اُردو کا خیال ہے کہ دہلی اور آگے چل کر لکھنو میں شعراء نے اُردو زبان کی اصلاح کے مقصد کے تحت کچھ لسانی اقدامات کیے،جس سے زبان کی اصلاح ہوگئی، یعنی زبان تبدیل ہوگئی۔ اس سلسلے میں راقم کا خیال ہے کہ شعرا کی اپنے شاگردوں کو اردو شاعری کے اسلوب میں کچھ الفاظ کے ترک

اور انکی جگہ غیر ملکی زبانوں کے الفاظ کا شعوری استعمال معاشرے کے عام فرد کا مزاج نہیں بنتا اس لئے اس کو اصلاح زبان نہیں کہا جا سکتا، اصلاح اسلوب البتہ کہا جائے تو اسکی اہمیت کم ہونے کی بجائے بڑھ جاتی ہے۔اٹھارہویں صدی کے اواخر میں انگلینڈ کی ایسٹ انڈیا کمپنی کے پرچم تلے ماہرین السنہ کی آمد کا آغاز ہوا تو لسانیات کے میدان میں مزید پیش رفت ہوئی جس کا اجمالی جائزہ ذیل میں تحریر کیا جاتا ہے۔

سرولیم جونز، جان گل کرسٹ اور اُردو میں تقابلی لسانیات کا آغاز:

اٹھارہویں صدی عیسوی کے برصغیر میں ہندوستان کی ورنیکلر زبانوں کی اہمیت بڑھ گئی تھی۔ اس صدی میں عام طور پر اس لسانی تغیر کو پیش نظر رکھا جانا ضروری ہے کہ فارسی زبان عام بول چال کے میدان سے باہر نکل گئی تھی۔مغل حکومت کا زوال فارسی کے حق میں برا،لیکن مقامی زبانوں کے حق میں بڑا معاون ثابت ہوا۔ عام بول چال کی اہم زبانوں میں ہندوستانی زبان پیش پیش تھی، جسے شاعری کی زبان ہونے کے باعث شمالی ہندوستان میں "ریختہ" کے نام سے جانا جارہا تھا۔ مرکز اور مرکز سے باہر کے مقامی شعراء تیزی سے ریختہ گوئی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ چنانچہ کلاسیکی زبانوں (فارسی، عربی، سنسکرت کی جگہ ورنیکلر زبانیں (مقامی بول چال کی زمین) تیزی سے مقبول ہوتی چلی گئی۔

بعض محققین خان آرزو کو انکی لسانی کاوشوں کی بنیاد پر تقابلی لسانیات کا بنیاد گزار قرار دیتے ہیں، لیکن اس دلیل میں اس طور پر بھی زیادہ وزن نہیں کہ اول تو وہ لسانیاتی تحقیق کے مرد میدان نہ تھے۔ دوسرا یہ کہ ان کی تحقیقات کوئی مثبت نتیجہ پیدا نہ کرسکی تھی۔ یہاں یہ امر باعث حیرت ہے کہ مشرقی علماء جو کہ فارسی کے ماہر تھے اور سنسکرت سے بھی شدبد رکھتے تھے، وہ ان دونوں بڑی زبانوں کی لسانی ہستیوں کو نہ بھانپ سکے۔ 1757ء اور 1764ء کی جنگوں میں انگریز قوم کی فتح نے ان کو بنگال اور جنوبی ساحلوں کا مالک بنا دیا تھا۔مغل دربار سے دیوانی کے حقوق حاصل کرنے کے بعد انگریز نوآبادکاروں نے اس خطے پر اپنی حکومت کو سیاسی بنیادوں پر مستحکم کرنے کے لیے ہر میدان میں اہم عہدوں پر اہل افراد تعینات کیے۔

بنگال ہائی کورٹ کے جج کے طور پر ایک اہم شخصیت ہندوستان کے منظر نامے پر ہوئی، جس کو ہندوستانیات (Indology) کی تاریخ میں سر ولیم جونز (Sir William Jones) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ہندوستان آمد سے قبل بیس سے زائد مشرقی و مغربی زبانوں میں مہارت رکھتے تھے۔ فارسی زبان میں ان کی مہارت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ 1771ء میں فارسی زبان کی گریمر بعنوان:"A Grammar of Persian Language" لکھ چکے تھے، جس سے انگلینڈ میں ان کی شہرت پھیل گئی تھی۔ یوں تو ان کا ہندوستان میں تقرر ایک ماہر قانون کی حیثیت سے ہوا تھا، لیکن انھوں نے زبانوں سے دلچسپی کے باعث یہاں پر "رائل ایشیا ٹک سوسائٹی آف بنگال" قائم کی، جس نے ہندوستان میں لسانی تحقیقات کے لیے ایک سنجیدہ پلیٹ فارم کا کام کیا۔ ولیم جونز نے بنگال میں سنسکرت سیکھنا شروع کی، تو ان کو ایک خوشگوار حیرت سے سابقہ پڑا کہ سنسکرت زبان اور یورپ کی اہم بڑی زبانوں یونانی اور لاطینی کے مابین اہم مماثلتیں موجود ہیں۔ 1786ء میں انھوں نے رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں ان زبانوں کے تقابل کے نتائج کا ذکر کرتے ہوئے ایک لیکچر پیش کیا، جو بعد میں یورپ بھی پہنچا۔ یورپی افراد کو ان کے اس لیکچر سے اندازہ ہوا کہ ان زبانوں کے درمیان لسانی موافقت کے کیا اسباب ہیں۔ درج ذیل اقتباس کی بنیاد پر ولیم جونز کو سنسکرت اور یورپی زبانوں کے تقابل پر تقابلی لسانیات کا بنیاد گزار کہا جاتا ہے۔ اپنے خطبے میں انھوں نے جو لب لباب پیش کیا، اس کا ایک پہلو یوں ہے:

سنسکرت زبان کی قدامت خواہ کچھ ہو، یہ حیرت انگیز ساخت رکھتی ہے۔ یہ یونانی سے زیادہ مکمل، لاطینی سے بڑھ کر کثیر الکلام، اور ان دونوں سے کہیں زیادہ شستہ ہے۔ تاہم افعال کے مادوں اور قواعدی شکلوں میں اتنی گہری مماثلت رکھتی ہے کہ یہ صرف اتفاقی بات نہیں ہوسکتی۔ بلاشبہ تاریخ زبان کا کوئی عالم اس یقین کے بغیر تینوں زبانوں کا تجزیہ نہیں کرسکتا کہ تینوں اسی ایک ماخذ سے نکلی ہیں، جو شاید اب موجود نہیں۔۔۔ گوتھک، اور کیلٹک میں گو محاورہ خاصا مختلف ہے، مگر ان کا اور سنسکرت کا ماخذ ایک ہی ہے۔(7)

جان گل کرسٹ، اُردو لسانیات کی تحقیق کا سرخیل:

جان گلکرسٹ نے ہندوستان کی مقامی زبانیوں اور انکی مختلف بولیوں کے تقابل سے تقابلی لسانیات کا آغاز کیا۔ جان گل کرسٹ 1782ء میں ہندوستان آئے، تو تھوڑا بہت میڈیکل کا تجربہ پاس تھا، چنانچہ بنگال آرمی کی کمپنی "Bombay Detachment" میں سرجن کے اسسٹنٹ کے طور پر نوکری مل گئی۔ ماقبل کولونیل عہد میں برطانوی نوجوانوں کے کیریئر کے لیے مشرقی اور دکنی ہندوستان میں نوکریوں کے مواقع بھرپور تھے۔ ایک سال فوج کی نوکری کرنے کے ساتھ ان کو ہندوستان کی زبانوں کو سیکھنے کا

(2nd Language Acquisition) کا شوق ہوا، تو اندازہ ہوا کہ شمالی اور مشرقی ہندوستان میں جو بولی (Dialect) عوامی سطح پر رائج ہے، وہ ہندوی ہے، جس سے ملتی جلتی شکلوں (بولیوں) کو مختلف علاقائی ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے ہندوی کو سیکھنا شروع کیا۔ اس بولی کا فائدہ یہ تھا کہ یہ بولی مسلمانوں ہندوؤں ہر دو اقوام میں مقبول تھی۔ چنانچہ گریمر کی کتب سے سیکھنا شروع کیا، جس کے لیے ان کو اپنے پیش رو جارج ہیڈلے کی کتاب زیادہ معاون نہ لگی۔ اب مسئلہ یہ ہوا کہ اگر کسی گریمر سے زبان نہیں سیکھی تو پھر کیسے سیکھی جائے۔ گل کرسٹ نے کسی دوست کے مشورے پر معروف ہمعصر دہلوی شاعر مرزا محمد رفیع سودا کے کلیات/دیوان کا مشورہ دیا، جو ان کی زندگی کا راستہ بدلنے کا باعث بنا۔ اس مقصد کے لیے ایک منشی کی خدمات لی گئیں اور گل کرسٹ کا L2 سیکھنے کا سفر شروع ہوا۔ اب رفیع سودا کی شاعری سے جو زبان سیکھی، وہ ان کو دہلوی زبان کے معیاری ہونے کی طرف متوجہ کر گئی۔ اب ادب کی زبان اور عوامی بول چال میں پائی جانے والی دوری یا اختلافات نے ان کو اس زبان کے سیکھنے کے لیے سائنسی اصول وضع کرنے کا موقع دیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُردو میں سے گل کرسٹ وہ پہلے سنجیدہ ماہر لسانیات بنے، جنھوں نے مربوط اور سائنسی انداز سے لسانی تحقیق کا آغاز کیا۔ 1784ء میں انھوں نے منصوبہ بنایا کہ آگے چل کر جب کمپنی بنگال اور وسطی ہندوستان کا انتظام سنبھالے گی، تو اس کو براہ راست عوام سے بات

پیت کے لیے ایک رابطے کی زبان کی ضرورت پڑے گی۔اس ضرورت کے لیے کونسی زبان معاون ہوتی؟ چنانچہ اس نے عوامی رابطے کے لائق اس زبان کو دریافت کیا اور اس کا نام ہندوستانی زبان رائج کر دیا۔۔

اس زبان کو مقامی افراد مختلف علاقائی ناموں سے جانتے تھے، جب کہ یورپیوں نے اس کو Moors زبان کا نام دیا تھا، جس کا مطلب تھا مسلمانوں کی زبان۔ چنانچہ گل کرسٹ نے اس نام کو رد کیا اور یہ غلط فہمی دور کرنے کے لیے کہ یہ مسلمانوں کی کسی زبان کا نام ہے۔ اس کا نام ہندوستانی زبان طے کر دیا اور اس زبان کے لیے ایک لسانی منصوبہ اشاعت تشکیل دیا اور کمپنی سے چھٹی لے کر اس پر کام شروع کر دیا۔ یہ منصوبہ ہندوستانی زبان کے سیکھنے کے لیے انگریزی زبان میں چار گیت کی ترتیب و اشاعت تھی، جو انگریز انتظامی مشینری کی ضرورت بننے والی تھی۔ چنانچہ 1785ء میں وہ فوجی نوکری سے چھٹی پر چلے گئے اور پھر ہندوستان میں اپنے بائیس سالہ قیام کے دوران اس زبان کے لسانی و لسانیاتی منصوبے کو انجام دیتے رہے اور کبھی اپنی اصلی نوکری پر واپس نہ گئے۔(8)

جان گلکرسٹ نے اردو لسانیات کے میدان میں لغت نویسی اور قواعد نویسی کے ساتھ ساتھ تدریسی لسانیات کا میدان سنبھالا۔ بائیس سال کے کثیر عرصے میں انھوں نے لسانیات پر بیس کے لسانیاتی کتب پر کام کیا اور پہلی مرتبہ اردو لسانیات کی عملی صورت ممکن بنائی۔ گل کرسٹ کی مساعی کو چند نکات میں سمیٹا جائے تو یہ نتائج اخذ ہوتے ہیں

i. یہ نکتہ کہ انگریز افسران اور اہلکاروں کو مقامی افراد کی زبان سیکھنے میں کیا مسائل پیش آتے ہیں اور یہ کہ L2 کی تحصیل کو سائنسی انداز سے کیسے بہتر کیا جا سکتا ہے۔اس کے لئے Oriental Linguist کتاب کو محنت سے مرتب کیا گیا۔

ii. شمال ہند کی لنگوا فرانکا کونسی ورنیکلر زبان ہے اور یہ کہ ان بولیوں کی مرکزی بولی کو کونسا نام دیا جائے اور ہندوستانی زبان نام ٹائٹل کر دیا گیا۔انکی کتب کا نام اردو کی بجائے ہندوستانی نام سے موسوم ہے؛ جو آگے چل کر اردو اور ہندی کے الگ الگ ناموں سے معروف ہوئی۔

iii. انگریزوں کا مقامی افراد کی مدد کے بغیر زبان سیکھنا ممکن ہی نہیں، اگر ایسے ہوتا تو جارج ہیڈلے کی پندرہ سال پہلے شائع شدہ گریمر کے اندر موجود مکالمات (Dialogues) انگریزوں کو ضرور مقامی زبان سکھا دیتے۔ اس مقصد کے لئے ایک کتاب "Dialogues" مرتب کی گئی جس میں مقامی زبان کے جملوں کے تراجم کو صحت کے ساتھ کتاب کا حصہ بنایا گیا۔

iv. برصغیر میں پہلی مرتبہ اردو زبان سکھانے کے اصول وضع کرنا اور عملی طور پر اس کا مظاہرہ فورٹ ولیم کالج میں کرنا گل کرسٹ کا ایک بہترین کریڈٹ بنتا ہے۔

v. ہندوستانی زبان جس کو آگے چل کر انھوں نے اُردو لکھا تھا، اس کی جامع گریمر (1796ء) اور لغت (1790ء۔ 1786ء) شائع کیں اور انہی کتابوں کے دیباچوں میں اُردو زبان کے آغاز، تشکیل، اس میں حروف کا اشتراک، صوتی، صرفی اور نحوی سطح پر عربی، فارسی سنسکرت زبانوں، کے اشتراکات اور اس کے آغاز کو برج بھاشا سے جوڑ کر تاریخی لسانیات میں پہلی دفعہ سنجیدہ مباحث کا آغاز کیا، جس سے راقم کے مطابق گل کرسٹ کو نوآبادیاتی عہد کا پہلا لسانیاتی نقاد اور محقق کہا جائے تو یہ بے جا نہیں۔

حوالہ جات اور حواشی

1۔ فائزہ بٹ، اردو میں لسانی تحقیق، (لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، 2017ء) ص 280

2۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، مقدمہ نوادرالالفاظ از خان آرزو، (کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، 1992، اشاعت دوم) ص 5

3۔ ان مباحث کی تفصیل کے لیے راقم کا پی ایچ ڈی کا مقالہ: "جان گل کرسٹ کی لسانی خدمات (نمل 2014) دیکھا جا سکتا ہے کہ جہاں پر اس کتاب اور مصنف پر تفصیلی بحث موجود ہے۔

4۔ تفصیل کے لئے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی ترجمہ کردہ کتاب ہندوستانی گرامر از بنجمن شلزے کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

5۔ طارق رحمان ڈاکٹر، لسانیات ایک تعارف ترجمہ اصغر بشیر، (کراچی، سٹی بک پوائنٹ، 2017ء) ص 211

6۔ ساجد جاوید، اردو لسانیات اور مستشرقین (لاہور، عکس پبلیکیشنز، 2019) ص 61

7۔ ناصر عباس نیر، مابعد نوآبادیات، اردو کے تناظر میں (پاکستان، آکسفرڈ یونیورسٹی پریس، 2013) ص 110

8۔ جان گل کرسٹ پر معلومات کے لئے راقم کے پی ایچ ڈی کے مقالے سے استفادہ کیا گیا ہے۔
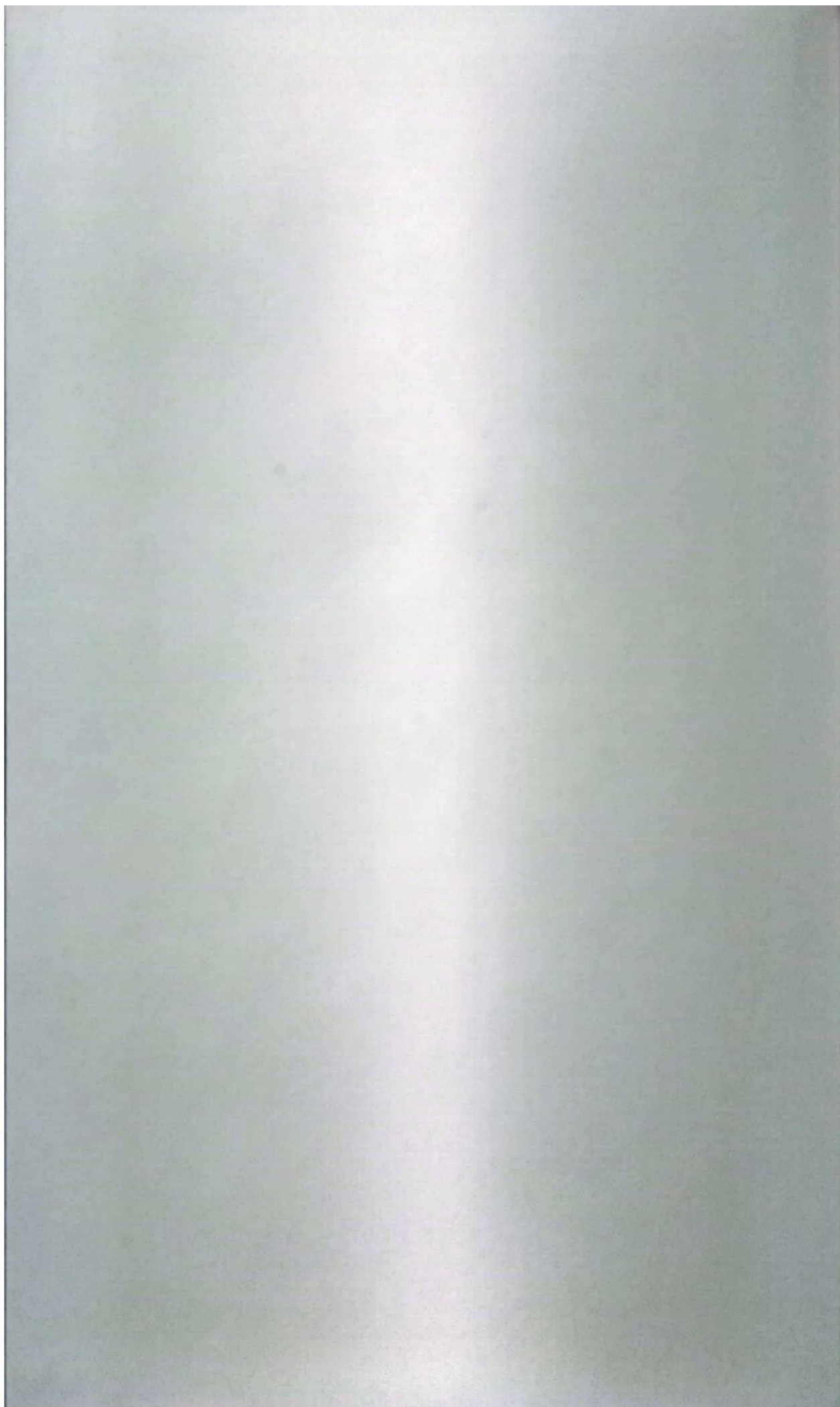
اُردو میں لسانیات کا زیادہ تر سرمایہ تاریخی لسانیات کے ذیلی مباحث پر مشتمل ہے۔ اِن مباحث پر سیاسی تاریخ کے گہرے نشانات ہیں۔ انیسویں صدی کے لسانیاتی ماڈلوں سے بہت کم لوگ آگے بڑھے ہیں۔ لسانیات کے نظری اور بنیادی مباحث پر موجود اُردو سرمایہ مقدار اور معیار دونوں حوالوں سے قابلِ ذکر کی حد کو بھی نہیں پہنچا جو اپنی جگہ ایک پریشان کن صورت حال ہے۔ پھر اہلِ زبان جیسے غیر علمی اور سیاسی تصورات نے اِس علم کو قواعد کے گرد ایسا گھمایا کہ تلفظ اور تذکیر و تانیث کے غبار کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ ایسے عالم میں سماجی لسانیات کے تصورات اور منہاج کی روشنی میں ڈاکٹر ساجد جاوید کا کام نئے راستوں کی خبر دیتا ہے۔ اِس کتاب کی کامیابی خالص لسانیاتی بنیادوں پر اپنے تصورات اور تحقیق کی عمارت اُستوار کرنا ہے۔ اُن کی کتاب کا مختصر وقت میں بارِ دگر اشاعت پذیر ہونا اِس بات کا اعلامیہ ہے کہ علمی نثر اور موضوعات آج بھی اہل اُردو کو متوجہ کرتے ہیں۔

ڈاکٹر نعیم ورک

ڈاکٹر ساجد جاوید گزشتہ بیس سال سے لسانیات سے جڑے ہوئے استاد اور نقاد ہیں۔ لسانیات کی جاگ اُن کے اندر قاضی عابد نے لگائی تھی، خود قاضی عابد لسانیات سے آشنا خلیل صدیقی کی وساطت سے ہوئے۔ ڈاکٹر ساجد جاوید قدیم و جدید لسانیاتی تصورات، اور ضرورتوں سے بہ خوبی آگاہ ہیں۔ اُردو زبان کی تاریخ، ابتدائی لسانی تصورات، اُردو کے رسم الخط، بولی سے زبان تک کے سفر، مقامی و مستشرقین کی لسانی خدمات اور لسانیاتی تنقید کے خوشہ چیں ہیں۔ یہ کتاب اِنہیں مطالعات کا عملی ثبوت ہے۔ لسانیات پر اُردو کتاب کا دوسرا ایڈیشن آنا چونکانے والی بات ہے۔ یہ چونکانے کا پہلو اُن کی تحریروں میں بدرجہ اتم موجود ہے۔

ڈاکٹر شاہد نواز

AKSPUBLICATIONS
Ground Floor Mian Chamber 3-Temple Road,Lahore.
Ph:0423-6294000 Cell # 0300-4827500-0348-4078844
E-mail:publications.aks@gmail.com
www.akspublications.com.pk